برہان

جلد ۷۱	ماہ جمادی الآخر ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۳ء	شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے بھائی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو! بڑے پتہ کی اور کھری بات کہتے تھے، ایک مرتبہ بریلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی قومیت ایک ہے اور اس لئے حقوقِ شہریت بھی دونوں کے برابر ہیں، لیکن میں تو اس بات کو اُس وقت تسلیم کروں گا جب کہ ایک مسلمان بھرے بازار میں ایک ہندو کو زدوکوب کرے اور اس پر فرقہ وارانہ فساد نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا دستور صحیح معنی میں جمہوری اور سیکولر ہے، وہ مذہب کی بنیاد پر دو شخصوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں برتتا۔ لیکن کاغذی یقین دہانی کوئی چیز نہیں ہے، اصل اعتبار عملی حقائق اور روز پیش آنے والے واقعات کا ہوتا ہے، جہاں تک ان حقائق اور واقعات کا تعلق ہے وہ دستور کی اس دفعہ کی تکذیب کرتے ہیں، چنانچہ ملک کو آزاد ہوئے ایک چوتھائی صدی بیت چکی ہے، لیکن اکثریت کے ذہن اور اس کے مزاج کا عالم اب تک یہ ہے کہ ملک میں روزانہ لڑکیوں کو چھیڑنے (Eve teasing) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ان کا نوٹس بھی نہیں لیتا، لیکن کسی ایک مسلمان لڑکے نے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ یہ بدتمیزی کی نہیں کہ فساد ہوگیا۔ بڑی سے بڑی قانون شکنی یہاں تک کہ ہریجنوں کو قتل کرنے اور اور ان کو زندہ جلا دینے کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں لیکن نہ کسی کے گھر کو آگ لگتی ہے اور نہ کسی کی دکان لوٹی جاتی ہے، اس کے برخلاف گاؤکشی کی غلط سلط افواہ پر بھی سینکڑوں مسلمان گھر سے بے گھر اور ان کے کاروبار تباہ ہو جاتے اور وہ نانِ شبینہ کے محتاج بنا دیئے

جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کے بعض اقدامات کے خلاف سخت سے سخت مظاہرے ہوتے ہیں لیکن کبھی قتل وغارت گری اور آتش زنی کا ہنگامہ بپا نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر مسلمان کبھی کوئی پرامن مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ گزشتہ سال فیروز آباد اور بنارس میں ہوا۔ پھر یونیورسٹیوں میں بھوک ہڑتال، احتجاجی مظاہرے، گھیراؤ، بلکہ توڑ پھوڑ، بسوں کو آگ لگا دینا وغیرہ اب روزمرہ کے واقعات بن گئے ہیں، لیکن حکومت نہ ان یونیورسٹیوں کی اکزکٹو اور کورٹ کو معطل کرتی ہے، نہ یونیورسٹیوں کے قواعد وضوابط (Statutes) کو بدلتی ہے، نہ کوئی آرڈیننس نافذ کرتی ہے اور نہ انتظامیہ میں کوئی ہنگامی صورت پیدا کرتی ہے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی میں کوئی اسی قسم کا ناگوار واقعہ رونما ہوجاتا ہے تو حکومت کی پوری مشنری حرکت میں آجاتی ہے اور یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ کو یکسر تبدیل کر دیا جاتا ہے، غرض کہ مسلمانوں کی نسبت جو ذہن اور مزاج اکثریت کا ہے اُس کا عکس عمال وکارکنان حکومت کے رویہ میں بھی نظر آتا ہے، اور یہ ایک ایسی صاف اور واضح حقیقت ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا!!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء جب پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا تو اس سلسلہ میں وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر بھی متعدد مرتبہ کہا کہ انھیں خطوط پر دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی ترمیمی ایکٹ بنے گا لیکن ہوا یہ کہ چونکہ دہلی اور بنارس یونیورسٹیوں کے طلباء اور اساتذہ نے اس ایکٹ کے بنیادی خدوخال کے خلاف اپنی شدید بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار پہلے سے کر دیا اس لئے وزیر تعلیم کو اب تک اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور ہماری پیش گوئی ہے کہ آئندہ بھی یہ بل دوسری یونیورسٹیوں کے لئے اپنی موجودہ شکل وصورت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش نہ کیا جاسکے گا۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے ساتھ معاملہ کی نوعیت یہ ہے کہ یہ بل بڑی خاموشی کے ساتھ اچانک پارلیمنٹ کے سامنے آیا اور منظور

بھی ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یونیورسٹی کا نظم ونسق درہم برہم ہو کر رہ گیا، امن وسکون جاتا، تعلیم کا ستیاناس ہو گیا، یونیورسٹی بند کر دی گئی، پولس کے حفاظتی دستوں نے کیمپس پر قبضہ جمالیا۔ ہوسٹل خالی ہو گئے اور یونیورسٹی میں خاک اڑنے لگی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حکومت اطمینان سے بیٹھی ہے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں!! نوجوانوں کی تعلیمی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے ایک پورے برس کا برباد ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے، اور یہ عظیم نقصان صرف طالب علموں کا اپنا نہیں، بلکہ پورے ملک اور پوری قوم کا ہے۔

اس گذارش کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ طلبار بے قصور ہیں اور ان سے کوئی خطا سرزد ہی نہیں ہوئی ہے، لیکن طلبار بہرحال اپنی اولاد ہیں، ملک اور قوم کے مستقبل کا دار ومدار ان کے بننے اور بگڑنے پر ہے، پھر چند در چند اندرونی اور بیرونی اسباب وعوامل کے باعث آجکل ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں نوجوانی اور بڑھاپے میں جو شدید کشمکش برپا ہے اور جس کے مظاہرے خود ہمارے ملک میں بھی آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، لڑکوں کا اپنے جذبات کے اظہار میں آئین وضوابط کے حدود سے متجاوز ہو جانا کوئی بعید نہیں، لیکن اول تو چند طلبار کی وجہ سے ہزاروں نوجوانوں کا ایک تعلیمی سال برباد کر دینا کونسا انصاف ہے! پھر جو طلبار خطار کار ہیں بھی ان کے ساتھ معاملہ عام مجرمین کا سا کہیں پر بھی نہیں کیا جاتا۔ ہم ذاتی طور پر ایسے کتنے ہی نوجوانوں سے واقف ہیں جو طالب علمی کے زمانہ میں انتہائی شریر اور یونیورسٹی کے لئے دردسر تھے، لیکن آج وہ گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے نہایت لائق اور قابل افسر سمجھے جاتے ہیں۔ اس بنا پر یونیورسٹی کا فرض ہے کہ وہ یونیورسٹی کے آئین وضوابط کی رو سے مجرم طلبار کے معاملات پر بھی ہمدردی اور شفقت کے جذبہ کے ساتھ غور کرے نہ کہ کسی انتقامی جذبہ کے ساتھ، اور جہاں تک ممکن ہو کسی نوجوان کے کیریر (career) کو تباہ نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ ایک نوجوان کی تعلیمی زندگی کا تباہ ہو جانا بسا اوقات ایک پورے گھرانہ کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

بدقسمتی سے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ وہاں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا ہے وہ گورنمنٹ کے ایما پر ہوا ہے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو یہ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کے لئے باعث ننگ و عار ہے اور اگر یہ خیال غلط ہے تو گورنمنٹ اور یونیورسٹی دونوں کو اس کی مؤثر عملی تردید کرنی چاہئے، اور اس کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ ۲ر جولائی کو چندماہ کے تعطل کے بعد جب یونیورسٹی کھلے تو جن طلبا کا اخراج کیا جاچکا ہے ان کے معاملہ پر از سرِ نو غور کیا جائے اور یونیورسٹی میں باہم اعتماد و اعتبار کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک جمہوری طرزِ زندگی میں یہی طریقہ کامیاب ہوسکتا ہے، جبر و تشدد اور استبداد و آمریت سے پیچیدگیاں بڑھتی ہیں کم نہیں ہوتیں۔

جنوبی افریقہ اور مورلیشس کے سفر کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے مختلف اداروں کے علاوہ میں ان دونوں ملکوں کی حکومتوں، یونیورسٹیوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور اخبارات وجرائد کا بھی شکرگذار ہوں۔ حکومتوں نے نہ صرف یہ کہ سفر کی سہولتیں بہم پہونچائیں، بلکہ اپنے ہاں کے خاص خاص جلسوں اور پارٹیوں میں شرکت کی دعوت دی، یونیورسٹیوں کے لکچر کے لئے مدعو کیا، اور وائس چانسلر نے بعض تعلیمی معاملات میں مشورہ کے لئے یاد فرمایا۔ ریڈیو اسٹیشن نے تقریر کی دعوت دی، اور اخبارات نے انٹرویو لے کر شائع کیا اور یوں بھی میری نقل و حرکت اور لکچروں کی نسبت وقتاً فوقتاً اطلاعات چھاپتے رہے۔ ان سب نوازشوں اور الطاف و عنایات کا دل پر بڑا اثر ہے اور میں تہِ دل سے ان کے لئے سپاس گذار ہوں۔

ادبی مصادر میں آثار عمرؓ

ایک تجویز مع مثال

از ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۱

تاریخ کا ایک عام علمی مفہوم ہے۔ مجموعی طور پر انسانوں کے ان اعمال و افعال کا مطالعہ جو خود ان کے اختیار کردہ عقیدہ کی اساس پر ان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ زمان و مکان تاریخ کے نہایت موثر عامل ہیں لیکن فیصلہ کن عامل خود انسان ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی افکار و اعمال انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تاریخ کا جزو لازم ہے۔ تاریخ کی ادبی، تمدنی، تہذیبی، ثقافتی، دینی، فکری، قانونی، معاشری، معاشی یا فنی خانوں میں تقسیم زیادہ تر سمجھنے سمجھانے کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن فی الواقع یہ ایک ہی کُل کے اجزا ہیں۔ یہ باہم ایک دوسرے کے مُخالف، معاون، مُمد و مُتمّم ہیں۔ تاریخ کی ایک ایسی تقسیم انسان کے انتہائی کثیر الاوصاف مرکب ہونے کی وجہ سے بھی ضروری ہے۔

انسان کے اوصاف بیان کرنے کے لئے اجمالی و عمومی پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے مثلاً اس کو عالم اصغر کہا جائے تو یہ بات یقیناً مطابق واقعہ ہے مگر حد درجہ عمومی ہونے کی وجہ سے مبہم اور مجہول سی رہتی ہے۔ تشخص و تعین نہیں ہونے پاتا۔ ایک اوسط درجہ کے شائستہ آدمی کی

اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ وہ تشریح چاہتا اور وضاحت کا طلبگار رہتا ہے۔ اس لئے اگر اس کے ہر رخ کو علحدہ دیکھ کر اس کی تفصیل کی جائے اور پھر بحیثیت مجموعی نظر ڈال کر غور کیا جائے تو نظر کا غبار دور ہو کر بصیرت کا نور کل کا احاطہ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر ایک یا صرف معدودے چند رخ ہی دیکھنے دکھانے پر اکتفا کیا جائے تو اس کی دوسری حیثیتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ایسا یک رخی بیان اندھوں کی فیل شناسی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جیسے مثلاً: انسان کو آگ استعمال کرنے والا پستانیہ۔ سوچنے والا جانور یا معاشی حیوان کہنے میں فی الجملہ کوئی غلطی نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کی مذکورہ صفتوں سے کسی ایک کو سب کچھ کہدینا غلط اور بلا شرط و قید ایک ہی حیثیت کو سب سے زیادہ اہم بتانا ناموزوں و نامناسب ہوگا۔ اس لئے کسی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیثیت کو پرکھنے جانچنے اور اس کا ٹھیک ٹھیک موقف متعین کرنے کا صحیح نہج یہ ہوگا کہ اس کے افکار و اعمال کا ممکنہ حد تک ہر ایک جزو پیش نظر رکھنے، ان کے باہمی ربط و تعلق و تناسب کے کماحقہ جاننے اور بے لاگ مطالعہ کرنے کو لازمی شرط مان لیا جائے۔

مدت دراز سے تاریخ کے مفہوم میں اس کے سیاسی پہلو کو اتنا اہم سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے دوسرے پہلو بالکل یا بیشتر نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ ان کا ذکر آیا بھی ہے تو زیادہ تر ذیلاً و ضمناً۔ مثلاً اگر ہم ابتدائی مسلموں کی ادبی زندگی کا بیان یا ان کی معاشرتی و معاشی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو مشہور عام تاریخوں میں کوئی قابل لحاظ مواد دستیاب نہیں ہوتا، اور وقت کا بدل نہیں ملتا اور یہی وہ متاع ہے جو کبھی کسی صورت مکرر نہیں ملتی۔

تاریخ ساز افراد کی سوانح نگاری میں یہ یک رخا پن یا عدم توازن یا احساس توازن کا فقدان اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ برگزیدہ اشخاص زمان و مکان سے وابستہ رہنے اور اتار چڑھاؤ قبول کر سکنے والی شخصیتیں نہیں بلکہ محض خیال کی پیداوار معلوم ہوتی اور ماورائے انسانیت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کارنامہ کا نمود بے شک و ریب بجا و درست لیکن اس کی نمائش فریب نظر سے سے زیادہ نہیں۔ سایہ اجالے کے بغیر بعکس شخص کی نہیں محض خیال کی پرچھائیں ہے، یہ عبث کاری

نہیں بلکہ زندے کا گھسنا اور کرنچی کا بچارا ہے۔
جلال وجمال کی انتہا حیرانی کا باعث ہوتی اور حیرانی سے جمود وسکوت طاری ہوتا ہے بعض شخصیتوں
کے قول وفعل کے اثرات دوسرے افراد انسانی کی بہ نسبت زیادہ گہرے دوررس اور وسیع تر ہوتے
ہیں ان کے بیان میں حق وصداقت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا اور ان کے اظہار میں بقدر امکان
واستطاعت اعتدال برقرار رکھنا ہر سوانح نگار ومورخ کا اولین اور بنیادی فرض ہے۔ ایسا علم
حاصل کرنا ہر اس شخص کے لئے لابدی ہے جو جان بوجھ کر مستقبل کی صورت گری کرنا چاہتا ہے۔ ماضی کا
صحیح علم حاصل کئے بغیر مستقبل کی تشکیل ممکن نہیں۔

۲

یہ واقعہ تو غالباً معمولی سمجھ رکھنے والا بھی جانتا و مانتا ہے کہ انسان کی فکر و نظر اور نتیجتہً اس
کے عمل میں پائیدار و دیرپا تبدیلی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واسطوں سے ہوتی ہے ان کا سلسلہ سیدنا
ابوالقاسم محمد بن عبداللہ صلعم پر ختم ہوگیا۔ آپ صلعم کی زندگی کا دھندلا دھم نہیں بلکہ صاف و واضح
اور ناقص و ناتمام نہیں بلکہ بقدر ضرورت کامل ومکمل نقشہ تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے البتہ کم لوگ جانتے
ہیں کہ آپ صلعم کے ساتھیوں خصوصاً آپ صلعم کے دو ابتدائی جانشینوں نے تاریخ عالم پر عموماً اور تاریخ
اسلام پر خصوصاً ایسا گہرا اور وسیع اثر ڈالا ہے کہ قولاً وفعلاً ان کی اتباع امت اسلامی کے جم غفیر و جمہور
کثیر کے ایمان کا لازمہ، ان کے عمل کے لئے نمونہ اور ان کے قانون کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اسی وجہ
سے ان بزرگوں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں آثار ہیں جو تفسیر وحدیث، فقہ وکلام وغیرہ جیسے علوم و
فنون کی کتابوں میں نقل ہوتے آئے ہیں اور ایسی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں جو صدہا سال سے
ان علوم وفنون میں مصادر و مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔
عمر رض کے سوانح نگاروں نے زیادہ تر ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن میں کسی نہ
کسی ترتیب سے صرف نمایاں حوادث قلم بند کئے گئے ہیں۔ جیسے اخبار الرسل والملوک یا
طبقات الصحابۃ الکبری، فتوح البلدان وغیرہ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری کتابوں میں حسب توقع

ایسی خبریں ملتی ہیں جو ان بزرگوں کی معاشی زندگی سے متعلق ہیں۔ اعداد ان کی فکر و نظر سے ۔۔ دیت [illegible]
۔۔ تعرض نہیں کرتیں۔ ان سوانح نگاروں نے علوم و فنون کی ان کتابوں سے شاذ و نادر ہی فائدہ اٹھایا
ہے جن کی طرف استشہاد کیا گیا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ عمرین کے جملہ آثار کسی نہ کسی سہولت بخش ترتیب سے سلسلہ وار
یک جا مرتب ہونے چاہئیں۔ ان کے بغیر عمرین کی زندگی کے متعلق ہمارا علم ادھورا رہے گا۔ اس لئے
اس ادھورے علم پر مبنی عمل بھی ادھورا و ناقص رہے گا اور بالواسطہ اسلامی قانون بھی کسی نہ
کسی حد تک قابل ترمیم دکھائی دے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو اور عربی میں عمرین رضؓ کی ایک سے زائد سوانح موجود ہیں لیکن
مواد کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان بزرگوں کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکے ۔ بعض
سوانح نگار مثلاً شبلی نعمانی مرحوم ان مصادر سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے جو ان کے
زمانہ تصنیف تک چھپ کر عام نہیں ہوئے تھے اور مخطوط ماخذوں کا ان تک پہنچنا ممکن نہیں ہوا۔
اپنے سابقوں کی فضیلت تسلیم کرتے ہوئے اب ان مصادر و ماخذ سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری
ہے جو گذشتہ نصف صدی میں شائع ہو چکے ہیں تاکہ ہمارے پیشرو جو اچھا مفید و نیک کام کر گئے
ہیں اس کا سلسلہ جاری رہے اور اس میں مزید ترقی ہو۔

اسلامی دینی و مذہبی کتابوں میں آثار شیخین کا پایا جانا یقیناً ایک طبعی و فطری سی بات ہے
اس لئے ان کی اہمیت یاد دلانے کی حاجت نہیں البتہ یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خالص
ادبی و لغوی و معاشرتی حتیٰ کہ نحوی مصادر میں بھی عمرین کے آثار بتعداد کثیر قید تحریر میں آ گئے
ہیں۔ ان کی طرف سوانح نگاروں اور عالموں نے بہت ہی کم توجہ کی ہے درآں حالیکہ شرعی حیثیت
سے ان کی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتی ۔ بلکہ بعض صورتوں میں ان آثار سے
شیخین کی زندگی کے ایسے رخ بھی واضح ہوتے ہیں جو آج بھی فکر انگیز و قابل عمل معلوم
ہوتے ہیں۔

۳

اس مقالہ کی اصل غرض تاریخ اسلام کے طالب علموں کو عموماً اور عمرین کے آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کو خصوصاً ان دسیوں اساسی ادبی مصادر کی طرف توجہ دلانا ہے جن میں ان کے ارشاد و اقوال ہزاروں صفحوں میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ سوائے ان مصادر کے دوسری کتابوں میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں جب کہ مسلم وغیر مسلم دونوں میں اسلامی اقدار کی از سرِ نو جانچ پڑتال کرنے کی طرف مائل اور موجودہ حالات میں ان کی آرزش کا تعین کرنا چاہتے ہیں عمرین کی زندگی کا "خزانہ معلومات" ("ذخیرہ عمرین") جمع کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

اگلے صفحوں میں کوشش کی گئی ہے کہ بطور مثال شیخین سے قریب تر زمانہ کے ایک نہایت ممتاز بلکہ شاید سب سے بڑے عربی ادیب ابو عثمان عمرو بن بحر جاحظ کی تحریروں میں عمرین کے جو آثار نقل ہوئے ہیں ان کا احاطہ کیا جائے۔ یہ مثال اس طرح کے دوسرے ادبی و علمی مصادر سے مطلوبہ مواد جمع کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ کا کام دے گی۔ یہ نمونہ خواہ مکمل نہ سہی ناقابل التفات بھی اِن شاء اللہ نہیں ہوگا۔

اگر اس طرح شیخین سے متعلق ایک ایک ادیب، تذکرہ نگار یا فقیہ و محدث وغیرہم کی دی ہوئی معلومات جمع ہو تی رہیں تو عجب نہیں کہ آئندہ کسی وقت ان سب کو بترتیب زمانی مع اشاریہ موضوعات وغیرہ اس طرح منظم کیا جا سکے کہ ان بزرگوں کے سوانح اور ان کے احوال و ظروف سے متعلق نہایت قابل اعتماد بنیادی مواد یکجا مل جائے۔ نسبتاً عارضی وہنگامی منافع (وشہرت) سے خالی ایسے صبر طلب ٹھنڈے لیکن ضرور تمندوں کا وقت اور ان کی توانائی بچانے والے دیرپا کام کی ہمت افزائی بہت کم ہوتی آئی ہے۔ اس واقعہ کے باوصف مجھے یقین ہے کہ مجوزہ مواد کی باآسانی فراہمی کے بغیر بڑے سے بڑا مفکر و مورخ بھی ان شخصیتوں اور ان کے زمانہ کے افکار و حوادث کی جو بھی تشریح و تعبیر یا تجزیہ و تحلیل کرنے کی کوشش کرے

گا وہ محض یک رخی ہوگی۔ اس میں تناسب کا فقدان ہوگا وہ ناقص رہے گی۔ یہ نقص کم ازکم بعض صورتوں میں تو گمراہ کن بھی ہوسکتا ہے۔

ایسا کام سرانجام دینے کے لئے انسانی ذرائع منظم کرنے اور مادی وسائل فراہم کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کا عذر خواہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو اس کا ایک واضح نمونہ پیش خدمت کرنے میں تواضع وکسر نفسی کا اظہار خالی از تکلف نہیں۔ ایک مختصر نمونہ بھی خوبی وسود مندی سے بے بہرہ نہیں ہوسکتا۔ والکمال للہ"۔

راقم السطور نے بعض آثار کی اپنی دانست میں صرف حسب ضرورت تشریح کرنے میں کوئی برائی (شر) مضرت یا قباحت نہیں محسوس کی۔ اس کوشش میں غلطی کا صرف امکان ہی نہیں احتمال بھی ہے اس لئے اختلاف کی گنجائش بہرحال رہے گی۔ اختلاف کو رحمت کا باعث ہونا چاہیئے نہ کہ نفس پروری کا۔ جس اثر کا مفہوم پوری طرح یا جزواً سمجھ میں نہیں آیا اس کا اظہار کرتے ہوئے اہل علم سے دریافت کروں گا کہ اگر وہ قابل توجہ خیال فرمائیں تو اصلاح فرمائیں

إن الله لا يضيع اجر العاملين۔

پہلے آثار کا اردو ترجمہ سلسلہ وار بترتیب ماخذ دیا گیا ہے ترجمہ کے آخر میں عربی متن اسی ترتیب سے نقل ہوا ہے۔

جاحظ کی پیدائش سنہ ۱۵۰ھ میں اور وفات ۲۵۰ھ میں ہوئی۔ تقدیم زمانی کی اہمیت کے پیش نظر ان کی کتابوں سے عمرؓ بن سے متعلق آخبار بھی بطور ضمیمہ شامل مقالہ ہیں

یہ جاحظ کی جن کتابوں سے ماخوذ ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ البیان والتبیین ۔ مصر ۔ ۱۹۴۸ ۔ ۱۹۵۵
۲۔ البخلاء " ۱۹۴۸
۳۔ الحیوان " ۱۹۴۸ ۔ ۱۹۶۵
۴۔ رسائل " ۱۹۶۵

۵۔ التربیع والتدویر۔ مصر۔ ۱۳۲۴ھ

یہی رسالہ ۔ لیدن۔ ۱۹۰۳ء

ان میں کتاب العثمانیہ (مصر۔ ۱۹۵۵) قصداً ترک کی گئی ہے۔ متوسط تقطیع کی یہ کتاب دو سو اٹھتر صفحوں پر آئی ہے۔ اس میں عربی کا نام قریباً ہر ورق پر ہے۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

رسائل محولہ ۳ کے دو جز ہیں۔ ان میں جاحظ کے جملہ سترہ (۱۷) رسالے ہیں۔

تفصیلی حوالے حسب ضرورت برمحل درج ہیں۔

آثار ابی بکر صدیقؓ م ۲۲۔۶۔۱۳ھ

۱ ابوبکر صدیق رحمہ اللہ نے اپنی زبان کا ایک حصہ پکڑا اور فرمایا اس نے مجھے خطرناک مقام پر لا کھڑا کیا۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۱۹۴

تشریح: یہ اثر برمحل و باموقع خاموشی کی تحسین پر دلالت کرتا ہے۔

۲ ایک شخص ابوبکرؓ کے قریب سے گزرا۔ اس کے ساتھ کچھ کپڑے تھے، آپ نے پوچھا: کیا تم کپڑے بیچتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں تمہیں اللہ مال دار بنائے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا: اگر تم تعلیم پاتے تو تم جانتے (کہ جواب کس طرح دیا جاتا ہے) یوں کہو: نہیں اور اللہ آپ کو معاف کرے۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۶۱

تشریح: "لا" "نہیں" کے بعد "واو" استیناف نہ لگنے کی وجہ سے بیان میں ایک بڑا نقص پیدا ہو گیا۔ "واو" کے بغیر یہ معنی ہو سکتے ہیں: نہ بنائے تمہیں اللہ مال دار۔

اردو میں اس جیسی ایک مثال ملاحظہ ہو: کسی نے کہا: اس وقت بھاگوت تھیٹر۔

(۱) ایک معنی تو ہوں گے اس وقت مت بھاگو ٹھہرے رہو۔ (۲) دوسرے معنی ہوں گے اس وقت بھاگ جاؤ ٹھیرو مت۔

غالباً دوسری زبانوں میں "واو" استیناف کا بدل موجود ہے۔ اردو میں رموز اوقاف کا چلن ہو گیا ہے۔

۔اثر ابی بکر صدیق رضؓ کے قول کے جیسا قول رسول اللہ صلعم سے بھی منقول ہے اس واقعہ میں آپ صلعم نے ایک خطیب کی تصحیح فرمائی تھی۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ صحیح مسلم۔ کتاب الجمعہ۔ حدیث ۴۸

۲۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب الادب۔ باب ۷۷

۳۔ سنن نسائی۔ کتاب النکاح۔ باب ۴۰

۳ ابراہیم بن محمد انصاری مفلوج ابو زید انصاری کی اولاد سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: خلفاء، ائمہ اور مومنوں کے امراء، ملوک ہیں مگر ہر ملک خداوند یا راجیشور، خلیفہ یا امام نہیں ہوتا۔ اس لئے ابوبکر رضؓ نے اپنے خطبہ میں ان کو ایک دوسرے سے الگ کہا ہے۔ چناں چہ جب آپ اللہ کی حمد اور نبی کی صلاۃ سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

"آگاہ ہو جاؤ کہ دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ بدبخت خداوند و راجیشور ہیں!

یہ سن کر لوگ چونکنے ہوئے اور اپنے سر اونچے کئے (گردن اٹھائی) تو آپ نے فرمایا:

لوگو! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم تو طعنہ زنی کرنے والے جلد باز ہو۔ کتنے ہی خداوند (وراجیشور) ایسے ہیں کہ حکمران ہو جائیں تو جو مال ان کے قبضہ میں ہے اس کے خرچ کرنے میں اللہ ان کو بخیل بنا دے اور جو دوسروں کے قبضہ میں ہے اس کے لینے کی طرف راغب کر دے۔ اور ان کے جینے کے وقت میں کچھ کمی کر دے اور ان کے دلوں میں زندہ رہنے کی

ہوس ڈال دے ۔ یہ ایسے ہیں کہ کسی کے یہاں تھوڑا ہو تو اس پر بھی حسد کریں اور اگر کسی کے یہاں
وافر ہو تو اس سے ناخوش ہو جائیں یہ لوگ آسودگی سے تنگ آجاتے ہیں ۔ نکاح میں ان کو کوئی لذت
نہیں آتی ۔ یہ بہی خواہوں سے کام نہیں لیتے ۔ اور بھروسہ کے لوگوں سے خوش نہیں رہتے ۔ یہ تو
ایسے ہیں جیسے کھوٹے سکے یا نظر فریب سراب ۔ دیکھنے میں خوش وخرم مگر اندر اداس وغمگیں ۔ جب
ایسے شخص کا جی بیٹھ گیا اس کے عمر کی شادابی ٹھٹھر گئی اور اس کا سایہ سکڑ گیا (وہ مر چکا) تو اللہ نے اس
سے حساب لیا ۔ حساب میں سختی کی اور مہربانی میں کمی کر دی اِلّا یہ کہ جو اللہ پر ایمان لائے ۔ اس کی
کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مطابق حکومت کرے ۔

آگاہ رہو! رحم تہی دستوں ونا داروں ہی پر ہوتا ہے ۔ خبردار رہو!! آج تم نبوت کی خلافت
میں ہو ۔ بیچ سڑک پر ہو ۔ تم دیکھو گے کہ میرے بعد اقتدار میں درشتی ہے اور فرماں روا رستے
سے ہٹا ہوا ۔ امت بکھری ہوا اور خون بہا ہوا ۔

دیکھو اگر باطل کی طرف چھلانگ لگائی جا رہی ہے، اہل حق کے خلاف سوار دوڑ رہے
ہیں، خلافت کے اثرات مٹائے جا رہے ہیں (حق کے خلاف) انسان اپنی جانیں دے رہے ہیں
اس کے لئے فتنے برپا کئے جا رہے ہیں اور سیدھے چلے ہوئے طور طریق مٹائے جا رہے ہیں تو
ایسی صورت میں تم مسجدوں سے لگے رہو ۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرو ۔ اطاعت بہرحال
کئے جاؤ ۔ جماعت سے علٰحدگی ہرگز نہ ہونے پائے اور اس سے وابستگی میں فرق نہ آئے ۔

ارادہ کی مضبوطی، مشورہ اور کر گزرنے کا عہد طویل غور وفکر کے بعد ہونا چاہئے ۔

تم جانتے ہو خرشنہ کہاں ہے ؟ عن قریب اس سے بعید تر علاقہ تمھارے قبضہ میں آجائے
گا جیسا کہ تم اس کے قریب تر مقام فتح کر چکے ہو ۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۴۳ جاری

خرشنہ : بلاد روم یعنی بازنطینی سلطنت کا ایک سرحدی جنوب مغربی مقام

۴ ابوبکرؓ کا کلام : یہ آپ نے اپنی وفات کے وقت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر

کرتے وقت کیا تھا۔

میں تم کو اپنا جانشین بنانے والا ہوں۔ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

اللہ کے بعض کام رات کے وقت کئے جاتے ہیں اگر دن میں کئے جائیں تو وہ انھیں قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح اللہ کے بعض کام دن کے وقت کئے جاتے ہیں، اگر رات میں کئے جائیں تو وہ انھیں قبول نہیں کرتا۔ اللہ فرض سے زائد کام اس وقت قبول کرتا ہے جب فرض کام ادا کر دئے جائیں۔ اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

قیامت میں انہیں لوگوں کے وزن بھاری ہوں گے جن کے وزن دنیا میں حق کی پیروی کے اعتبار سے بھاری رہے ہوں۔ حق کا بھاری پن انہیں کے لئے ہوگا (جو دنیا میں اس کو بھاری سمجھتے تھے) میزان اسی لئے ضروری ہے کہ اس میں سوائے حق اور کچھ نہ رکھا جائے۔ اگر وہ بھاری ہو۔

قیامت میں انھیں لوگوں کے وزن ہلکے ہوں گے جن کے وزن دنیا میں باطل کی پیروی کے اعتبار سے ہلکے رہے ہوں۔ باطل کا ہلکا پن انہیں کے لئے ہوگا جو دنیا میں اس کو ہلکا سمجھتے تھے۔ میزان اسی لئے ضروری ہے کہ اس میں سوائے باطل اور کچھ نہ رکھا جائے اور اگر وہ ہلکا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے جنتیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اچھے اعمال بیان کر دئے ہیں۔ ان کی برائیوں سے درگزر کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جب میں انھیں یاد کرتا ہوں تو کہتا ہوں: مجھے اندیشہ ہے کہ شائد میں ان میں سے نہیں ہوں، اللہ نے آگ میں جلنے والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے برے اعمال بیان کر دئے ہیں اور ان کی اچھائیوں کا ذکر نہیں کیا۔ جب میں انھیں یاد کرتا ہوں تو کہتا ہوں: مجھے امید ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گا۔ اللہ نے رحمت کی آیتوں کے ساتھ ساتھ عذاب کی آیتیں بھی بیان کی ہیں تاکہ بندہ رحمت کا رغبت کرے اور عقوبت سے ڈرتا رہے۔ اور اللہ سے سوائے حق اور کوئی بات منسوب

نہ کرے (سوائے حق اور کچھ نہ مانگے) اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔

اگر تم نے میری وصیت یاد رکھی تو آن دیکھی چیزوں میں تمہیں موت سے زیادہ کوئی اور شئے محبوب نہ ہونی چاہیئے۔ اور اگر تم نے میری وصیت بھلادی (ضائع کردی) تو آن دیکھی چیزوں میں تمھیں موت سے زیادہ اور کوئی شئے نفرت انگیز نہ ہونی چاہیئے۔ حال آں کہ تم اللہ کو عاجز کر ہی نہیں سکتے (اس کا حکم تو بہر حال چلے گا ہی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو)

البیان والتبیین۔ ج ۲ ص ۴۵

۵ ابوبکرؓ حج میں مقام جمع (مزدلفہ) سے لوٹے۔ وہ اس وقت اپنے اونٹ کو اپنے ٹیڑھے مٹھ کے سونٹے سے مار کر اُسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۸۵

توضیح: اس اثر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ابوبکرؓ مِحجَن: عصا استعمال کرتے تھے۔

۶ روایت ہے کہ ابوبکرؓ کو کسی کی موت کی اطلاع ملتی تو آپ کہتے: لا الٰہ الا اللہ سوائے اللہ کے اور کوئی الٰہ نہیں ہے

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۱۴۴

۷ ابوبسطام شعبہ بن حجاج واسطی م ۱۶۰ھ عمر بن مُرّہ م ۱۱۶ھ سے روایت کرتے ہیں: اہل یمن کا وفد ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے انھیں قرآن سنایا۔ وہ سب کے سب رونے لگے۔ آپ نے فرمایا: ہم بھی ایسے ہی تھے (کہ قرآن سنتے تو دل پگھل جاتے) مگر اب دل سخت ہوگئے ہیں۔

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۱۵۱

ملحظہ: ابوبکرؓ کا یہ قول بر بنائے تواضع ہے۔ خود رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے سننے کا جو اثر ہوتا تھا وہ بھی اس قول سے ظاہر ہے۔

۸ ابوبکرؓ نے فرمایا: قابل رشک بھلائی ہے ان کے لئے جو ایسے زمانہ میں وفات

پا گئے جب اسلام کمزور ونا چار تھا۔

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۱۵۱

توضیح : مطلب یہ کہ : اقتدار حاصل ہونے سے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ان سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہے۔ یا یہ کہ

تسلط و غلبہ کے بعد اسلام قبول کرنا آسان ہوگیا اس لئے ابتدائی مومنوں کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کی وجہ سے ان کا ثواب بہت زیادہ ہوگا۔

۹ ابوبکر صدیق رضؓ نے خالد بن ولید کو فوجی کارروائی پر روانہ کرتے وقت ان سے کہا : موت کی حرص کرو، تمہیں زندگی بخشی جائے گی۔

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۱۷۰

جاحظ نے ابوبکر رضؓ کا یہ فرمودہ اپنے رسالہ کتاب البخال میں ہو بہو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو۔ رسائل الجاحظ ج ۲ ص ۳۷۷

ملحوظہ : ابوبکر رضؓ کا ارشاد واضح ہے، یہاں سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۹ کی یاد تازہ کرلی جائے تو مناسب ہے " اعنی، وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ "

باتباع فرمان رسول اللہ صلعم ـــــ اِنّ من الشعر حکمۃً (صحیح البخاری کتاب الادب : ۷۸ ۔ باب : ۹۰) شعر میں حکمت بیان ہوتی ہے صحابیہ خنساء کی ایک بیت کا استحضار برمحل ہوگا۔

ھِیْنَ النفوس وھون النفو ـــــ س یوم الکریھۃ ابقی لھا

مطلب یہ کہ بوقت جنگ جان کو حقیر سمجھنے ہی سے جان عزیز باقی رہتی ہے۔

۱۰ جب ابوبکر رضؓ کسی شخص کو تسلی دیتے تو کہتے : صبر کے ساتھ مصیبت جمع ہوسکتی ہے اور نہ ہائے والے کے ساتھ کوئی فائدہ جوڑ کھاتا ہے۔

موت سے پہلے جو کچھ (از قسم خیر) گزر چکا ہے اس کے مقابلہ میں موت نہایت ناگوار ہے

(کر بھلائی کرنے کا موقع جاتا رہا) موت کے بعد جو کچھ (از قسم رحمت) ہونے والا ہے اس کے مقابل موت نہایت حقیر ہے۔

البیان والتبیین۔ ج ۳ ص ۲۸۴

۱۱ (رسول اللہ صلعم کی وفات کے فوراً بعد ہی انصار بنو ساعدہ کے چھت والے چبوترہ ——— سقیفہ میں جمع ہوئے۔ وہاں)

حباب بن منذر خزرجی نے کہا:

میں وہ سالار ہوں جس کی رائے تشفی بخش ہوتی ہے۔ میدان قتال میں میری حیثیت جھنڈے کی سی ہے اسی کی وجہ سے نبرد آزما میدان میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ہم پھر اس میں پہل کرنے کو تیار ہیں (مناسب ہے کہ) ہم میں سے ایک امیر اور تم میں سے ایک امیر ہو ورنہ مہاجر اگر انصاری کے بارے میں کچھ کرے تو انصاری اسے رد کر دے گا اور اگر انصاری مہاجر کے بارے میں کچھ کرے تو وہ اسے رد کر دے گا۔

(خزرجی کی اس تقریر پر) عمرؓ نے کچھ کہنا چاہا تو ابوبکرؓ نے کہا: عمر! ذرا ٹھیرو [ہم مہاجر ہیں۔ اسلام قبول کرنے میں لوگوں میں سب سے زیادہ پیش پیش، باعتبار سکونت ان میں سب سے اچھی جگہ رہنے والے، ذاتی و خاندانی حیثیت سے لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم، وجاہت کے لحاظ سے ان میں سب سے بہتر، پیدائش کے حساب سے عرب میں ہماری تعداد سب سے زیادہ اور رسول اللہ صلعم سے رشتہ میں قریب ترین۔ ہم نے آپ حضرات سے پہلے اسلام قبول کیا۔ قرآن نے ہم کو آپ پر مقدم کیا۔ آپ دین میں ہمارے بھائی ہیں اور مال میں ہمارے شریک۔ دشمن کے خلاف ہمارے مددگار۔ آپ نے ہمیں پناہ دی، مدد کی اور انس برتا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ہم امیر ہوں گے آپ وزیر۔ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور گروہ کے آگے نہیں جھکیں گے آپ کا حق پر اتنا یقین کہ اللہ نے جن مہاجرین کو جو

کچھ دیا ہے اس پر آپ رشک نہیں کریں گے۔

(یہ سن کر) انصار نے کہا: ہم راضی ہیں۔ آپ کی بات تسلیم کرتے ہیں۔

عیسی بن یزید ارزق کی روایت ہے کہ: ابوبکرؓ نے کہا: ہم اللہ کے خدمت گزار ہیں۔ ہم باعتبار بود و باش اللہ کے گھر سے اور بلحاظ رشتہ داری اللہ کے رسول سے بہت قریب ہیں اگر یہ امر (حکومت) اوس تک بڑھا اور پھیلا تو خزرج اس سے تھمڑ کر سکڑ نہیں جائیں گے (وہ بھی حکومت کا دعوی کریں گے) ان دونوں گروہوں میں اتنے قتل ہوئے ہیں کہ وہ بھولے نہیں جاتے اور اتنے زخمی ہوئے ہیں کہ وہ چنگے نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ میں سے کسی نے آواز لگائی تو وہ یقیناً ببر کے جبڑوں کے بیچ میں آ گیا۔ مہاجرا سے دانتوں سے کاٹے گا اور انصاری چبا جائے گا۔

البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۹۶ جاری

۱۲ ابن ابی سفیان بن حویطب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں:

میں عمرہ کر کے اپنے مکان واقع مدینہ پہنچا تو میرے گھر والوں نے کہا: کیا تمھیں معلوم ہوا کہ ابوبکرؓ قریب مرگ ہیں؟ یہ سنتے ہی میں ابوبکرؓ کے پاس پہنچا دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں نے کہا: رسول اللہؐ کے خلیفہ! کیا اسلام لانے والوں میں سب سے اول آپ ہی نہیں تھے؟ کیا رسول اللہؐ کے ساتھ غار میں دوسرے آپ ہی نہیں تھے؟ آپ کی ہجرت پکی اور سچی۔ آپ کی مدد خوب و زیبا۔ آپ لوگوں کے والی ہوئے اور ان کے دوست و بھی خواہ! ان پر ایسے کو عامل بنایا جو ان میں بہتر تھا۔

ابوبکرؓ نے کہا: جو کچھ میں نے کیا وہ ٹھیک ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں۔ خدا کی قسم ٹھیک ہے!

آپ نے فرمایا : قسمیہ ؟ (فاقعی ؟) میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جو کچھ میں نے کیا اچھی طرح جانتا ہوں (کہ وہ درست ہے) لیکن یہ بات مجھے خدا سے مغفرت طلب کرنے میں ہرگز مانع نہیں ہوگی (میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا وہ فعال لما یرید ہے)

البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۹۸

۱۳ جعفر بن محمد اپنے والد سے اور وہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں (میرے والد کی شہادت کے بعد) میری والدہ اسماء بنت عمیس سے ابوبکرؓ نے نکاح کیا تھا۔ میرے پاس کتے کا ایک پلّا تھا۔ وہ آپ کے پلنگ کے نیچے تھا۔ میں نے کہا : باباجان ! کیا میرا کتا بھی ؟

ابوبکرؓ نے کہا : میرے بچے کے کتے کو نہ مارو۔

پھر آپ نے اپنی انگلی سے کتے کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی اس کو پلنگ کے نیچے سے نکال دو ۔ مجھے معلوم نہیں (وہ کب نکالا گیا) پھر وہ مار دیا گیا۔

الحیوان ۔ ج ۱ ص ۲۷۹

۱۴ (رسول اللہ صلعم ۶ سنہ ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں عمرہ کے ارادہ سے قربانی کے ستر اونٹ لئے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر قریش مانع ہوئے اور بالآخر عارضی صلح ہوگئی کہ آپ اِس سال عمرہ ملتوی کر دیں گے۔

صلح کی بات چیت کے ابتدائی مرحلہ پر قریش کے نمائندہ بُدیل بن ورقہ نے رسول اللہ صلعم سے کہا : تم اپنے توند نکالے ہوئے پیٹوؤں کالے کچلوں کو ساتھ لے آئے ہو۔ اگر انہیں ہتیاروں کی معمولی سی چوٹ بھی آجائے تو وہ تمہیں ہمارے حوالے کرکے اپنی پیٹھ دکھا دیں گے۔

اس جملہ پر ابوبکرؓ کو غصہ آگیا۔ آپ کی زبان سے ایک ناگوار جملہ نکل گیا۔ یعنے

(جاہلی عربوں کی دیبی) "لات کی اندام نہانی کترنے والے! کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم آپ صلعم کو تنہا چھوڑ دیں گے؟"

الحیوان ج ۳ ص ۴۲ + رسائل الجاحظ۔ ج ۲ ص ۹۳

تنبیہ: یہ روایت من وعن الف: صحیح البخاری: کتاب الشروط: ۵۴ باب ۱۵ وکتاب المغازی۔ ۶۴ باب ۳۳ اور

ب: سیرۃ رسول اللہ صلعم لابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۷۔ مصر۔ ۱۳۵۵ھ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۵ ابوبکرؓ نے بوقت وفات اپنی لڑکی سیدہ عائشہؓ زوج رسول اللہ صلعم سے فرمایا: میں تم کو اپنے مال سے جو مجھے مقام عالیہ سے وصول ہوتا ہے ستر شتر بار دیئے دیتا ہوں۔ تم اکیلے اس پورے مال پر قابض ومتصرف نہ ہوجاؤ۔ وہ وارثوں کا مال (تمہارے علاوہ دوسرے) وارث تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

سیدہ عائشہؓ نے پوچھا: میں اپنے دو بھائیوں اور ایک بہن اسماء سے واقف ہوں۔ کسی دوسرے وارث کو نہیں جانتی۔

ابوبکرؓ نے فرمایا: میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ (تمہاری سوتیلی ماں) بنت خارجہ حاملہ ہے۔ اس کے لڑکی پیدا ہوگی۔

الحیوان ج ۶ ص ۵۰ جاری

تشریح: بنت خارجہ یعنی حبیبہ بنت خارجہ بن زید انصاری
ابوبکرؓ کی وفات کے بعد آپ کی بیوی حبیبہ سے حسب توقع لڑکی تولد ہوئی۔ نام ام کلثوم تھا۔

تفصیل چاہنے والے طبقات الصحابہ لابن سعد ــــ فہرس الاعلام سے رجوع ہوسکتے ہیں۔

۱۶ ابوبکرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ : آپ کے پاس استلذاذ بالمثل کرنے والا (بغرض سزا) لایا گیا۔ آپ نے اس کی پیٹھ پر دیوار گرا دینے کا حکم دیا۔

ابوبکرؓ کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ : خالد بن ولید نے ابوبکرؓ سے ایسے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جو مذکورہ بالافعل کے مرتکب تھے تو ابوبکرؓ نے ان سب کو جلا دینے کا حکم صادر فرمایا۔

رسائل الجاحظ۔ ج ۲ ص ۱۰۰

تنبیہ : "زندہ جلا دینے" والی روایت راقم الحروف کی نظر میں نہایت ضعیف ہے۔ البتہ بطور تہدید ایسا قول بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

۱۷ ابوبکرؓ نے فرمایا : مجھے اپنے گھر والوں پر غصہ آتا ہے۔ وہ کئی دنوں کا غلہ ایک ہی دن میں ختم کر دیتے ہیں۔

البخلاء۔ ج ۱ ص ۴۴

تنبیہ : ظاہر ہے کہ اس قول سے آپ کی مراد اِسراف سے روکنا ہے نہ کہ فیاضی و مہمان نوازی سے۔

ضمیمہ آثار ابی بکر صدیقؓ

عبدالملک بن مروان نے برسرِ منبر کہا : اے ننگہ بالاشدہ گروہ ! کاش تم ہم سے انصاف کرتے (تم ہم سے انصاف کیوں نہیں کرتے) تم ہم سے ابوبکر و عمر کی سی سیرت کے طلبگار ہو دراں حالیکہ نہ تو تم خود اپنے ہی میں ان کی رعیت کی سی سیرت رکھتے ہو اور نہ ہم سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہو جو ان کی رعیت نے ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ سب کے لئے سب کی مدد کرے۔ (لماٰلی و

رعیت ایک دوسرے کے باہمی مددگار ہوں۔)

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۶۵

۲ محمد بن اسحاق م ۱۵۲ نے یعقوب بن عُتبہ م ۱۲۸ سے اور عُتبہ نے انصار کے ایک شیخ سے روایت کی ہے: یہ انصاری شیخ بنو خزرج کی شاخ زُرَیق سے تھے۔ انصاری نے کہا کہ جب نعمان بن منذر کی تلوار عمر رحمہ اللہ کے یہاں لائی گئی تو آپ نے جبیر بن مُطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف م ۵۷ھ کو بلایا۔ انہیں اس تلوار سے مسلح کیا پھر پوچھا۔ جبیر بتاؤ نعمان کون تھا؟ جبیر نے کہا قبیلۂ قنص بن معد سے جو باقی رہ گئے ان سے۔

جبیر عربوں کے بہت بڑے نسب داں تھے۔ انھوں نے یہ علم ابوبکر صدیق رضی اللہ سے حاصل کیا تھا۔

اور سعید بن مُسیّب بن حَزَن مخزومی م ۹۴ھ نے یہ جبیر سے سیکھا تھا۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۳۰۳، ۳۱۸

ابوبکر رحمہ اللہ اس امت میں نسب کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ آپ کے بعد عمرؓ کا درجہ تھا۔ پھر جبیر بن مطعم پھر سعید بن مسیّب پھر ان کے لڑکے محمد بن سعید۔

الحیوان ج ۳ ص ۲۱۰

اصحاب اخبار (تاریخ) و انساب میں سب سے پہلے ابوبکر صدیق رحمہ اللہ کا درجہ ہے پھر جبیر بن مطعم کا۔ پھر سعید بن مسیّب کا پھر قتادہ بن دعامۃ بصری م ۱۱۷ھ اور ابو عبداللہ عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود ہذلی م ۹۸ھ کا

البیان والتبیین ج ۱ ص ۳۵۶

۳ کہتے ہیں عثمان بن عفان خطبہ دینے منبر پر چڑھے۔ مگر رک گئے تو کہا:
ابوبکر و عمر اس مقام پر جو کچھ کہنا چاہتے اس کے لئے وہ تیاری کیا کرتے تھے لب

تمہیں خطیب امام سے زیادہ عادل امام کی ضرورت ہے۔ عنقریب تم ایسے خطبے سنو گے جیسے کہ ہونے چاہئیے۔ اِن شاء اللہ تمہیں معلوم ہو جائے گا (کہ میں خطیب ہوں)

البیان والتبیین ج ۱ ص ۳۴۵ اسی کتاب کے دوسرے جز کے صفحہ ۲۵۰ پر یہ اطلاع مکرر آئی ہے۔ یہاں آخر میں عن قریب الخ نہیں ہے۔

۴ ابوالحسن علی بن محمد مدائنی م ۲۱۵ھ نے روایت کی ہے: ابوبکر خطیب تھے۔ عمر خطیب تھے۔ عثمان خطیب تھے اور علی ان میں سب سے بڑے خطیب تھے۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۳۵۲

عثمان بن عفان منبر پر چڑھے اور کہا: لوگو اللہ نے تمہارے لئے افریقہ فتح کر دیا ابویحیی عبداللہ بن ابی سرح م سنہ ۳۶ھ (یا ۵۷ھ) نے عبداللہ بن زبیر کے ذریعہ فتح کی اطلاع دی ہے ابن زبیر! اٹھو! خبردو!!

عبداللہ کہتے ہیں میں اٹھا خطبہ دے کر منبر سے اترا تو میرے والد نے فرمایا: لوگو! تم نکاح کرو تو عورتوں کے باپ دادوں اور ان کی بہنوں کے (حسب نسب) لحاظ سے کرو۔ میں نے اس لڑکے کو ابوبکر سے جتنا زیادہ مشابہ پایا اتنا ان کی کسی اولاد کو نہیں پایا۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۴۰۷۔ یہ خبر اسی کتاب کے دوسرے جز کے صفحہ ۵۹ پر اس طرح ہے کہ "میں نے اس لڑکے کو ابوبکر الخ کی نسبت عثمان بن عفانؓ سے کی گئی ہے نہ کہ زبیرؓ سے۔

تنبیہ: عبداللہ کی والدہ اسماء ابوبکر کی لڑکی اور سیدہ عائشہؓ زوج النبی صلعم کی بہن تھیں۔

۶ ابوالحسن علی مداینی م ۲۱۵ھ ابوسعید یحیی بن سعید انصاری م ۱۴۴ھ سے اور وہ معروف بن خربوذ بکری سے اور وہ خالد بن صفوان سے روایت کرتے ہیں کہ:

عبداللہ بن عبداللہ اہتم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان کے پاس حاضر ہوا۔ مجمع عام میں کھڑا ہوا، خطبہ دیا۔ اللہ کی ستائش کی اور کہا:

امابعد۔ ساری اشیاء اللہ ہی نے پیدا کی ہیں حالاں کہ وہ ان کی فرمانبرداری سے بے نیاز اور ان کی نافرمانیوں سے واقف تھا۔

پہلے سارے انسانوں کی منزلیں اور رائیں مختلف تھیں۔ تمدنی وتہذیبی، مادی و معنوی، علمی وفکری حالتیں یکساں نہیں تھیں) اہل عرب تو سب سے زیادہ بُری حالت میں تھے۔ خواہ وہ دیہاتی ہوں یا شہری۔ دنیا کی بھلائیاں اور زندگی میں اس کی راحتیں (زرعی پیداوار وصنعت) دوسرے لوگ جمع کرتے تھے۔ ان میں عربوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ (وہ ان سے محروم تھے) ان کے مردے آگ میں اور ان کے زندے اندھے تھے اس کے ساتھ ایسی بے شمار چیزیں موجود تھیں جن سے رغبت یا نفرت ہوتی ہے (خیر وشر، مفید ومضر، خوب وزشت سب موجود تھے۔)

جب اللہ نے عربوں پر اپنی رحمت پھیلانا اور ان پر اپنی نعمتیں برسانا چاہا تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ یہ جس نقصان میں پڑے ہوئے تھے وہ اس پر نہایت گراں گزرتا تھا۔ وہ ان کی بھلائی کا حریص اور ایمان لانے والوں کے لئے رافت ورحمت برتنے والا تھا۔ مگر اس کی ان سب خوبیوں کے باوجود اس کی قوم نے اس کے جسم کو زخمی کیا۔ اس کے اچھے نام کو بگاڑا۔ حالاں کہ اس کے ساتھ اللہ کی کتاب تھی۔ جو حق بیان کرتی تھی۔ اور اس کے ساتھ اللہ ہی کی دلیل تھی جو سچائی دکھاتی تھی۔ وہ اللہ ہی کے حکم سے چلتے اور اسی کی اجازت سے ٹھہرتے تھے بایں ہمہ عربوں نے رسول کو غار میں بچنے پر مجبور کیا۔

جب اس کو عزم کا حکم دیا گیا تو اللہ کا حکم بجا لانے میں اس کا رنگ خوشی سے چمکنے لگا۔ اللہ نے اپنے رسول کی دعوت کو کامیاب کیا۔ اس کے بول کو بالا کیا۔ اس کی دعوت کو فائز المرام بنایا۔

رسول اللہؐ نے دنیا اس حال میں چھوڑی کہ وہ پاکباز۔ پرہیزگار اور بابرکت تھے اللہ ان سے راضی تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابوبکر، اللہ ان پر رحم فرمائے رسول اللہؐ کے جانشین ہوئے۔ وہ رسول کی سنت پر چلے اور انہیں کا راستہ اختیار کیا۔ اہل عرب دین سے پھر گئے۔ رسولؐ اللہ کے بعد ابوبکر نے ان سے صرف وہی قبول کیا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں ان کی طرف سے آتا تھا (زکات معاف کی نہ اس کے نصاب میں کمی کی)

(فتنۂ ارتداد کو مٹانے کے لئے) ابوبکر نے تلواریں نیاموں سے نکلوائیں۔ آگ کو شعلوں سے بھڑکایا۔ پھر حق کا ساتھ دینے والوں کو لے کر باطل کا ساتھ دینے والوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان کو جو چیزیں جوڑتی تھیں ان کو توڑے اور زمین کو ان کا خون پلائے بغیر بچنت نہیں بیٹھے تا آں کہ ابوبکر نے ان کو از سرِ نو اسی دائرہ میں داخل کیا جس سے وہ نکل گئے تھے۔ اور اسی مرکز پر قائم رکھا جس سے وہ بھاگ گئے تھے۔

ابوبکر نے اللہ کے مال سے ایک اونٹنی لی تھی وہ اس سے اپنا گلا تر رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ایک حبشی عورت تھی۔ یہ ان کے بچے کو دودھ پلاتی تھی۔ مگر وقت وفات یہ بھی ان کے حلق میں پھنس کر گلوگیر ہو گئی۔ اس لئے یہ اونٹنی اور حبشی لونڈی اپنے جانشین کے حوالہ کر دی اور اپنے جانشین کے وسیلہ لوگوں سے خلاصی حاصل کی۔

انہوں نے اپنے دوست رسول اللہؐ کے طریقہ پر دنیا اس حال میں ترک کی کہ وہ پاکباز و پرہیزگار تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔

ابوبکر کے بعد عمر بن الخطاب ان کے جانشین ہوئے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے، عمر نے شہر بسائے۔ شدت کے ساتھ نرمی بھی ملائی۔ آستینیں چڑھائیں پلو اونچا کیا۔ (کرکسی) جو امور پیش آئے ان سے نمٹنے کی مناسبِ حال تدبیر کی اور جنگ کے لئے موزوں آلات مہیا کئے۔

جب مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے ان کو زخمی کیا تو انھوں نے عبداللہ بن عباس سے کہا: لوگوں سے دریافت کیا جائے آیا وہ قاتل کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرسکتے ہیں؟ جب ان سے کہا گیا کہ وہ مغیرہ کا غلام ہے تو انھوں نے لاالہ الا اللہ کہا۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کو کسی ایسے شخص نے نہیں مارا جس کا فئے میں کچھ حق تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا خون حلال ہو جاتا۔ کیوں کہ انھوں نے حق دار کے حق سے کچھ لیا تھا۔ عمر نے اللہ کے مال سے اسی ہزار سے کچھ زائد رقم اپنے اختیار تمیزی سے استعمال کی تھی۔ عمر نے اپنی جائداد ٹکڑے ٹکڑے کرکے فروخت کردی اور اس رقم سے لئے ہوئے مال کی پابجائی ہوگئی۔ عمر کو یہ بات ناپسند تھی کہ یہ جائداد ان کے اہل خانہ اور بچوں کی کفیل ہو۔ اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری اپنے بعد ہونے والے جانشین کے سپرد کردی۔

انھوں نے دنیا اس حالت میں چھوڑی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح پاکباز و پرہیزگار تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔

اللہ کی قسم! عمر کے بعد ہم کسی ایسے شخص پر مجتمع نہیں ہوئے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر ہو۔

عمر! تم دنیا کے بیٹے ہو۔ تمہیں دنیا کے بادشاہوں نے جنا، اس کی چھاتیوں سے دودھ پلایا، توقع ہے کہ تم اس کو وہیں رکھو گے جہاں اللہ نے اس کو رکھا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہارے ذریعہ دنیا کی کدورت صاف کردی اور اس کی مصیبتیں دور کردیں۔ تم اپنا کام کئے جاؤ، دنیا کی طرف توجہ مت کرو کیوں کہ حق اسی کی جگہ یہ کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی۔

میں اپنی یہ بات بیان کررہا ہوں، اللہ میری مغفرت فرمائے، میں اللہ سے مومن مردوں اور عورتوں کے لئے مغفرت طلب کرتا ہوں۔

البیان والتبیین۔ ج ۲ ص ۱۱۷ تا ۱۲۰

ابو حمزہ یحییٰ بن مختار خارجی مکہ میں داخل ہوا۔ وہاں کی مسجد کے منبر پر چڑھا اور خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد وثنا کرنے کے بعد کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آگے پیچھے ہونا اللہ کی اجازت سے یا اللہ کے حکم سے یا اس کی وحی سے ہوتا تھا۔ اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل کی اس میں ان پر واضح کر دیا کہ کیا کرنا چاہیے اور کس سے بچنا چاہیے۔ ان کو اپنے دین میں کسی قسم کا شک تھا اور نہ اپنی نبوۃ میں کوئی شبہ۔ اللہ نے ان کو اس وقت اٹھا لیا جب وہ مسلموں کو اللہ کی اطاعت کرنے کے طریقے سکھا چکے تھے۔ انھوں نے ابوبکر کو صلوٰۃ کا والی بنایا۔ مسلموں نے ان کو اپنی دنیا کا والی اس لئے بنایا کہ رسول اللہؐ نے ان کو ان کے دین کا والی بنایا تھا۔ ابوبکر نے دین سے پھر جانے والوں سے جنگ کی کتاب وسنت پر عمل کیا۔ اور وہ اپنی راہ پر چل پڑے۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔

پھر عمر بن خطاب والی ہوئے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ وہ اپنے ساتھی کی سی سیرت پر رہے۔ کتاب وسنت پر عمل کیا۔ نئے جمع کی۔ عطیے مقرر کئے۔ رمضان میں (تراویح کے لئے) لوگوں کو جمع کیا۔ شراب پینے والوں کو کوڑے لگائے۔ دشمنوں کے شہروں پر چڑھائی کی اور وہ اپنی راہ پر چل پڑے۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔

اس خطبہ میں آگے کہیں ابوبکرؓ یا عمرؓ کا ذکر نہیں آیا۔ اس لئے بعد کا حصہ ترک کر دیا گیا۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۱۲۲ جاری

۷ ابو سعید عبدالرحمان بن مہدی بصری م ۱۹۸ ھ نے سفیان بن سعید ثوری م ۱۶۱ ھ سے وہ ابو ہاشم قاسم بن کثیر ہمدانی سے اور یہ قیس بن سعد خازنی سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے علیؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

رسول اللہ صلعم سب کے آگے تھے آپ کے بعد ابوبکر رہے اور عمر تیسرے پھر فتنہ نے

ہیں بے راہ رو کر دیا۔ جو اللہ کا منشا تھا پورا ہوا۔

جاحظ نے کہا: علیؓ کا قول صرف اتنا ہی ہے کوئی تشریح یا توضیح بالکل نہیں۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۷۹ جاری

ملحوظہ: عرب میں گھڑدوڑ کا رواج تھا۔ رسول اللہ صلعم نے گھڑدوڑ کرائی ہے۔ دوڑ میں گھوڑوں کی تعداد مقرر نہیں ہوتی تھی۔ دس گھوڑوں تک گنتی ہوتی تھی کہ کونسا گھوڑا کس درجہ میں رہا۔ جو سب سے آگے ہوتا اس کو سابق پھر درجہ بدرجہ مصلی مسلی (تین دندانہ دار) تالی، مراتاح، عاطف، حظی، موئل، تسلیم اور دسواں سکیت کہلاتا تھا۔

جاحظ نے باعتبار معنی درج بالا روایت سے ملتی جلتی روایت الحیوان ج ۴ ص ۲۷۶ پر اس طرح نقل کی ہے۔

عامر بن قیس ایک مشہور تابعی گزرے ہیں۔ خلافت معاویہ کے دوران انتقال کیا۔ یہ شام جایا کرتے تھے۔ وہاں ایک مرتبہ گھڑدوڑ ہوئی اس کے فوراً بعد یہ اپنے وطن لوٹے تو کسی نے پوچھا۔ سابق کون آیا؟

عامر: رسول اللہ صلعم

سائل نے پوچھا: اور مصلی

عامر: ابوبکر!

سائل: میں گھوڑے — خیل — کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔

عامر: اور میں خیر کی خبر دے رہا ہوں۔

۸ ابوبکر صدیق کی وفات کے بعد ایک مرتبہ عائشہؓ آپ کی قبر پر آئیں اور کہا: اللہ آپ کا چہرہ روشن رکھے، آپ کی سعی نیک کی تحسین فرمائے۔ دنیا سے روگردانی کرکے آپ نے اس کو بے وقر کر دیا۔ آخرت کا رخ کرکے اس کو باوقر کیا۔

رسول اللہ صلعم کی وفات کے رنج کے بعد سب سے بڑا رنج آپ کی وفات کا ہے۔ آپ

کا ہم سے بچھڑ جانا بڑی مصیبت ہے ۔ اللہ کی کتاب وعدہ کرتی ہے کہ آپ کی وفات پر صبر جمیل
آپ کا اچھا بدل ہوگا ۔ اس سے بڑی تسلی ہوتی ہے ۔
میں آپ کی وفات پر صبر کرتے ہوئے اللہ سے وہ وعدے پورے کرنے کی درخواست
کرتی ہوں جو اس نے آپ سے کئے ۔ اور آپ کے لئے مغفرت طلب کرتے ہوئے دعا کرتی
ہوں کہ وہ میری اس طلب میں اخلاص عطا فرمائے ۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۳۰۲

۹ عبداللہ بن خارجہ بن حبیب اعشی بن ربیعہ کوفی نے ایک قصیدہ کہا تھا اس
میں خلفاء کے نام میں ابتدائی تین مصرعوں کا مطلب ہے :
رسول اللہ صلعم کے بعد آپ کے جوجانشین یکے بعد دیگر ہوئے ، وہ سب کے سب اللہ
سے ڈرنے والے تھے ۔ پہلے صدیق پھر عمر و عثمان وغیرہم ۔

البیان والتبیین ج ۳ ص ۸۶

۱۰ عیسی بن طلحۃ بن عبیداللہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب
م ۶۸ ھ سے پوچھا : ابوبکر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ ابن عباس نے کہا : وہ سراپا خیر
تھے ۔ تیزی (وگرمی) میں بھی اور غضب کی شدت میں بھی ۔
میں نے پوچھا بتایئے عمر کا کیا حال تھا ؟
ابن عباس : ہوشیار پرندہ کی طرح چوکس ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے چاروں طرف
ایک پھندا لگا دیا گیا ہے ۔ وہ روز کا کام روز کر دیا کرتے تھے ۔ جیسے دوڑ میں اپنے گھوڑے
کو سب سے آگے نکالنے کی کوشش کرنے والا ۔ اس پر نرمی نہیں برتتا (کوڑے لگائے
جاتا ہے)

البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۶۶

۱۱ یقطین کی اولاد میں ایک ہنسوڑ جوان تھا ۔ اکثر پیئے رہتا تھا ۔ اس کے کنبہ میں ایسے

لوگ بھی تھے جو ابوبکر، عمر و عثمان وغیرہم کے بارے میں جھگڑتے رہتے تھے۔ اس جوان نے ان کی روز روز کی بحثا بحثی اور خصومت سن کر چند برجستہ اشعار کہے تھے۔ ان کا خلاصہ مطلب یہ ہے:

اللہ ان کو ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ کیا جزا دے گا؟ ہمیں اس کا علم نہیں (ہم کیوں اس جھگڑے میں پڑیں)

ملحوظہ: یہ مضمون سورۃ البقرۃ کی ۱۳۴ ویں اور ۱۴۱ ویں آیت سے مستفاد ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے: وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی۔ تمھاری کمائی تمھارے لئے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

حسان بن ثابت انصاری م ۵۰ ھ نے ابوبکر کا مرثیہ کہا ہے۔ جاحظ نے اس قصیدہ کی صرف چار بیتیں نقل کی ہیں۔ ان کا حاصل کلام یہ ہے:

جب تم نے بھروسہ کے قابل بھائی کا غم مفارقت تازہ کیا ہے تو اپنے بھائی ابوبکر کو ضرور یاد کرو۔ ان کا کارنامہ شاندار ہے۔ وہ قابل تحسین و ستائش ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد انہیں کا درجہ ہے۔ ابوبکر ہی نے سب سے پہلے رسولؐ کی صداقت پر گواہی دی۔ مکہ سے ہجرت کے موقع پر دشمن پہاڑی پر چڑھ کر رسول اللہؐ کی تلاش میں تھے۔ وہاں اونچے غار میں آپ صلعم کے ساتھ صرف ابوبکر تھے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ رسول اللہؐ کے نہایت گہرے دوست تھے۔ رسول اللہؐ سارے انسانوں سے افضل ہیں۔ ان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔

البیان والتبیین ج ۳ ص ۳۶۱ جاری

۱۳ یزید بن حکم بن ابی العاص ثقفی نے سقیفہ بنی سعد کے واقعہ کے متعلق جو تین ابیات کہے ہیں اس کا مطلب ہے:

محمد صلعم کے بعد لوگوں نے جھگڑا کیا۔ جب جھگڑا بڑھ گیا تو کیا ہوا؟ قریش سے

پوچھو (وہ جواب دیں گے) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پوری خلق خدا میں امت کی باگ ڈور آل تیم کے ایک فرد کے ہاتھ میں تھی ؟ - جب امت کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا اور لوگ بے راہ ہو گئے تو اللہ نے ان گمراہوں کو حق کی ہدایت ابوبکر صدیق ہی کے ذریعہ کی -

البیان والتبیین ج ۳ ص ۳۶۲

ملحوظہ : ابوبکر کا تعلق قریش کے قبیلہ تمیم سے تھا ۔ سلسلہ نسب یوں ہے :

ابوبکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لوئی -

۱۴ مسلم بطین سے ابو جحاف نے روایت جن تین بیتوں میں کی ہے ان کا مطلب ہے :

ہم اس گروہ کو سزا دیں گے جو بہتان باندھتے اور ابوبکر صدیق سے بے زار ہیں ۔ نادانی کی وجہ سے یہ اپنے نبی کے وزیر سے بے زار ہیں ۔ برا ہو ان کا جو فاروق سے بے زار ہیں ۔ میں تو دشمنوں کے باوجود ہانکے پکارے یہ کہنے والے لوگوں میں ہوں : ہم نے صادقِ مصدق کا دین اختیار کیا ۔

البیان والتبیین ج ۳ ص ۳۶۴ جاری

۱۵ قریش ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیام گاہ پر دو خصوصیتوں کی وجہ سے جمع ہوتے تھے ۔ علم اور تناول طعام

جب ابوبکر نے اسلام قبول کیا تو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اکثر لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا

البیان والتبیین ج ۴ ص ۷۶

۱۶ مجاعۃ بن مُرارۃ صحابی نے ابوبکر سے کہا :

اگر رائے ایسے شخص کے یہاں ہو جس کی سنی نہ جائے (جس کی رائے پر

عمل نہ کیا جائے)

ہتیار ایسے شخص کے یہاں ہوں جنہیں وہ استعمال نہیں کرتا (یا نہیں کر سکتا)

اور مال ایسے شخص کے یہاں ہو جو اسے خرچ نہیں کرتا۔

تو پھر (معاشرہ کے) سارے ہی معاملات یقیناً بگڑ جائیں گے۔

البیان والتبیین ج ۴ ص ۹۰

ابو عمران ابراہیم بن یزید نخعی م ۹۶ ھ کہتے ہیں کہ تابعین و صحابہ قرآن کے اعرابی اختلاف کے بارے میں یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ عبداللہ کی قرأۃ ہے یا یہ سالم یا اُبی یا زید کی۔

یہ لوگ سنت ابی بکر و عمر کہنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ "سنت اللہ و سنت رسول اللہؐ" ہی کہتے تھے۔

قرأت کے بارے میں یوں کہتے کہ فلاں نے یوں پڑھا اور فلاں نے یوں۔

الحیوان ج ۱ ص ۳۳۶

اسلامی حدود کی حکمت

(از مولانا حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ، البیضا ء لیبیا)

اسلامی نظام اور قانون شریعت سارے اسلامی ممالک میں اپنی پوری دفعات کے ساتھ عبادات و اجتماعیات و اخلاقیات سے لے کر قصاص و حدود تک سینکڑوں برس تک جاری رہا، اور اس میں جزوی تبدیلی کی ابتدا سامراج کے زمانے میں سامراجی سازشوں اور مسیحی تبشیری حکومتوں کے زیر سایہ ہوئی تھی اور بدقسمتی سے سب سے پہلے قانون حدود ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں ختم ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی یعنی ۱۷۹۱ء تک قانون شریعت لاگو تھا اور مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا، لیکن اس کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً وضعی قوانین نافذ کرنے شروع کئے اور انیسویں صدی کے وسط تک قانون شریعت ختم کر دیا گیا، مصر میں بھی سامراجی سازشوں سے ۱۸۸۳ء میں قانونی نظام، فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا، بیسویں صدی میں البانیا اور ترکی نے پوری جرات و بے باکی اور دھاندلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ وہ لادینی حکومتیں ہیں اور سارے قوانین حتی کہ پرسنل لا تک اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس کے قوانین کے ماتحت بنا دیے گئے۔[1]

۱۔ مولانا مودودی کی عربی کتاب "نظریۃ الاسلام وہدیہ" سے ماخوذ باختصار، حاشیہ صفحہ ۱۳۸ - ۱۳۹، یہ کتاب قانون اسلامی سے متعلق مولانا کے چھ مقالات و لکچرز پر مشتمل ہے، دار الفکر بیروت و دمشق سے چھپی ہے۔

مسلم پرسنل لا تبدیلی سے محفوظ رہا

سامراجی دور میں غیر ملکی حکام نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کو ہاتھ نہیں لگایا تھا بلکہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق بنائے گئے تھے اور علمائے اسلام کے مشورے سے بنائے گئے تھے، اور اسی طرح کسی جگہ بھی ان میں تغیر کرنے کی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی تھی، البانیا اور ٹرکی کے لئے شرم وعار کا مقام تھا کہ جو کام سامراجی اور غیر مسلم حکومتیں نہ کر سکیں دیدہ و دلیری کے ساتھ وہ کام انھوں نے انجام دیا، ان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں پرسنل لا کے احکام اسلامی شریعت کے مطابق آج تک نافذ ہیں، گو بعض اوقات ان میں جزوی تبدیلی کی ناکام کوششیں بعض نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ہوتی رہتی تھیں، بہر حال یہ ناکام کوششیں، یا کسی مقام پر کوئی جزوی تبدیلی بھی مسلم ممالک کے لئے شرم وعار کا سامان ہے کہ یہ وہ کام ہے جس کی جرأت سامراج بھی نہ کر سکا تھا، اور اس قسم کی ساری کوششیں غیر فطری، غیر عقلی، غیر آئینی اور غیر شرعی ہیں جو نہ خود صحیح ہو سکتی ہیں اور نہ کسی دوسرے کے لئے حجت ہو سکتی ہیں[1] اور ان کا انجام یہ ہے کہ وہ عنقریب ناکامی ہی کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔

عظیم سامراجی سازش اور اس کا مقصد

جیسا کہ بیان کر چکا، اسلامی قانون (پرسنل لا کو چھوڑ کر) کا خاتمہ اسلامی ممالک میں تبشیری اداروں اور حکومتوں کے زیر سایہ ہوا تھا، جب سامراجی ریشہ دوانیاں عروج پر تھیں، لیکن سیاسی طور پر، اور بین الاقوامی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب، اور فطرت کے قانون اقتدار وعروج وزوال کے پیش نظر جب مغربی حکمرانوں کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کو اسلامی ملکوں سے واپس نہ جانا پڑے تو انھوں نے اپنے فکری سامراج کو تادیر باقی رکھنے کے قدیم منصوبہ میں از سر نو جان ڈال دی وہ اسلام میں دوبارہ زندہ ہو کر

۱۔ یہ کیوں غیر قانونی ہیں اور کسی کے لئے حجت نہیں بن سکتے، اس کی تفصیل راقم نے ایک مضمون میں کی ہے جس کا عنوان ہے "مسلم پرسنل لا سے متعلق دو سوالوں کے جوابات" جو برہان ماہ جون سنہ۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔

پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ساری دنیا پر پھر سے چھا جانے کی فطری صلاحیت کے خلاف زبردست بند باندھنا چاہتے تھے اور "ایوان کسریٰ" سے زیادہ پرشکوہ پایۂ تخت اور "فصیل قسطنطنیہ" سے زیادہ مضبوط ڈیفنس پوزیشن بنانا چاہتے تھے۔

اس کے پیش نظر سامراجی حکمرانوں نے بڑی طویل اسکیم اور کاوش کے ذریعہ، انتہائی چابک دستی اور کوئنین میں شکر لپیٹنے والی پالیسی کے ساتھ اسلامی اقدار کو بدلنے کا پلان بنایا، اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم، عدالتوں اور تمام زندگی کے شعبوں میں لادینی نظام کی سرپرستی کی، لیکن ساتھ ہی تبشیری انداز کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور تھوڑی ہی مدت میں ایسے ہونہار اور فاضل سپوت پیدا ہو گئے جن کے نام اسلامی ضرور تھے لیکن انھوں نے اسلامی قانون اور نظام کے خلاف وہ کام سرانجام دیئے جو غیر مسلم بھی نہیں دے سکتے تھے، اس سلسلے میں اسلامی عقائد میں تشکیک، مسلم الثبوت نظریات میں اشتباہ اسلام کے قانون فوجداری پر ظلم کا اعتراض، قانون حدود پر وحشیت و بربریت کا الزام اور عائلی قوانین پر رجعیت کا فتویٰ وغیرہ جیسی تمام غیرعلمی کوششیں علم و ریسرچ کے نام پر شامل ہیں، اور ان ساری سامراجی کوششوں کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ لادینیت کا جذبہ نہ تھا بلکہ وہ صلیبیت تھی جس نے دوسرا رنگ اختیار کرنا چاہا تھا اور علمی روپ میں نمودار ہوئی تھی، اور یہودی و مسیحی اختلافات کے باوجود یہودیت وصہیونیت نے بھی مسیحیت کے دوش بدوش اسلامی ریسرچ کے نام پر اسلامی تعلیمات کو غبار آلود بنانے کی ہر ممکن سعی کی، ان تمام مساعی کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان اپنے دین اور اقدار و افکار و عقائد و نظریات کے بارے میں مشکوک ہو جائیں اور اس طرح شاید وہ مسیحیت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائیں، اور یہ خواہش کوئی نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے، حضور نامدارؐ سے خطاب الٰہی یوں ہے: "لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" ترجمہ: "ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے یہود و نصاریٰ یہاں تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی کرو" اس کے جواب میں ذات باری تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہدایت

تو صرف اسلام کے زیر سایہ ہے، اور رحمت الٰہی اور خدا کی بخشی ہوئی نبوت وعصمت کی وجہ سے یہ ناممکن ہے لیکن فرض کرو کہ رسول بھی اگر ہدایت الٰہی اور اسلام کی دولت سے معمور ہونے کے بعد یہود ونصاریٰ کی تحریفات واہواء کا تبع ہو جائے تو دنیا میں بے یار و مددگار اور آخر میں نامراد ہو جائے گا، اس صورت میں اے اہل اسلام خوب کان کھول کر سن لو کہ سامراجی، صلیبی، تبشیری، صہیونی، اور اسی طرح سے وہ جو دین کا علم نہیں رکھتے كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (بقرہ۔ ۱۱۳) یعنی سورج پرست، ستارہ پرست، پتھر پرست، نیچر پرست، عقل پرست، اور وہ جو کسی چیز کی پرستش کو بھی صحیح نہیں مانتے، یعنی تمام طاغوتی اور باطل تنظیموں کی متحدہ خواہش اور متحدہ کوششیں یہی ہیں کہ اسلام کے چراغ کو گل کر دیا جائے، وہ اپنے تمام آپس کے شدید اختلافات کو بھلا کر اسلامی عداوت کے اصول پر متحد ہو گئے ہیں، لیکن مسلمان کے لئے کسی بھی صورت میں ان خواہشات باطلہ اور اہوائے طاغوتیہ کی پیروی کرنے کی اجازت نہیں، اس کو اس کی ممانعت اور ساتھ ہی حکم.... اور احقیتِ اسلام کا بیان اس آیت پاک میں دیا گیا ہے قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (بقرہ۔ ۱۲۰) ترجمہ: کہدو بیشک اللہ کی ہدایت وہ ہدایت کی راہ (اسلام[۱]) ہے، اور (فرض کرو کہ تم) اگر ان کی خواہشات کی اتباع کرو[۲] اس کے بعد جو تمہارے پاس علم (وحی اور اسلام) آچکا ہے، تو نہ ہوگا تمہارے

(۱و۲) یہاں اس آیت کی مختصر تشریح ضروری ہے، رسول خدا ساری انسانیت کو ہدایت خداوندی سے سرشار کرنا چاہتے تھے، آپ کا منصب تبلیغ وختم نبوت ورسالت بھی اس کا مقتضی تھا، کفار قریش اور یہود ونصاریٰ سب کے لئے آپ کی عالمی دعوت وہدایت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، یہود ونصاریٰ کا پندار یہ تھا کہ ہر گروہ اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا اور محبوب کہتا تھا اور جنت کا اکیلا مستحق، اس کا جواب اللہ نے بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ (بقرہ۔ ۱۱۲) میں یہ دیا کہ جو اللہ کی کلی رضا کا تابع وطالب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لئے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار۔"

علماء و مفکرینِ اسلام کا جہاد اور اس کے اثرات | اہوائے باطلہ سننے اور تحکیم کتاب کے مطالبے کو منوانے کے لئے سامراجی دور ہی سے اہلِ علم و فکر نے کوششیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوا وہ جنت کا مستحق ہوگا، پھر حضور انور اور آپ کی امت کو ایک خاص بات یہ
بتانی مقصود ہے کہ ہدایتِ الٰہی اور حق کی تلاش کرنے والا یہود و نصاریٰ کا وہ گروہ جو اخلاص وصداقت کے
ساتھ کتب الٰہیہ کا مطالعہ کرتا ہے وہ حضورؐ سے متعلق پیشین گوئیوں اور اسلام کی صداقت وحقانیت پر
ایمان لے آتا ہے (بقرہ - ۱۲۱) لیکن عامۃ الیہود والنصاریٰ کا شعار یہ ہے کہ وہ آپ کے دین میں
داخل ہونے کے بجائے الٹے آپ کو اپنی اہوار یعنی یہودیت ونصرانیت کی محرفانہ اور بگڑی ہوئی شکل میں
داخل کرنے کے درپے رہتے ہیں، اور جن اشیاء کو منسوخ کرنے آپ آئے تھے انہیں کی طرف آپ
کو بلانے لگتے ہیں، اور یہودیت ونصرانیت کیونکہ دو متضاد، مختلف اور محرف دین ہیں اس لیے دونوں
گروہ اپنی اپنی خواہشات کی طرف بلاتے ہیں لیکن آپ فرد واحد ہونے کی وجہ سے عقلاً بیک وقت
یہودی اور نصرانی ہو ہی نہیں سکتے اور اس لیے یہ دونوں گروہ آپ سے کسی طرح راضی ہو ہی
نہیں سکتے، اور شرعاً کیونکہ آپ کو رحمت الٰہی رسالت ونبوت کی شکل میں، اور فضل الٰہی وحی اور قرآن
کی شکل میں، اور نعمت الٰہی عصمت وطہارت کی شکل میں ملی ہوئی ہے، اس لئے آپ ان کی اہوار
وخواہشات کی پیروی بھی نہیں کرسکتے۔ اس تمہید کے بعد دونوں حاشیوں پر مختصر گفتگو کروں گا،
تفصیل کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائے گی۔

ہدیٰ سے مراد اسلام تمام مفسرین کی رائے کے مطابق ہے، اور آیت کے الفاظ سے بھی
ظاہر ہے یہود و نصاریٰ کی اہوار اور ملت کے مقابلے میں جس ہدایت الٰہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور
جس طرح حصر کے ساتھ اور دوسرے ہدیٰ میں تعریف، الف لام کے ساتھ، اس سے واضح طور پر
اسلام ہی مراد ہے کہ وہی کلی ہدایت کی راہ ہے اور جس کی طرف یہ لوگ آپ کو بلاتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شروع کردی تھیں، سامراج کے خاتمہ کے بعد بھی مشکلات کے زیر سایہ بلکہ یوں کہیے کہ زندان و سلاسل کے اندر اور تلواروں اور پھانسیوں کی چھاؤں میں شریعت اسلامیہ، قانون اسلامی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ ہدیٰ نہیں بلکہ ہویٰ کی راہ ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (قصص - ۵۰) صرف مفسر طبری نے ہدیٰ کا مفہوم اس طرح لکھا ہے: "ان بیان اللہ ھو البیان المقنع والقضاء الفیصل بیننا فھلموا الی کتاب اللہ وبیانہ، الذی بین فیہ لعبادہ ما اختلفوا فیہ، وھو التوراۃ التی تقرون جمیعا بانھا من اللہ یتضح لکم فیھا المحق منا من المبطل وایّنا اھل الجنۃ وایّنا اھل النار وایّنا علی الصواب وایّنا علی الخطاء؟ وانما امر اللہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یدعوھم الی ھدی اللہ وبیانہ، لان فیہ تکذیب الیھود والنصاری فیما قالوا من ان الجنۃ لا یدخلھا الا من کان ھودا او نصاری، وبیان امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وان المکذب بہ من اھل النار دون المصدق بہ" ترجمہ: "بیشک اللہ کا بیان ہی قائل کرنے والا ہے، اور فیصلہ کن ہے ہمارے درمیان، پس آؤ اللہ کی کتاب اور اس کے بیان کی طرف، جس میں اس نے بندوں کے لئے مختلف فیہ چیزیں بیان کردی ہیں، اور وہ توراہ ہے جس کے تم سب مقر ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس میں تمہارے لئے واضح ہو جائے گا کہ ہم میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون، اور کون جنت والا ہے اور کون دوزخ والا، اور کون صحیح راہ پر ہے اور کون غلطی پر؟ اور بیشک اللہ نے اپنے نبی ؐ کو یہ حکم دیا کہ ان کو ہدایت وبیان الٰہی کی طرف بلائیں، کیونکہ اس میں یہود ونصاری کی تکذیب تھی اس قول میں جو انھوں نے کہا تھا کہ یہود ونصاری کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا، اور محمدؐ کے معاملے کا بیان تھا اور یہ کہ اس کو جھٹلانے والا آگ کا مستحق ہے نہ کہ اس کی تصدیق کرنے والا" طبری کا قول اپنے معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ غیر محرف اور منزل من اللہ توراہ ہدایت کی کتاب تھی، لیکن مذکورہ بالا آیت کی تفسیر وتشریح کے اعتبار سے یہ قول مرجوح ہے، طبری کا یہ استدلال کہ یہود ونصاری کے قول (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت پر حکومت کی بنیاد قائم کرنے کا پودا سیراب ہوتا رہا اور الحمدللہ اب بہت جلد وہ وقت آگیا ہے جب ساری دنیا کے مسلمان اسلامی قانون اور اسلامی نظام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى کا یہاں جواب ہے قرین قیاس نہیں، کیونکہ اس کا جواب خدائے پاک نے فوراً ہی اس آیت کے بعد اس طرح دیدیا تھا، بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (بقرہ ۱۱۱-۱۱۲) دوسری بات یہ کہ جس ہدایت الٰہی کا تذکرہ اس آیت میں ہے اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو حضورؐ کو دی گئی تھی اور آپ کے پاس موجود تھی اور وہ قرآن واسلام ہے، کیوں کہ غیر محرف توراہ کا کوئی نسخہ حضورؐ کے پاس موجود نہ تھا بلکہ آپ کی شریعت ساری شریعتوں کی ناسخ بن کر آئی تھی، تیسری بات یہ کہ آیت کے آخر میں جس علم الٰہی کے حضورؐ کے پاس آجانے کا تذکرہ ہے اس سے مراد قرآن پاک، وحی اور اسلام ہی ہے، لیکن طبری کے قول سے بھی اہل اہواء کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ان پر مزید حجت قائم ہوتی ہے اور یہ حجت قرآن نے بار بار دوسری آیات میں قائم کی ہے اور اہل کتاب کو توراہ کی تحکیم کی دعوت دی ہے۔ لیکن آیت کے صاف اور راجح معنی وہی ہیں جو تمام مفسرین نے اختیار کئے ہیں، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: وھدی اللہ تعالی الذی ھو الاسلام ھو الھدی ترجمہ: خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی اصل ہدایت ہے۔ صاحب بحر المحیط ابن حیان اندلسی لکھتے ہیں: ھدی اللہ، ای الذی ھو مضاف الی اللہ، وھو الاسلام الذی انت علیہ ھو الھدی النافع التام الذی لاھدی وراءہ ترجمہ: اللہ کی ہدایت یعنی وہ ہدایت جس کی اضافت (نسبت) اللہ کی طرف ہے وہ اسلام ہے جس پر آپ ہیں؛ وہی اصل اور مکمل نفع پہنچانے والی ہدایت ہے جس کے علاوہ کوئی ہدایت نہیں۔ مفسر رازی کا بیان ہے: ان ھدی اللہ ھو الذی یھدی الی الاسلام وھو الھدی الحق الذی یصلح ان یسمی ھدی بیشک اللہ کی ہدایت وہی ہے جو اسلام کی طرف ہدایت کرتی ہے اور وہی حقیقتاً وہ ہدایت ہے جس کو ہدایت کہا جاسکتا ہے۔ ابوسعود کہتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حیات کو دوبارہ نافذ اور جاری کرنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں، جنوب شرق ایشیا سے لیکر
شمال افریقہ تک زندگی کی ایک نئی لہر نمودار ہے اور جذب وشوق میں ڈوبی ہوئی اسلامی اقدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان ھدی اللہ الذی ھو الاسلام ھو الحق ترجمہ: بیشک خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی حق ہے۔ ابن کثیر کا قول ہے: قل یا محمد ان ھدی اللہ الذی بعثنی بہ ھو الھدی یعنی الدین المستقیم الصحیح الکامل الشامل ترجمہ: کہدیں اے محمد بیشک وہ اللہ کی ہدایت جو لیکر اس نے مجھے بھیجا ہے وہی حقیقی ہدایت ہے، یعنی مستقیم، کامل صحیح اور ہر خیر پر شامل ہے۔ علامہ ابو عبداللہ القرطبی کا ارشاد ہے ما انت علیہ یا محمد من ھدی اللہ الحق الذی یضعہ فی قلب من یشاء ھو الھدی الحقیقی، لا ما یدعیہ ھؤلاء جس ہدایت حقہ پر اللہ کی طرف سے تم ہو اے محمدؐ، جس کو اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈالتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کی طرف یہ لوگ بلاتے ہیں۔

دوسرا حاشیہ یہ ہے کہ بفرض تم ان کی اہواء کی پیروی کرو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کا خطاب کبھی حضورؐ سے ہوتا ہے لیکن مراد میں کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی ہے اور تین توجیہیں ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ خطاب آپ سے ہے لیکن امت کو تنبیہ کرنی مقصود ہے، دوسری یہ کہ خطاب ہی امت سے ہے، تیسری یہ کہ اسلام اور ہدایت الہیٰ کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں بلکہ مستحیل ہے، لیکن بفرض محال ایسا ہو جائے تو ولایت ونصرت سے محرومی ہو جائے، لیکن کیونکہ رسولؐ کے لئے یہ عقلاً وشرعاً مستبعد ومستحیل ہے، اس لیے امت کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں وہ اس مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ ان تینوں معانی کی مختصر سند صرف تین مفسرین کرام کے اقوال سے پیش کرتا ہوں۔ ابن حیان لکھتے ہیں، والظاھر ان قولہ تعالیٰ ولن ترضی خطاب للنبیؐ علق رضاھم عنہ بامر مستحیل الوقوع منہ وھو اتباع ملتھم والمعلق بالمستحیل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی محافظ فوج ظفر موج، عزم عمل، زبان وقلم اور قانون کے ذریعے اتر آئی ہے اور محض اللہ کے فضل وکرم اور مخلصین ومومنین ومفکرین کے مسلسل اور منظم اور تعمیری جہاد بالقلم والنفس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مستحیل، وقیل ھو خطاب لہ وھو تادیب لامتہ، وقیل ھو خطاب لہ والمراد امتہ، ترجمہ: ظاہر یہی ہے کہ لن ترضی میں خطاب حضور ﷺ سے ہے۔ آپ سے ان کی رضامندی ایک ایسے معاملے پر معلق کی گئی ہے جس کا واقع ہونا آپ سے مستحیل ہے، یعنی ان کی ملت کی اتباع، اور مستحیل چیز پر جو چیز معلق کی جائے وہ بھی مستحیل ہوتی ہے۔ محمود آلوسی بغدادی قول الٰہی "مالك من الله من ولی" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں والخطاب ایضا للرسول اللہ وتقیید الشرط بماقیدللدلالة علی ان متابعة اھوائھم محال لانہ خلاف ماعلم صحتہ فلو فرض وقوعہ کما یفرض المحال لم یکن لہ ولی ولا نصیر ترجمہ: خطاب رسول خدا ﷺ کی طرف ہے اور شرط کو مقید یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا کہ ان کی خواہشات کی پیروی آپ کے لئے محال تھی، کیونکہ یہ اس کے خلاف ہے جس کی صحت کا علم (قطعی) ہے، پس اگر بفرض یہ واقع ہو جائے جیسے کہ مستحیل مفروضہ واقع ہو جائے تو کوئی ولی اور نصیر نہ ہوگا۔ ابن کثیر کا قول ہے فیہ تھدید و وعید شدید للأمة عن اتباع طرائق الیھود والنصاری بعد ما علموا من القرآن و السنة عیاذاً باللہ من ذلك فان الخطاب مع الرسول والامر لامتہ ترجمہ: اس میں سخت تہدید اور شدید وعید ہے امت کے لئے کہ یہود ونصاری کے طریقوں کی پیروی کریں قرآن وسنت کا علم جاننے کے بعد، اللہ اس بات سے پناہ میں رکھے، یہ خطاب اس طرح رسول ﷺ کو ہے لیکن حکم امت کو ہے۔

علم سے مراد وحی، اسلام اور قرآن مفسرین نے بیان کیے ہیں، اور سب در اصل ایک ہی معنی میں ہیں، امام احمد بن حنبل رح نے قرآن کو مخلوق کہنے والے کے حق میں کفر کا فتویٰ اسی آیت سے دیا تھا، فرمایا تھا "قرآن علم الٰہی ہے مخلوق نہیں" (تفسیر قرطبی)

اس آیت کی مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام ہی راہ ہدایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی وجہ سے ، اور عامۃ المسلمین میں بحمدہ تعالیٰ دینی بیداری کے سبب سے آج یہ انکار اہلِ حکومت وقانون تک پہنچ گئی ہیں اور ایک نئی سحر بیدار ہونے کے لئے بطنِ گیتی میں کروٹیں لے رہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے اور قیامت تک ساری انسانیت اس کے دامن میں سکون پا سکتی ہے ، اور جو اہلِ کتاب حق وانصاف کے طریقوں پر سوچتے ہیں ، ہدایت دل کے بند دروازوں کو ان کے لئے دستک دیتی ہے اور وہ اسلام کے نور سے منور ہو جاتے ہیں ، اور اہلِ کتاب میں سے جو بھی اس دائمی نور وہدایت کو قبول کرتا ہے اس کی جھولی رحمت ومرحمت کے دو خزانوں سے بھرپور طور پر معمور ہو جاتی ہے اتقوا اللہ وآمنوا برسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ ویجعل لکم نورا تمشون بہ ویغفر لکم واللہ غفور رحیم لئلا یعلم اہل الکتب الا یقدرون علی شئ من فضل اللہ (حدید۔ ۲۸-۲۹) "اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تو دے گا تم کو رحمت کے دو حصے اور تمہارے لئے روشنی بنا دے گا کہ اس پر تم چلو ، اور تمہیں بخش دے گا ، اللہ غفور ورحیم ہے ، تاکہ اہلِ کتاب یہ نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کا فضل حاصل کرنے پر قادر ہی نہیں ہیں ، اور جو بھی کتاب کو حق تلاوت ادا کر کے پڑھے گا اور تعصب سے دور ہو کر سوچے گا اس پر حق واضح ہو جائے گا" یتلونہ حق تلاوتہ اولئک یؤمنون بہ (بقرہ ۔ ۱۲۱) اور وہ زندگی کی اندھیری والی راہوں کو چھوڑ کر شش جہت روشنی والی مستقیم شاہراہ پر چل کھڑا ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ خالق دو عالم نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو جس عظیم خطرے سے پہلے دن سے واقف بنایا تھا وہ اپنی نادانی اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کو بھول گئے ، اور یہود ونصاریٰ کی بین الاقوامی سازشوں اور مکر وفریب نے سامراجی دور میں اور اس کے بعد بھی اسلامی شریعت ، اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ حیات پر نت نئے ناموں سے اعتراض کیے ، انھوں نے نئے نئے نعرے ایجاد کئے ، زمین ، زبان ، ترقی وتمدن ، ریسرچ وغیرہ لیکن ان سب کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا اور کام کر رہا ہے وہ اسلام دشمنی ہے ، اور دو ہزار سالہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس سلسلے کی ایک عظیم کوشش لیبیا کی ایک عظیم قوم بھی اپنی نوجوان مسلم قیادت کے زیر اثر کر رہی ہے، اس کی کچھ تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اختلافات اور عظیم اختلافات جن کی رو سے حضرت مریم و عیسیٰؑ پر فحش بہتان تک یہود لگاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پوپ کی طرف سے تکریم کے مستحق ہیں اور بڑی حکومتوں کی طرف سے نوازشات کے قابل، اور ان کے تمام اختلافات اسلام دشمنی کے متحد محاذ پر ختم ہو گئے ہیں اور نام بدل بدل کر ان کی جو اسکیمیں اور پلان ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ وہ اس عالمی دعوت الٰہی کو چھوڑ دے اور اسلام سے دستبردار ہو کر یہودیت یا نصرانیت کو قبول کر لے۔ یہ حاشیہ اس بیان الٰہی پر ختم کرتا ہوں جس میں امت اسلامیہ کو دعوت الٰہی کا حکم بھی دیا ہے اور یہود و نصاریٰ کے دعوائے ایمان کا ابطلان بھی کیا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعوے کی بھی قلعی کھولی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے اور انسانیت کے سامنے اسلام کے حقیقی معنی اس طرح سمجھائے ہیں کہ اسلام خدا کی اطاعت و عبادت، توحید اور تمام انبیاء و کتب پر ایمان کا نام ہے اور اس مکمل اسلام پر ایمان لائے بغیر اسلام و ہدایت کا دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ فیصلہ کن آیت ملاحظہ ہو وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا، قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (البقرہ۔ ۱۳۶ - ۱۳۹) ترجمہ: اور انھوں نے کہا (یہود نے کہا) کہ تم یہودی ہو جاؤ (اور نصاریٰ نے کہا) تم نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پا جاؤ گے، کہدیں (نہیں، بلکہ (اتباع کرتے ہیں ہم) ملت ابراہیمی کی، جو صرف خدا کی طرف متوجہ بندہ تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسلامی اقدار کے احیا میں دینی مدارس کا کردار

اسلامی اقدار کی بیداری اور اس نئے عزم کے سلسلے میں یہ حقیقت بیان کرنی ضروری ہے کہ جس طرح اسلامی تنظیمات نے جوش اور اسلام کے لئے اخلاص پیدا کیا اسی طرح دینی اداروں اور تعلیم گاہوں نے اور خصوصیت کے ساتھ جامعہ ازہر نے اس سلسلے میں ایک تاریخی کام کیا ہے، وہ یہ کہ سامراج کے دور میں بار بار دینی تعلیم کو ختم کرنے یا بے اثر کرنے کی تحریکیں تجدید وغیرہ کے نام پر اٹھیں اور یہ اعتراض بھی اکثر مسلمانوں کے ذہن میں آنے لگے کہ فقہ اسلامی کے وہ ابواب جن پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے جیسے کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود وغیرہ وہ کیوں پڑھائے جاتے ہیں؟ اگر بات یہاں تک ہوتی اور اخلاص کے ساتھ ہوتی کہ دینی تعلیم کے اسلوب کو بدلا جائے اور زمانہ سے جتنا ممکن ہو ہم آہنگ کیا جائے، ریسرچ و ابحاث کا دروازہ کھولا جائے، مقارنہ ادیان اور زندہ زبانوں کی تعلیم دی جائے . اجتہاد کی کوشش کی جائے، عوام کے لئے تو تقلید ضروری ہے لیکن مجتہد کے شرائط اہل علم میں پیدا کئے جائیں تاکہ وہ مسائل حاضرہ کے اسلامی حلول کتاب وسنت، اجماع وقیاس اور اجتہاد کے ذریعہ کریں، جامعہ ازہر نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور مشرکین میں سے نہیں تھا، (اے مسلمانو) تم کہو، ایمان لائے ہم اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا، جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا، اور جو دیا گیا موسیٰ وعیسیٰ کو، جو بھی دیا گیا سارے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ہم ان سے کسی میں (ایمان میں) فرق نہیں کرتے، اور ہم اس کے حکم بردار ہیں، پس اگر ایمان لائیں وہ ایسا ایمان جیسا کہ تم لائے تو وہ ہدایت یافتہ ہوئے اور اگر روگردانی کریں تو وہ اختلاف (اور ضد) پر ہیں، پس اللہ (ان کے مقابلے میں) تمہارے لئے کافی ہو جائے گا اور وہ سمیع وعلیم ہے، (ہم اللہ کے) رنگ (دین) میں رنگ گئے ہیں، اور اللہ کے دین سے بڑھکر اور کونسا دین ہے، اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔

ان میں سے اکثر مطالبوں کو پورا بھی کیا ہے، یہ مطالبے نہ صرف یہ کہ جب ضروری تھے بلکہ اب
بھی برصغیر کے دینی مدارس کے فرسودہ نظام تعلیم وتربیت ونصاب اور طور طریقوں میں تبدیلی
اور اصلاح کی ضرورت ہے اور اگر اخلاص کے ساتھ، انانیت اور خود پسندی کے جذبہ ہائے غیر اصلاحی کو
پس پشت ڈال کر یہ کام علماء ومفکرین اسلام، اسلامی خطوط پر کریں تو بہت آسانی سے دینی
تعلیم کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی دینی وفکری ضروریات کے مطابق
ڈھالا جاسکتا ہے اور جگہ جگہ دینی مدرسوں اور مختلف نصابوں کے بجائے ایک ہی متحد نصاب
کے ماتحت دینی تعلیم پروان چڑھ سکتی ہے اور اس کا انتظام وانصرام کسی بھی فرد واحد کے ہاتھ
میں نہ ہو کہ فرد واحد اگرچہ عالم وفاضل اور صوفی وبزرگ ہو اس میں مطلق العنانی اور ڈکٹیٹر
شپی کی خواہش نفس ابھرنے کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں، بلکہ بین الملکی علماء کی ایک
مجلس ہو جو ملک کے سارے دینی مدارس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرے، یہ مجلس مخلص ہو، خدا
کے سوا کسی سے نہ ڈرتی ہو، حق کی گواہ ہو اور اس بات کی نگہداشت کرے کہ کوئی مدرسہ اپنے اصولوں
سے منحرف نہ ہو، اور افراد کی دوستی، شہرت اور پروپگنڈہ اس مجلس کے لئے معیار نہ ہو بلکہ
میزان حق ہو، اس طرح دینی مدارس ایک عظیم کردار ادا کر سکتے ہیں (بہرحال دینی تعلیم اور دینی مدارس
کی اصلاح کا موضوع بہت طویل ہے کسی دوسرے موقع پر اسے چھیڑا جاسکتا ہے) بات یہ چل رہی
تھی کہ اصلاح کا مطالبہ تو صحیح ہوسکتا تھا، لیکن یہ بات بالکل غلط تھی کہ اسلامی تعلیمات کے اصولی
اور کلی اجزاء اس لئے چھوڑ دیئے جائیں کہ ملک میں رائج نہیں ہیں اور کتاب الٰہی کے وہ فقہی احکام
جن کا رواج ونفاذ سامراج نے ختم کیا تھا اسلامی مدرسے اس کی تعلیم بھی ختم کر دیتے، یہ مطالبے
نہیں مانے گئے اور نہ ان اعتراضات کی پرواہ کی گئی، دنیا جہان کے دینی مدارس کا یہ کارنامہ
ہے کہ انھوں نے فقہ اسلامی وشریعت اسلامیہ کے وہ ابواب اور مسائل بھی ہمیشہ پڑھائے
جو وقتی طور پر نافذ نہ تھے لیکن جن کے نافذ ہونے کی مستقبل میں امید تھی اور جن کے پڑھائے بغیر
شریعت کاملہ کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، خصوصیت کے ساتھ جامعہ ازہر نے ہمیشہ مذاہب اربعہ کی

فقہ تحقیق وتفصیل کے ساتھ پڑھائی ، تعصب اور دلائل کو زبردستی ٹھونسنے کی ضرورت اس لئے پیش نہ آئی کہ ایک ہی جگہ پر الگ الگ ہر مذہب فقہ کے طالب علم کے لئے اس کی فقہ پڑھنی ممکن ہے ، دوسرے مذاہب کے مراجع اور علماء اسے دستیاب ہوسکتے ہیں اور مقارنہ و موازنہ کے ساتھ استنتاج واستنباط کی صلاحیت اس میں پیدا ہوسکتی ہے تو پھر اسے تعصب کی کیا ضرورت ہے ؟ بہرحال ان مذاہب اربعہ کی تعلیم اور موازنے کے باب میں دوسرے مذاہب فقہیہ کی بھی تعلیم جامعہ ازہر کا کارنامہ تھا اور ہے ، ان فقہ اسلامی کے مذاہب اور غیر ملک میں غیر موجود وغیر معمول ابواب فقہ کی تعلیم اور مشق سے یہ ہوا کہ جوں ہی اسلامی نظام زندگی اور اسلامی قانون کی گفتگو ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ مصر میں (جیسے بعض علم سے ناآشنا اور خود فریبی میں مبتلا حضرات علم وتحقیق سے عاری ثابت کرنا چاہتے ہیں ، علمی وتحقیقی کارنامے بجائے خود ان حضرات کا جواب پیش کرتے ہیں) ہزاروں اسلامی قانون کے ماہر پیدا ہو گئے ، ازہری علمائے کرام نے قدیم علم کتاب وسنت و مذاہب فقہ کو پیش کیا ، اور فقہ اربعہ سے مکمل واقفیت سے قبل کوئی شخص قانون اسلامی کے ماہر ہونے کا دعویٰ اگر کرے تو یہ دعویٰ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا ، اور اسلامی تفکیر کے زیر سایہ ججوں ، وکیلوں اور قانون داں حضرات نے اسلامی قوانین کا موازنہ عالمی قوانین سے کیا اور پلک جھپکنے میں اسلامی قانون عالم وجود میں آسکتا ہے ۔ اگر فقہ اسلامی کی تعلیمات گذشتہ دوسو برس میں کسی ایک مذہب فقہی کی باقی رہ جاتیں یا صرف عبادات وغیرہ تک محدود کردی جاتیں تو فقہ اسلامی میں جمود آجاتا اور ان موضوعات سے متعلق جو اسلامی ملکوں میں رائج نہیں تھے ، نہ کتابیں چھپتیں نہ ریسرچ ہوتی اور نہ وقت پڑنے پر پورے عالم اسلامی میں علماء ومفکرین فوج در فوج اس کام کے لئے نکل آتے ، کہ گو اسلامی ملکوں اور قانونوں میں یہ چیزیں موجود نہیں تھیں لیکن اہل علم وایمان کے سینوں اور سفینوں میں یہ دولت پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ تھی ۔

اسلام ایک کلی نظام حیات اور مکمل لائحہ عمل ہے | دراصل اسلام ایک مکمل اور ابدی دین ہے اور انسانی

حیات سے متعلق سارے شعبوں میں اس کی تعلیمات ایک فعال اور قوی اثر رکھتی ہیں، جس طرح اسلام انسان کو زندگی اور موت کی تمام حقیقتوں سے باخبر بناتا ہے بالکل اسی طرح وہ انسانوں کو عبادات و اخلاق سے لے کر معاملات و اجتماعیات تک میں احکام بھی عطا کرتا ہے۔

اسلام ایک کل ہے اس کی اتباع جزوی طور پر مجبوری کے حالات میں تو کی جاسکتی ہے، لیکن اس کو بروئے کار لانے کی کوشش اس کے لیے جو کر سکتا ہو اور نہ کرے ایک گناہ بھی ہے اور محرومی بھی ہے۔ اسلام صرف عبادات کا مذہب نہیں ہے اور نہ اسلام انسان کی ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا مسئلہ ہے، بلکہ اسلام کے احکام ایک مسلمان کے پورے کاروان حیات کو ساحل مراد سے ہم کنار کرتے ہیں۔

اسلام دنیا و آخرت، عبادات و اجتماع اور حکومت و قانون سب کا دین ہے اور ہر مسئلہ کا حل قیامت تک اس کی تعلیمات میں مل سکتا ہے، اسلام نے جس طرح نماز روزہ اور حج کے مسائل بیان کیے ہیں جو انسان کی ذاتی اصلاح اور تقویٰ میں مفید ہیں اور بندے کو اپنے آقا اور خالق و مالک کے دربار تک پہنچاتے ہیں، بالکل اسی طرح زکوٰۃ کے احکام کی تفصیلات، صدقہ، بِر اور خیرات کے سارے طریقوں کو واضح کیا ہے تاکہ اسلامی سوسائٹی ایک جسم بن کر رہے اور امیر و غریب کے درمیان وہ تفاوت اور نفرت پیدا نہ ہو جو غیر اسلامی سوسائٹیوں کا شعار ہے، اسلام نے اسی طرح سود، جوا، سٹے بازی، رشوت، اشیار خوردنی میں بلیک میل یا ذخیرہ اندوزی اور اسی قبیل کی وہ ساری چیزیں منع کر دیں جن سے اقتصادی عالمی مشکلات پیش آتی ہیں، اسلام کا نظامِ اخلاق تاریخ عالم کا مجرب اور بہترین نظامِ اخلاق ہے، اسلام نے چوری ڈاکہ، زنا، جھوٹ، تہمت، قتل، تمام نشہ آور اشیاء اور ہر مخرب اخلاق چیز پر پابندی لگا دی اور اصلاحِ قلب و نظر کے وہ تربیتی طریقے اختیار کیے جن سے قلب و نظر اور عقل و ضمیر کو آسودگی حاصل ہو اور سوسائٹی میں جرم کم سے کمتر ہوں۔

ان تمام اصلاحی تدابیر اور اخلاقی وعظ و نصیحت، اور قلب و نظر کو اپیل کرنے والی

تعلیمات کے باوجود بھی جہاں انسان موجود ہیں وہاں گناہ ممکن ہے، وہاں جرم ہو سکتے ہیں۔ غیر اسلامی قانون تاریخ شاہد ہے کہ جوں جوں نئے سے نئے اور سخت سے سخت قوانین نکالتے ہیں اسی رفتار سے جرم کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے اور مجرموں کی پشت پناہی کرنے کا مرض بھی عام ہوتا جاتا ہے اور تمام قانونی و اخلاقی ادارے اپنی ہار مان کر بیٹھ جاتے ہیں اور جرم کی رفتار برق کی رفتار کی طرح بڑھتی جاتی ہے، جرموں کی سالانہ عالمی رپورٹوں کی ایک جھلک دیکھکر ہر پڑھا لکھا شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ جرم کی رفتار، تعداد، نوعیت اور نت نئی اقسام میں کس طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی جاتی ہے، اور جو ملک جتنا زیادہ ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ، اور متمول و غنی ہے، سعادت قلب اور سکونِ حیات سے اسی کے بقدر دور ہے اور اخلاقی مشاکل اور جرموں کی کثرت وجدت کے سامنے بے دست و پا ہے۔

اصلاح انسانی کا اسلامی طریقہ اسلامی نظام اخلاق اور قانون حیات سب سے پہلے انسان اور سوسائٹی کی اصلاح ان خطوط پر کرتا ہے جہاں اس کے قلب و نظر میں مادہ کے شیطان کے بجائے روح کے خالق خدائے وحدہ لاشریک لہ کا تصور بٹھاتا ہے اور اس تصور کے لئے وہ شرک کی آمیزش کو پسند نہیں کرتا کہ تصور خالق کے بجائے تصور مخلوق کی تعلیم سے ابتدا کرے، رسول پاک نے براہ راست خدا کا تصور پیدا کیا تھا حتی کہ تصور رسولؐ تک تربیتی طریقے کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا تھا کیونکہ ربانی طریقہ تربیت یہی تھا، اور رسول خداؐ کو حکم بھی اسی کا ملا تھا، وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ[1] (البقرہ-۱۸۶) کا مطلب بھی

۱۔ پوری آیت اور ترجمہ یہ ہے: وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (اور اگر تم سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ پکارے، پس انھیں چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ ہدایت پاویں)

یہی ہے، مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا رمز[1]۔ ۵) مفہوم بھی یہی ہے، وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ، وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ (یونس ۱۰۵۔۱۰۷) کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ اسلام خدا کے اس تصور کے ذریعے دنیاوی زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے

۱۔ پوری آیت اور ترجمہ پیش ہے: وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (اور ان کو صرف یہی حکم ملا تھا کہ عبادت کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے لئے بندگی کو، حنیف بن کر (صرف خدا کی راہ مستقیم پر چل کر)، اور قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہی مضبوط اور سیدھا دین ہے۔

۲۔ آیت نمبر ۱۰۵ اوپر لکھنی رہ گئی تھی وہ اور تینوں آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو، اور یہ خیال رہے کہ خطاب افضل البشر سے ہے، وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (اور اپنے چہرے کو متوجہ کرو (زندگی کے رخ کو قائم کرو) دین پر حنیف بن کر، اور مشرکین میں سے نہ ہو اور اللہ کے سوا کسی ایسے کو نہ پکارو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتا اور نہ نقصان، اور (بفرض محال) تم ایسا کرو تو اس وقت تم ظالم ہو گے، اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچا دے تو اس کو دور کرنے والا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں، اور اگر وہ تمہارے لئے بھلائی چاہے تو اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں) اور یہ بات واضح رہے کہ رسول پاکؐ نہ شرک کر سکتے اور نہ ظلم، اس لئے اس آیت میں بہت بلیغ طریقے پر امت کو شرک کی ہر آمیزش سے باز رہنے کا صریح حکم دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت بھی واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ اگر عفو کا حق، خیر پہنچانے اور شر دور کرنے کا حق کسی بھی بشر کو مل سکتا تھا تو وہ افضل البشر محمدؐ ہی ہو سکتے تھے جب آپ کو بھی یہ حق عطا نہیں کیا گیا بلکہ یہ صرف خدا کی قدرت میں ہے، تو پھر کسی بھی دوسرے شخص کے لیے اس کا دعویٰ کرنا یا عقیدہ رکھنا سخت نادانی اور محرومی کی بات ہے، اس لئے اے مسلمانو صرف اللہ سے مانگو اور اسی سے توبہ کرو اور اسی کا کامل تصور اپنے دل میں بٹھاؤ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور جانوروں کی طرح کھانا پینا اور مرجانا نہیں بتاتا، اور تصور حیات میں پیٹ اور روٹی کا مقام وہی متعین کرتا ہے جو اس کا اصل مقام ہے، قلب و نظر اور عقل و دماغ کے بعد، اور خدا کی رضامندی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اس کی بتائی ہوئی مستقیم راہ پر چلو اور انسانیت کو توحید کی دعوت دو اور شریعت الٰہیہ کو اخلاص کے ساتھ قائم کرو اور کچھ کوتاہی اگر رہ جائے تو معافی کے لئے اس کے رحیم شفیق دربار کے سوا کسی دربار، مسند اور آستانے پر نہ جاؤ۔

کتب حدیث میں ایک دعا وارد ہے جسے حضور رسالتمآبؐ ہر نماز میں تشہد کے بعد اور سلام سے پہلے پڑھا کرتے تھے، اس میں خدائے پاک کی قدرت و عظمت کا بیان ہے اور نفع یا نقصان پہنچانے کے سلسلے میں کسی بھی بشر یا غیر اللہ کی نفی اس طرح کی گئی ہے: لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئ قدیر، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منک الجد ترجمہ: خدا کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے، کوئی اس کا مطلق شریک نہیں ہے، صرف اسی کی بادشاہت اور ملکیت ہے، اور صرف اسی کے لئے حمد و ستائش ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ، جس چیز کو آپ عطا کرنا چاہیں اسے روکنے والا کوئی بھی نہیں اور جسے آپ روکنا چاہیں اسے دینے والا کوئی نہیں ہے، اور کسی غنی کو اس کی غنا آپ کے مقابلہ میں فائدہ نہیں پہنچا سکتی (یعنی صالح اعمال کام آئیں گے یا تیری رضا و رحمت)

نیز حدیث جبریل علیہ السلام میں صاف الفاظ مقام احسان سے متعلق یہ وارد ہوئے ہیں، ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک مقام احسان کی ابتدا یہ بتائی راس بات پر یقین ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور انتہا یہ بتائی کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کی رؤیت اس دنیا میں ان آنکھوں سے اہل سنت کے نزدیک ممکن نہیں۔ اس لئے دیکھنے کے مجازی معنی تصور کرنے ہی کے لئے جائیں گے، احسان کی ابتدا، وسط اور انتہا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حاصل کرنا اس زندگی کی سعادت بتاتا ہے، اپنی جان اور مال سب کا مالک وہ خدائے ذوالجلال کو ثابت کرتا ہے اور پھر مسلمان خدا کے رسول کی بتائی ہوئی مکمل خدائی تعلیمات پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کسی بھی اسٹیج پر یہ نہیں بتایا گیا کہ افضل الملائکہ جبریل امین یا افضل البشر خاتم الرسل والانبیاء محمدؐ کا تصور اپنے دماغ اور دل میں بٹھاؤ، پھر پتہ نہیں کیسے اور کیوں مخلوق کا تصور مقام احسان کے سالکین کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے؟ اور یہ حجت کہ بے شمار تصورات سے سالک کو ہٹا کر پہلے ایک شیخ کا تصور بٹھا دیا جائے پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا، یہ حجت اگر شرعاً مستحسن ہوتی تو انبیاء کرام کے سلسلۂ ذہب میں سے کسی بھی نبی یا رسول کی تعلیمات میں یہ دعوت ضرور رہوتی کہ اصنام و افکار سے تصور کو ہٹا کر کسی فرشتہ یا نبی کا تصور بٹھاؤ کیونکہ پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا، اس کے برعکس تعلیمات انبیاء میں وَدّ و سواع یعوث یعوق ونسر جیسے صالحین کے تصور کو بٹھانے سے جو نقصانات ہوئے ان کی طرف اشارہ ہے اور قرآنی ونبوی تعلیمات میں کثرت کے ساتھ براہ راست خدا کی عبادت، تصور اور ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ اور عقلی طور پر بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اور مخلوق کا ناقص تصور جب پختہ ہوجائے تو اس کو ہٹا کر خالق کا لامحدود اور کامل تصور بٹھا دیا جائے کیونکہ دونوں تصوروں میں کوئی مناسبت ہی نہیں یہ انسان کا تصور ہے جو مخلوق، محدود، غیب سے ناواقف، نیند، ضعف، مرض اور موت سے متاثر ہونے والا ہے، وہ خدا کا تصور ہے جو خالق لامحدود، عالم الغیب ہے، نیند، ضعف، مرض اور موت سے متاثر ہونا تو درکنار ان کو پیدا کرنے والا ہے، اور مختصر عبارت میں یہ کہ "لیس کمثلہ شئی"۔ تاریخی و عقلی حیثیت سے یہ بات قابل دید و لائق عبرت و بصیرت ہے کہ مسیحی قوموں نے جب ایک بار انسانی تصور پر عقیدہ و اصلاح نفس کی بنیاد رکھدی تو اب کامل تصور تک پہنچنے کی راہ میں سینکڑوں برس سے عقلی، علمی اور عقائدی ان گنت مشکلات کا سامنا پڑ رہا ہے تصور الوہیت اور دین کو کرنا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایمان ویقین کے ساتھ عمل شروع کردیتا ہے، اور زندگی کی شاہراہ میں وہ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ کہیں خارزار راہ سے دامن نہ الجھ جائے۔

اسلامی قانونِ شریعت ہر انسان کے لئے اس کے فطری تقاضوں کو دبانے کے بجائے ان کو جائز طریقوں پر پورا کرنے کے وسیلے بہم پہنچاتا ہے بلکہ اکثر جگہ ان پر ابھارتا ہے اور غیر فطری زندگی کو رہبانیت، جوگیت اور غیر اسلامی زندگی ثابت کرتا ہے، اسلام ایک مقتول شخص کے ولی کو قصاص عادل کا حق عطا کرتا ہے، ایک نوجوان شخص کو حلال طریقے پر شادی کی رغبت دلاتا ہے، ایک غریب شخص کو محنت اور عمل پر ابھارتا ہے، حکومت پر یہ واجب بناتا ہے کہ وہ ہر غریب یا فقیر، مریض، مقروض اور پریشان حال کی دیکھ بھال کرے، اجتماعی تعاون، ہمدردی اور مدد کی اپیل کرتا ہے، اور پوری زندگی کو حسن وجمال سے مربوط بناتا ہے، انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے اور شوری وجمہوریت کے تقاضوں سے آشنا بناتا ہے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پڑ رہا ہے، اور مخلوق وعبد سے مجرد ہو کر خالق ومعبود کا تصور ان کے ذہنوں میں بیٹھ ہی نہیں پا رہا ہے، اور تاویلات کے چکر اور اسرار کے کبھی نہ حل ہونے والے پھندوں میں وہ گرفتار ہو کر خدا اور دین دونوں ہی کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱۰)

از سعید احمد اکبر آبادی

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت مارچ ۱۹۷۳ء

ہندوؤں کے لئے ایک یونیورسٹی "بنارس ہندو یونیورسٹی" کے نام سے چار برس پیشتر یعنی ۱۹۱۶ء میں بن چکی تھی، اور اس کے لئے ایکٹ کا جو ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا، ہندو مسلم کے فرق کی رعایت سے وہی ڈھانچہ تھا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے لئے بنایا گیا۔ چنانچہ اسی ایکٹ اور اس کے ملحقہ قوانین وضوابط (statutes and ordinances) میں اس امر کی صراحت تھی کہ علی گڑھ محمڈن کالج ہی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تعلیم اور انتظام کے اعتبار سے جو اغراض و مقاصد کالج کے تھے وہی اغراض و مقاصد اب یونیورسٹی کے ہوں گے۔ چنانچہ یہاں جدید اور مغربی علوم وفنون کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ مسلمان طلباء کے لئے دینیات ایک لازمی مضمون ہوگا۔ انتظامی اعتبار سے یہ بات بہت اہم ہے کہ اسی میں اس بات کی بھی صراحت تھی کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے بڑی اور مؤثر مجلس حاکمہ ہوگی، اور اس کا ممبر کوئی غیر مسلم نہ ہو سکے گا۔ وائس چانسلر براہ راست کورٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا، اور یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے علاوہ کورٹ میں جن جماعتوں کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی وہ حسب ذیل تھے:

(۱) بانی ممبران یعنی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبر جن کی تعداد ایکٹ کے نفاذ کے وقت ۱۲۴ تھی۔

(۲) لائف ممبر یعنی وہ لوگ جنھوں نے کالج کو ایک لاکھ روپیہ نقد یا اتنے ہی کی جائداد دی ہو۔

(۳) وہ افراد جو یونیورسٹی کی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی امداد کرنے والی ریاستوں کے نمائندہ ہوں

(۴) علی گڑھ کے اولڈ بوائز۔

(۵) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(۶) دس افراد جو وائس چانسلر کے نامزد کردہ ہوں۔

(۷) ۳۳ افراد کا انتخاب خود کورٹ کرے گی اور یہ افراد (۱) اسلامیہ کالجوں یا مسلم تعلیمی اداروں کے نمائندہ ہوں گے، ان کی تعداد ۹ ہوگی (۲) پندرہ افراد مختلف علوم وفنون کے ماہر ہوں گے (۳) ۹ افراد دینیات اور اسلامی علوم وفنون کے ماہر ہوں گے۔

کورٹ کے بعد اکزکٹو کونسل کا نمبر آتا ہے، اس کے لئے ممبروں کی تعداد تیس رکھی گئی تھی اور اس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی۔

(۱) وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، ٹریژرر اور یونیورسٹی کے کسی کالج کا پرنسپل۔

(۲) چھ ممبر اکڈمک کونسل کے نامزد کردہ۔

(۳) باقی بیس ممبر کورٹ کے انتخاب کردہ ہوں گے۔

کورٹ اور اکزکٹو کونسل ان دونوں کی ہیئت ترکیبی پر غور کیجئے! صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی اصلاً واساساً مسلمان طلباء کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی اور یہ اسلامی تہذیب وثقافت کی نمائندہ تھی اور سرمایہ بھی مسلمانوں کا فراہم کیا ہوا تھا اس بنا پر حکومت وقت نے یہ تسلیم کرلیا کہ اس کا دروبست اور انتظام والصرام بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا

چاہیئے۔

ایک سوال اور اس کا جواب | اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریز اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ دو خود مختار (Autonomous) یونیورسٹیاں قائم کر کے ملک کے دو بہت بڑے فرقوں میں باہم کشیدگی اور فرقہ پرستی پیدا کرنا چاہتے تھے ؟ آج کل کے بہت سے مدعیان قوم پرستی تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیں گے اور استدلال میں کہیں گے کہ "چنانچہ دیکھ لیجئے ! ہندو بنارس یونیورسٹی ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کا مرکز بن گئیں اور اس طرح انگریز کی ہندی سیاست جو "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر قائم تھی کامیاب رہی۔

لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا ہی غلط اور لغو ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ مذہب سے انسانوں میں ایک دوسرے سے نفرت پھیلتی، کشیدگی بڑھتی اور لڑائیاں برپا ہوتی ہیں، انگریز سیاست میں کتنے ہی مستبد اور سخت مزاج ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جیسا کہ جون گنتھر (Jhon Ganthr) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ان سائڈ افریقہ" (Inside Africa) میں مراکش پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے : فرانسیسی استعمار بڑا ظالم اور بے رحم ہوتا ہے وہ اپنی زیردست قوموں کو اپنی تہذیب میں جذب کر کے ان کی اپنی زبان، کلچر اور تہذیب سے تہی مایہ کر دیتا ہے، لیکن برطانوی استعمار سیاست میں عیاری اور بازیگری کے باوصف مذہب اور تہذیب کے معاملہ میں تنگ حوصلہ اور تنگ نظر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر انگریز ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنے ملکی اور قومی معاملات میں اس وقت تک خوا غفاری کے ساتھ دلچسپی نہیں لے سکتی جب تک کہ اس کو اپنے تہذیبی ماحول میں آزادی اور استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملے، اس کے برخلاف جس قوم کو جبر و تشدد یا حکومت کی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ اس کے تہذیبی ورثہ و اثاثہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ سیاسی مجبوری اور بے بسی کے باعث اس وقت حکومت کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکے لیکن

یہ صورت حال دیرپا نہیں ہو سکتی۔ جبر و تشدد کی چٹان کے نیچے محرومی و ناکامی کے احساس کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں اور آخر ایک وقت آتا ہے جب یہ لاوا پھٹتا ہے تو جبر و تشدد کی چٹان بھک سے اڑ جاتی ہے، یہ ایک فلسفہ نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے، ابھی اپنے سامنے کی بات ہے، الجزائر کی سرزمین لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگین ہوئی تب وہ آزاد ہوا۔ لیکن افریقہ اور ایشیا میں برطانیہ اپنے مستعمرات سے دست بردار ہوا تو اس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ کہ دنیا حیران اور انگریزوں کی فراست و تدبر کی قائل ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ علی گڑھ اور بنارس کی طرح شانتی نکیتن بھی تو آخر ایک تہذیبی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی نے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی باہم محبت و رفاقت اور خیرسگالی و خیر اندیشی کے جذبات پیدا کئے ہیں، اکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح امریکہ اور یورپ میں بیسیوں یونیورسٹیاں ہیں جو عیسائی تہذیب کی نمائندہ سمجھی جاتی ہیں، لیکن کیا کبھی کسی نے کہا کہ ان سے فرقہ پرستی کو فروغ ہوتا ہے، پھر مسلمانوں کے عہد عروج و ترقی میں غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اور الحمرا وغیرہ میں خالص اسلامی یونیورسٹیاں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھیں، یہود اور نصاریٰ اور دوسرے مذاہب کے طلبار بھی دور دور سے آتے اور ان یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے، لیکن کیا کبھی کسی نے شکایت کی کہ غیر مسلم ہونے کے باعث اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان دونوں اداروں میں تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ سیاست کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے کا موقع ملا ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان اداروں نے فرقہ وارانہ سیاست کو جنم دیا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ملک میں سیاست کا رنگ جو کچھ بھی رہا ہے یہ دونوں ادارے اس سے متاثر رہے ہیں اور یہ ایک امر ناگزیر و لابدی تھا، چنانچہ ملک میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو علماء ادران کی شکل میں اس کو لیڈرشپ علی گڑھ سے ملی، پھر تحریک آزادی کے آغاز کا زمانہ

آیا تو جس مرد مجاہد نے ملک میں سب سے پہلے مکمل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا اور سامراجی آزادی کا تحریک کی سخت مخالفت کی وہ (یعنی مولانا حسرت موہانی) اسی علی گڑھ کی آغوش تربیت کا پروردہ تھا، اس کے بعد یہ امر طبعی تھا کہ تحریک پاکستان کا ظہور ہوا تو نواب زادہ لیاقت علی خاں اور نواب محمد اسماعیل وغیرہ جیسے لیڈر بھی علی گڑھ نے ہی مہیا کئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، علی گڑھ ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں ہر قسم کے اوزار اور کل پرزے ڈھلتے ہیں اور بتقاضائے وقت مسلمانوں کو جس قسم کی لیڈر شپ درکار ہوتی ہے اس کا ساز و سامان یہیں سے ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اس درس گاہ کے نہایت لائق اور قابل فخر فرزند تھے۔ ۱۹۲۶ء میں جب وہ وفد خلافت کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے تو اس موقع پر بمبئی میں ایک نہایت عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ میری عمر ۱۸۔۱۹ برس کی تھی۔ دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہو چکا تھا اور اس وقت میں بھی والدۂ مرحومہ کے ساتھ حج کے لئے جا رہا تھا، چنانچہ جہاز اکبری جس سے وفد جمعیۃ العلماء اور وفد خلافت کی روانگی ہوئی اسی سے میں بھی گیا تھا اور بمبئی کے اس جلسہ میں موجود تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک نے ملک میں فرقہ وارانہ فضا کو نہایت مسموم کر رکھا تھا اور متعدد شدید قسم کے فسادات ہو چکے تھے، اس بنا پر مسلمانوں میں بہت جوش و خروش تھا۔ آج اس واقعہ کو ۴۷ برس ہونے کو ہو گئے، لیکن جلسہ کا کیا سماں تھا! اب بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے بالکل کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے، عشاء کے بعد کا سہانا وقت، چاندنی رات، ایک طرف سمندر کی موجیں ہیں کہ اچھل کود اور آپس میں چھلیں کر رہی ہیں اور دوسری طرف انسانوں کا بحر بے کراں ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، مولانا محمد علی اپنی نورانی شکل و صورت، دیو قامت جسم و جثہ اور عبا و جبہ کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے شیر ببر کی طرح گرج رہے ہیں، ہندوستان کی اس وقت کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور شدھی سنگھٹن کی تحریک اور اس کے ثمرات کا ذکر آیا تو خود اعتمادی کی دبنگ آواز میں بولے:

ہندو بھائیو! میں نے تو تمہاری طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھ لو جو ایک دوست دوسرے کی طرف بڑھاتا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ ہم سے بڑھ کر تمہارا کوئی مخلص اور سچا دوست نہیں ہے، اور اگر تم چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھو جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو معلوم ہوگا کہ ہم پہلوانی میں بھی پیچھے نہیں ہیں اور ہمیں کشتی لڑنی آتی ہے۔ مولانا کی زبان سے ایک خاص جذباتی انداز میں ان فقروں کا ادا ہونا تھا کہ پورا میدان اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا[1]۔

میں نے ان جملوں کو سن کر اس وقت بھی محسوس کیا تھا اور آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ دم خم علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے کے ہی ہو سکتے ہیں، آپ اگر چاہیں تو اسے "فرقہ پرستی" کہہ لیجئے۔ لیکن عنوان کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں۔ مولانا محمد علی نے جو کچھ فرمایا وہ اسلام کی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے خد وخال کے عین مطابق ہے، حبش کے بادشاہ نجاشی نے مکہ کے مسلمان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا تو مسلمانوں نے اس کا بدلہ اس طرح دیا کہ جب اس کے ملک پر حملہ ہوا تو مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں شامل ہو کر شجاعت و سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ اہل ملک بھی عش عش کرنے لگے، اور صرف یہی نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے لئے احسان شناسی کا مظاہرہ اس طرح فرمایا کہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔

---

[1] مجھے یاد ہے، اسی تقریر میں مولانا نے مجمع کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: لوگو! تمہارے پاس فرعون بھی ہے اور موسیٰ بھی! اب اگر تم کو فرعون پر فخر و ناز ہے تو بھلا تم سے کوئی تعلق اور کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن اگر تم کو فخر و ناز موسیٰ پر ہے کہ وہ تمہارے ملک میں پیدا ہوئے تھے تو بے شبہ تم ہمارے بھائی ہو۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد بھی مکہ کے کفار نے مسلمانوں کو نقصان اور اذیت پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مدینہ کے یہودیوں سے سازباز کی، عرب قبائل کو ان کے خلاف اکسایا اور ابھارا تو آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تلوار اٹھائی اور پھر یہ تلوار اس وقت تک نیام میں نہیں گئی جب تک کہ فتح مکہ کی صورت میں ان لوگوں کا قلع قمع نہیں ہو گیا۔ جو لوگ علی گڑھ یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں ان کو اسلامی تہذیب اور اسلام کے نظامِ زندگی کا مطالعہ اس کی اصل اسپرٹ میں کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ سرسید پر یا علی گڑھ یونیورسٹی پر اگر کبھی کوئی ایسا دور آیا ہے جب کہ وہ آج کل کی اصطلاح میں "فرقہ پرستی" کا شکار ہو گئے ہیں تو اس کے اصل اسباب و دواعی کیا تھے؟ اور اس کی ذمہ داری "البادی اظلم" کے مطابق اولاً و اصلاً کس کے سر عائد ہوتی ہے؟ آپ کہیں گے: ایک چھوٹا سا سوال اور اس کا جواب اس قدر طویل! اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد کے علی گڑھ کو آپ اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تقسیم سے پہلے کے علی گڑھ کو آپ اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور اس سے متعلق اپنے ذہن کو صاف نہ کر لیں۔

---

۱ پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ تحریک ص ۹) نے بالکل صحیح لکھا ہے: "سرسید نے شروع سے آخر تک تحریر و تقریر سے، برتاؤ سے، کالج کے ذریعہ، ہر جا اور ہمہ وقت ابنائے وطن کو اپنانے کی کوشش کی اور اخلاص و یگانگت کے اظہار میں وہ سب کہتے اور کرتے رہے جس کا عشر عشیر بھی غیر مسلم لیڈروں میں سے کسی نے مسلمانوں کے حق میں غدر سے لے کر گاندھی جی کے وقت تک نہ کیا نہ کہا۔ ہندوؤں اور ہندوستان سے مسلمانوں کو پورے طور پر وابستہ رکھنے کا عقیدہ سرسید کے دل میں کس قدر راسخ تھا اس کا اندازہ ان کی مشہور تقریر سے ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں اس طرح کی تقریر سرسید کے پایہ کے غیر مسلم لیڈروں نے بھی کی ہوتی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور تقدیر دونوں آج کچھ اور ہوتیں۔"

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقسیم سے پہلے یہاں جو کچھ ہوا اچھا ہوا اور اس میں کوئی برائی یا خرابی نہیں تھی، نہیں! بلکہ اس میں بہت نامناسب اور عاقبت نااندیشی کی باتیں بھی ہوئیں، لیکن آج ہم اپنے برادران وطن سے کہتے ہیں کہ ماضی میں جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا اس میں نہ تمہارا دامن پاک ہے اور نہ ہمارا۔ اب آؤ! ہم تم دونوں مل کر عہد کرتے ہیں کہ آئندہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حق اور انصاف کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور کبھی فرقہ پرستی کو ابھرنے نہیں دیں گے، اگر ملک کے ان دونوں بڑے فرقوں میں یہ عہد و پیمان ہو جائے تو دنیا دیکھے گی کہ مسلمان کا قدم اس راہ میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی سطور بالا میں عرض کیا گیا، علی گڑھ جس اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اس کا یہی تقاضا اور یہی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جو غیر مسلم طلباء اور جو غیر مسلم اساتذہ آج یونیورسٹی میں رہتے ہیں ان سے دریافت کیجئے کہ کیا وہ یہاں اس طرح نہیں رہتے جس طرح وہ اپنے گھروں اور خاندانوں میں رہتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی امتیازی سلوک برتا گیا ہے؟ کیا وہاں مسلمان طلباء اور اساتذہ ان کی شادی اور غمی میں برابر کے شریک نہیں ہیں، کیا ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور دوستانہ نہیں ہیں؟ مسلمانوں میں یہ وسعتِ قلب، اپنے ساتھی اور پڑوسی کا خیال، اس کا احترام اور اس کی دلجوئی اور مدارات! یہ سب دین ہے اس تہذیب کی جس کا علمبردار علی گڑھ ہمیشہ سے رہا ہے اور آج بھی ہے۔

یونیورسٹی کے ۲۷ برس

بہرحال ۱۹۲۰ء میں یہ یونیورسٹی عالم وجود میں آئی اور اس طرح ملک کی تقسیم اور آزادی کے حصول تک اس نے اپنی زندگی کے ستائیس برس گذارے تھے، اس زمانہ میں وائس چانسلر کا ابتدائی تقرر تین برس کے لئے ہوتا تھا اور اس کا انتخاب دوبارہ ہو سکتا تھا، لیکن علی گڑھ چونکہ صرف ایک تعلیم گاہ نہیں بلکہ ایک تحریک تھا اور یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنی جاتی تھی اس بنا پر

اس یونیورسٹی کا جو وائس چانسلر ہوتا تھا ملک میں اس کا بڑا اعتبار اور بھرم ہوتا تھا اس لئے اس عہدے کے لیے جس شخص کا بھی انتخاب ہوتا تھا اس کی شخصیت، علم وعمل اور کیرکٹر کے لحاظ سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ گورنمنٹ کے ہاں بھی بہت نمایاں ہوتی تھی۔ چنانچہ راجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، سر شاہ محمد سلیمان، نواب سر مزمل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں، جو اس دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آگے پیچھے (یہ نام غیر مرتب ہیں) وائس چانسلر ہوئے۔ یہ سب نہایت عظیم شخصیت کے اور ملت اسلامیہ ہند کے مایۂ نازش فرزند تھے، ایک طرف ان کی قابلیت اور علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ جس مجلس میں ہوتے میر مجلس ہو کر رہتے، سر راس مسعود کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اہل زبان کی طرح بولتے، ہر موضوع پر بے تکلف اور برجستہ فصیح وبلیغ تقریر کرتے۔ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار بر نوکِ زبان تھے۔ جستہ جستہ ان کو پڑھتے، ان کی تشریح کر کے ان کا حسن وقبح بیان کرتے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضیات میں اور سر شاہ محمد سلیمان سائنس میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے اور دوسری جانب بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے، نماز روزہ کے پابند اور اسلامی شعائر وروایات کے دلدادہ تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پنجوقتہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کرتے اور معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ تہجد کی نماز تک کے پابند تھے۔ ان حضرات کا کردار، کیرکٹر اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ سر شاہ سلیمان دہلی سے جہاں وہ ہائیکورٹ کے جج تھے، ہر ہفتہ علی گڑھ آتے تھے تو آمد ورفت کا کرایہ اور علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں کھانے پینے کا خرچ بھی خود برداشت کرتے تھے اور اپنی ذات کے لئے یونیورسٹی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہیں تھے، سر شاہ سلیمان کو ہم نے بھی دیکھا ہے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے، اللہ اکبر! کیا عجیب وغریب شخصیت تھی، جو شخص بھی ان کے پاس بیٹھتا ان کی طرف غیر معمولی کشش محسوس کرتا تھا۔ مجھے ذاتی طور

پر ان کے اور ان کے گھر کے بعض ایسے واقعات معلوم ہیں جن کے باعث میرا خیال ہے کہ اخلاق اور روحانی و باطنی اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ان کے خدا رسیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، راجہ محمود آباد، نواب سر مزمل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں اسلامی شعائر و اخلاق اور اسلامی تہذیب کے اقدار عالیہ کے حامل اور صحیح معنی میں اس کے نمائندہ تھے۔ ان حضرات کے شب و روز مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی مخلصانہ خدمت کے لئے وقف تھے اور اس لئے یہ حضرات قوم پر فدا تھے اور قوم ان پر فدا تھی۔

اب اس عہد کے چانسلروں کو دیکھئے تو آپ کو اس فہرست میں سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال، نواب محمد حمید اللہ خاں، (بھوپال) میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن، کے نام نظر آئیں گے اور اس سے اندازہ ہوگا کہ اس یونیورسٹی کو کس طرح ہندوستان کی نامور اور بلند پایہ ریاستوں کی سرپرستی حاصل تھی، یہ ریاستیں گراں قدر مالی امداد بھی دیتی تھیں اور اس کے تمام تعلیمی، انتظامی اور تہذیبی امور میں دلچسپی لیتی تھیں، نواب حمید اللہ خاں نے تو تعلیم بھی یہیں پائی تھی۔

تقسیم سے پہلے کے اس مختصر دور میں یونیورسٹی کو متعدد مرتبہ سخت اور صبر آزما حالات سے سابقہ پڑا، اس قسم کا پہلا حادثہ تو اس وقت پیش آیا جب کہ یونیورسٹی ابھی عالم وجود میں آئی ہی تھی، ترک موالات کی تحریک شباب پر تھی اس کا حملہ یونیورسٹی پر بھی ہوا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کے در و دیوار ہل گئے، لیکن "عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" کے مطابق اس حملہ کے بطن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ پیدا ہوئی اور اس طرح اب ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعلیم جدید کی دو درس گاہیں ہو گئیں، اس کے بعد یونیورسٹی کو دوسرا حادثہ سر رحمت اللہ کمیشن کی صورت میں پیش آیا، یہ حادثہ بھی اس درجہ شدید تھا کہ یونیورسٹی کا انتظام درہم برہم ہو گیا، بہت سے پرانے لوگوں کو یہاں سے جانا پڑا اور نئے لوگوں نے ان کی خالی جگہوں کو پر کیا، اس کے بعد تیسرا حادثہ اس وقت پیش آیا جب کہ تحریک پاکستان کے

زیادہ تر یونیورسٹی عملاً تحریک کے سپاہیوں کا ایک کیمپ بنکر رہ گئی، یہ حوادث یونیورسٹی کے لئے خواہ کتنے ہی صبر آزما اور شدید ہوں، لیکن نئے نہیں تھے، اس قسم کے حالات و واقعات ہر یونیورسٹی میں ہی پیش آتے رہتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اندرونی اور داخلی کم، زیادہ تر بیرونی اور خارجی ہوتے ہیں، ان کی قدریں عارضی اور ہنگامی و وقتی ہوتی ہیں، مستقل اور پائدار نہیں ہوتیں۔ اور عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ ان کو اسی روشنی میں دیکھا اور جانچا جائے۔

بہرحال یونیورسٹی اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس درس گاہ کے ذریعہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، علی گڑھ صرف ایک کالج نہیں، بلکہ ایک تحریک تھا ــــ اور تحریک بھی بڑی موثر اور فعال ــــ اس تحریک نے مسلمانوں کے عروق مردہ میں زندہ رہنے کے ارمان کا نیا اور تازہ خون پیدا کیا۔ جو لوگ مایوسی اور ناکامی کے شدید احساس کے باعث ہمت کا ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے وہ عزم و ہمت اور خود اعتمادی کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گئے، اس تحریک نے ان کو حوصلہ دیا، ولولہ کار دیا، جوش عمل بخشا اور تنازع للبقا کے میدان میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کرلینے کا سلیقہ سکھایا، اس تحریک کا یہ اثر تھا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون، ادب اور لٹریچر، طب اور قانون، اڈمنسٹریشن، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت، جرنلزم اور تعلیم، غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کی، حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے حسن کارگزاری کا نقش نہ بٹھایا ہو، اسی طرح پبلک لائف کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر ان کی شہرت اور عظمت کا طوطی نہ بولا ہو، اس تحریک کی افادیت اس ملک تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ دور دور تک پہونچی اور یہ یونیورسٹی صرف ہندوستان کی نہیں، بلکہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی۔

آپ کو یاد ہوگا، سر آغا خاں نے یونیورسٹی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں میں روحانی اتحاد کا ذریعہ ہوگی، موصوف کا یہ خیال اس طرح صحیح ثابت ہوا کہ اس یونیورسٹی کے سرچشمۂ فیض سے جو ہزاروں مسلمان سیراب ہو چکے ہیں ان میں کتنے ہی سنی ہوں گے اور کتنے شیعہ، ان میں دیوبندی بھی ہوں گے اور بریلوی بھی، مقلد بھی ہوں گے اور غیر مقلد بھی، لیکن یہ سب علی گڑھ آئے۔ برسوں کلاس رومز اور ہوسٹل میں، کھیل کے میدانوں اور یونین کے جلسوں میں ایک ساتھ مل جل کر اور ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار بن کر زندگی بسر کی اس بنا پر ان میں باہم محبت اور ربط وضبط ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد میں باوجود افکار و خیالات میں اختلاف کے ہوتا ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی گوشہ میں چلے جائیے۔ علی گڑھ کا پرانا تعلیم یافتہ اگر وہاں کوئی آپ کو ملے گا اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ آپ کا تعلق بھی علی گڑھ سے ہے تو وہ آپ سے اس طرح ملے گا کہ گویا اپنے بھائی سے مل رہا ہے، اس بنا پر یہ یونیورسٹی آج اسلامی اخوت و برادری کی ایک رمز یہ علامت (Symbol) بھی ہے۔

چنانچہ ابھی میں جنوبی افریقہ اور مورشیس کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ ان دونوں ملکوں میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ کثرت سے ہیں، جگہ جگہ یہ حضرات ملتے تھے تو علی گڑھ کی خیریت اس ذوق و شوق سے دریافت کرتے تھے جیسے بڑھاپے میں بچپن کے کسی عزیز ترین دوست کا شناسا آپ کو مل جائے تو آپ کرید کرید کر اس کا حال دریافت کرتے ہیں۔

ادبیات

غزل

جناب فضا ابن فیضی

یوں آتشِ ہوس کو دلوں میں ہوا نہ دے
اک دن یہ آگ تیرے ہی گھر کو جلا نہ دے

ڈرتا ہوں سانس لیتے ہوئے اس خیال سے
یہ سیلِ تندِ جسم کی دیوار ڈھا نہ دے

کچھ اور ہو نہ جائیں جنوں والے بے لباس
عریانیِ جنوں کو خرد کی قبا نہ دے

ایک ایک حرف مصلحتوں کی زبان ہے
یہ چیز آبروئے سخن کو گھٹا نہ دے

ہر جسم نخلِ دار ہے ہر سانس دستِ سنگ
جینا یہی ہے اب تو مجھے یہ سزا نہ دے

کیا پیچھے مڑ کے دیکھوں کہ وہ رُت گزر گئی
اب اتنی دور جا کے مجھے تو صدا نہ دے

صدیاں گزار دی ہیں اسی شہرِ سنگ میں
دل کی جراحتوں کا مجھے واسطہ نہ دے

بس دو قدم ہے حرف و قلم سے صلیب تک
یہ فاصلہ بھی تیری سیاست مٹا نہ دے

کانٹوں کی داستاں ہوں مجھے کوئی خوش مزاج
تیرے لبوں پہ بوسے کی صورت سجا نہ دے

خاکسترِ حیات ہوں، دامن میں باندھ لے
پیارے تو مجھ کو شعلہ سمجھ کر ہوا نہ دے

آزاد ہے بصیرتِ شاعر مگر فضا
کیا بوئے گل کرے جو صبا راستہ نہ دے

غزل

جناب نسیم شاہجہانپوری

اُن کی ہر ایک بات مجھے معتبر لگے
یارب نہ اِس یقیں پہ کسی کی نظر لگے

ہر سمت خشک سبزۂ دیوار و در لگے
اب مجھکو ایک دشت خود اپنا ہی گھر لگے

تارا لگے، چراغ لگے ہے، گہُر لگے
آنسو مژہ پہ آکے بہ شکلِ دِگر لگے

ہر سانس ایک رشتۂ نامعتبر لگے
مجھکو چراغِ زیست، چراغِ سحر لگے

آگاہیِ فریبِ مسلسل کے باوجود
کوئی بھی رہگذر ہو تری رہگذر لگے

روزِ حساب! تیرے تصور کے میں نثار
صدیوں کا فاصلہ بھی بہت مختصر لگے

اے زندگی بتا کہ ترا کیا خیال ہے
تو بھی مجھے اجل کی طرح معتبر لگے

آ اے غمِ حبیب! مرا تو ہی ساتھ دے
تنہا رہِ حیات بڑی پُرخطر لگے

شاید پھر اُن کے گیسو و رُخ کی چھڑی ہے بات
ٹھہری ہوئی سی گردشِ شام و سحر لگے

یہ کس مقام پر مجھے لائی ہے زندگی
جینے سے ڈر لگے ہے نہ مرنے سے ڈر لگے

سب سے یہ پوچھتا ہوں کہ منزل ہے کتنی دور
مجھکو ہر اک شریکِ سفر راہبر لگے

اس دورِ کشمکش میں کسے فرصتِ حیات
انسان کا وجود فریبِ نظر لگے

اُن کا ہر ایک وعدۂ شام و سحر نسیم
نامعتبر بھی ہو کے مجھے معتبر لگے

تبصرے

یادوں کی بارات از جناب جوش ملیح آبادی، ضخامت ۵۵۶ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت بیس روپے، پتہ: آئینۂ ادب۔ لکھنؤ

جناب جوش ملیح آبادی اردو کے نامور اور عظیم شاعر ہیں، اگرچہ ان کی شاعری میں وہ سوز و گداز نہیں ہے جس سے شعر تیر و نشتر بن جاتا ہے اور نہ اس میں وہ مقصدیت ہے جس سے شعر میں توانائی اور ابدیت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ تاہم ان کو زبان و بیان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور ان کے کلام میں ندرت و جودتِ تشبیہات و استعارات، تخیل کی وسعت اور مشاہدہ کی دقت و باریک بینی کے جو اوصاف و کمالات فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اردو زبان کا قاآنی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب جوش صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ ایک بڑے فن کار کی خود نوشت سوانح عمری سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس میں صاحب سوانح نے فن سے متعلق اپنے نظریہ پر بحث اور اپنے فن کے ارتقا پر گفتگو کر کے کچھ فنی رموز و نکات سمجھائے ہوں گے۔ لیکن اس کتاب میں، کہیں کہیں دو چار جملوں کے علاوہ اس قسم کی کوئی مستقل بحث نہیں ہے، اس کتاب کے خاص موضوع گفتگو یہ ہیں: (۱) خاندانی حالات، ابتدائی نشو و نما، تعلیم و تربیت و ملازمت وغیرہ (۲) احباب (۳) جن سے عشق و محبت کی پینگیں بڑھائی گئیں، زبان و بیان پر جوش صاحب کی قدرت مسلم ہے۔ چنانچہ یہ کتاب نثر میں بھی ان کی اس قدرت کا زندہ ثبوت ہے۔ چنانچہ صفحات کے صفحات ایسے ہیں کہ پڑھتے جائیے اور لطف لیتے

جائیے۔ علی الخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں جو عبارت لکھی ہے وہ
اردو انشاء وبلاغت کا شاہکار ہے، لیکن افسوس ہے کہ جوش صاحب نے
کتاب میں بحیثیت مجموعی جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ شرفاء کا ہرگز نہیں بلکہ
اوباشوں اور بازاری لوگوں کا ہے، شرفاء اس لب و لہجہ کے معاملہ میں کس
درجہ محتاط تھے؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوگا کہ کم وبیش چالیس برس
پہلے کی بات ہے، ناصر نذیر فراق دہلوی دلی کی ٹکسالی اور لال قلعہ کی بیگماتی
زبان کے بڑے ماہر اور محقق تھے، ان کا تو انتقال ہو چکا تھا اور میں نے ان
کو دیکھا بھی نہیں، البتہ مرحوم کے صاحبزادہ ناصر خلیق نگار جو زباندانی میں باپ
کے صحیح جانشین تھے میرے بڑے مخلص دوست تھے، ایک مرتبہ ان سے گفتگو
کرتے ہوئے کسی بات پر میری زبان سے نکلا "رنگ میں بھنگ" موصوف پر
یہ سنتے ہی سخت حیرت واستعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی، اور بولے: سعید صاحب!
دلی کے شرفاء اس طرح نہیں بولتے "میں نے کہا: تو وہ اس قسم کے موقع پر کیا
کہتے ہیں" انھوں نے جواب دیا: رنگ اور بھنگ کی بات بازاری لوگ کرتے
ہیں، دلی کے شرفاء ایسے موقع پر کہتے ہیں: "کلیل میں غلیل" جوش صاحب نے
کتاب میں جگہ جگہ شرافت کا ادعا کیا ہے! لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ شریف
درحقیقت وہ شخص ہے جس کی بول چال اور جس کا عمل شریفانہ ہو۔

چنانچہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد مصنف کی جو تصویر ذہن کے پردہ
پر ابھرتی ہے وہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جو ایک خوش حال اور پرانے
قسم کے جاگیردارانہ گھرانے میں پیدا ہوا، اور صحیح تعلیم وتربیت کے فقدان اور صحبت
بد کے باعث شروع سے ہی اس کی عادتیں خراب اور اس کے طور طریق
آوارہ اور بدچلن لوگوں کے سے ہوگئے۔ اس میں شرم وحیا نہ اپنوں کی

اور نہ پاسِ لحاظ کسی نام کو نہیں ہے، مذہب کا کیا ذکر! انسانیت و شرافت اور تہذیب و شائستگی کے جو مسلمہ اقدارِ حیات ہیں ان سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور عام سماجی قدریں اس کے ذہن میں اس طرح الٹ پلٹ گئی ہیں کہ اس کے نزدیک فسق و ہوا پرستی کا نام عشق و محبت ہے، وقاحت اس کے نزدیک لائقِ فخر ہے، دوسروں کو ایذا پہونچانے میں اسے لطف آتا ہے، کذب بیانی شیخی اور تعلّی اس کی فطرت اور آوارگی اس کی طبیعت ہے، خودکشی صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ معنوی بھی ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے یہ کتاب لکھکر اسی قسم کی خودکشی کی ہے، ان میں اگر انسانیت و شرافت کی کوئی ایک ادنیٰ سی رمق بھی موجود ہے تو ہم کو یقین ہے کہ اگر آج نہیں تو کل ان کو یہ محسوس ہوگا کہ انھوں نے یہ کتاب لکھکر عظیم اور ناقابلِ تلافی ظلم کیا ہے خود اپنی ذات پر، اپنے خاندان پر، اپنی بیوی اور اپنی اولاد پر، اپنے دوستوں اور احباب پر یہاں تک کہ خود اپنے فن پر۔

یادوں کی دنیا از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، تقطیع کلاں، ضخامت پانچسو صفحات سے زیادہ، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت درج نہیں، پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڑھ[1]

جتنا تکدر جوش صاحب کی "آپ بیتی" کو پڑھ کر ہوا تھا، اتنی ہی مسرت اس کتاب

---

[1] یہ کتاب کم و بیش چار برس پہلے وصول ہوئی تھی۔ لیکن تبصرہ کی نوبت اب آرہی ہے ہوا یہ کہ جب میں علی گڑھ میں تھا دفتر برہان کی طرف سے ایک بڑا بنڈل کتب برائے تبصرہ کا وصول ہوا جس کی ضخامت کو دیکھکر ہی میں سہم گیا۔ میں نے خیال کیا کہ میز پر رکھی ہوئی کتابیں نمٹ جائیں گی تو بنڈل کو کھولوں گا لیکن ہوا یہ کہ میز پر رکھی ہوئی کتابیں کبھی ختم نہیں ہوئیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور یہ بنڈل بند کا بند پڑا رہا۔ آخر ابھی پچھلے دنوں یہ بنڈل کھلا تو اس میں یہ کتاب بھی ملی۔

کو پڑھکر ہوئی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بڑے فاضل اور لائق بزرگ ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی اور اردو تینوں زبانوں کے مصنف ہیں۔ اگرچہ ان کا خاص مضمون جس کے وہ عرصہ تک استاد رہے تاریخ اور سیاسیات ہے۔ لیکن اردو زبان کے شعر و ادب کے بھی بلند پایہ مبصر، نقاد اور شگفتہ قلم ادیب ہیں۔ یہ کتاب موصوف کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اور اپنے موضوع پر اتنی کامیاب ہے کہ اس کو موڈل بنایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قائم گنج کے پٹھانوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد ہیں، ابتدائی تعلیم اٹاوہ اور علی گڑھ میں پائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویٹ ہوئے، پھر تقریباً چار برس فرانس میں قیام کرکے وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ وطن واپس آکر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں تاریخ وسیاسیات کے استاد رہے، اسی درمیان میں چند ماہ کے لئے نظام حیدر آباد دکن مرحوم کے پوتے کے اتالیق بھی رہے، عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ آئے اور یہاں سات برس تک پرو وائس چانسلر کے عہدہ کی خدمات انجام دیں، زندگی کے اس طویل سفر میں مصنف بچپن سے بڑھاپے تک جہاں جہاں رہے، جو کچھ دیکھا اور سنا، جن جن لوگوں سے ملے اور جو کچھ خود پڑھا اور سیکھا ان سب کی روئداد شرح وبسط کے ساتھ نہایت شگفتہ اور کیف آفرین اندازِ بیان میں قلمبند کی ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر دنیا ایک نیا رنگ وروپ اختیار کر رہی تھی۔ اور ایک نئی تہذیب وتمدن کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں پہلے تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں ہندو اور مسلمانوں میں بڑے بڑے نامور لیڈر منظر عام پر آئے، ادھر یورپ میں علم وتحقیق اور استشراق کا سورج نصف النہار پر تھا۔ پھر ہندوستان نے آزادی حاصل کی اور اسی سلسلہ میں حیدر آباد میں پولس ایکشن کا واقعہ پیش آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر بھی اس عہد میں انقلاب کے کئی دور گذر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سب

چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے ایک خاص اثر لیا ہے، اور اس کتاب میں یورپ اور ہندوستان کے ان تمام حالات و واقعات کو ناقدانہ بصیرت اور مورخانہ دیانت کے ساتھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے، اس بنا پر یہ کتاب صرف ایک شخصی سوانح حیات نہیں۔ بلکہ یہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور علمی و ادبی حالات و واقعات اور ان سے وابستہ اشخاص و افراد کے کارناموں اور ان کے اوصاف و کمالات کا بھی ایک مستند مرقع ہے جس سے تاریخ عہدِ حاضر کا کوئی مصنف بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس لئے ادبی حیثیت کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی یہ کتاب بڑی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

برہان

جلد ۷۱ | ماہ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۳ء | شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے گذشتہ مہینہ ہماری پرانی بزمِ علم وادب کی ایک اور شمع بجھ گئی۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی، بدایوں کے ایک نامور خانوادۂ شعر وادب کے فرزند ارجمند تھے، قدیم دستور کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم ایک مدرسہ میں پائی، پھر انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو ایم۔ اے تک پہونچے فارسی میں جس کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۲۶ء میں بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے، اور شعبۂ فارسی کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے ۵۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ موصوف کی استعداد بڑی پختہ اور نظر بہت وسیع تھی۔ عربی، فارسی اور اردو شعر وادب پر تحقیقی اور مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے، لغت ان کا خاص فن تھا، چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد چند برس علی گڑھ میں اور پھر چند برس دہلی میں لغت پر جو کام اردو شعبوں کے ماتحت ہو رہا ہے اس سے وابستہ رہے، تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا۔ چنانچہ تاریخ و ادب پر متعدد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن میں دیوان مومن مع ایک طویل مقدمہ کے اور شرح قصائدِ مومن خاصہ کی چیزیں ہیں۔ مذہبیات سے بڑی دلچسپی تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کی دو تین کتابیں ہیں، اخلاق وعادات کے لحاظ سے بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، نہایت خود دار، ملنسار اور متواضع تھے، طلبا پر بے حد شفقت کرتے اور ان کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے، کم سخن تھے، مگر جب بولتے تھے تو تقریر مربوط اور پرمغز

کرتے تھے، عمر ۷۷ برس کے لگ بھگ ہوگی، ادھر کچھ عرصہ سے علی گڑھ میں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا مقیم تھے۔ وہیں ۸ رجولائی کو شب میں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے، اب اس وضع کے لوگ کہاں ملیں گے۔

خبر گرم ہے کہ اپنے گوشۂ عافیت کیرالا اور مدراس سے باہر نکل کر مسلم لیگ بڑے جاہ وحشم اور طمطراق کے ساتھ گجرات اور اتر پردیش کی طرف بھی پیش قدمی کر رہی ہے اور یہاں کے مسلمان اس کے ایک جلوۂ بے حجاب کو ترس گئے تھے وہ جذبۂ بے قرار و بے اختیار کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ اس مسلم لیگ کا روپ اب وہ نہ ہوگا جو ۴۷ء سے پہلے تھا، اب یہ کبھی اس پارٹی کا ساتھ دے گی اور کبھی اُس پارٹی کا۔ کبھی کانگرس سے ساز باز کرے گی اور کبھی کونسٹوں سے یا اور کسی مخالف پارٹی سے ناطہ جوڑے گی۔ لیکن بہرحال رہے گی ایک فرقہ وارانہ جماعت! اگرچہ محترم صدر مسلم لیگ نے ابھی حال میں شیخ عبداللہ کی ایک تقریر کے جواب میں جو بیان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ جماعت ہونے سے قطعی انکار کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم اس جماعت کا ممبر ہوسکتا ہے؟ اگر ہوسکتا ہے، تو پھر اس کو مسلم لیگ کہنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ اور اگر نہیں ہوسکتا تو پھر وہ فرقہ وارانہ نہ ہوئی تو اور کیا ہوئی! اسی ایک سوال کو اس طرح بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کیا کسی غیر مسلم کو کسی مسلم علاقہ میں اپنے امیدوار کی حیثیت سے الکشن میں کھڑا کرسکتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اسے مسلم لیگ کہنا صحیح نہ ہوگا، اور اگر کھڑا نہیں کرسکتی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ صرف ایک فرقہ کی اور اس کے ہی مفاد کے لئے ایک جماعت ہوئی اور ظاہر ہے ایک پارٹی یا جماعت کے فرقہ وارانہ ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے، اس بناپر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روپ خواہ

کچھ ہی ہو اور عزائم اور مقاصد خواہ کیسے ہی ہوں یہ جماعت فرقہ وارانہ ہے اور اس سے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی اور فرقہ وارانہ طریق فکر اور جذبات کی نشوونما ہوگی اور اس کو کوئی شخص بھی ان کے حق میں اچھا نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب اقلیت میں یہ جذبات ہوں گے تو ان کا اثر لازمی طور پر اکثریت پر ہوگا، اور چونکہ ہر شعبہ، ہر محکمہ اور زندگی کے ہر میدان میں اقتدار اعلیٰ اکثریت کے ہاتھ میں ہے اس بنا پر اس کشمکش کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو جو دقتیں اور پریشانیاں اب پیش آرہی ہیں اُن میں اور اضافہ ہوجائے گا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم شروع سے آج تک فرقہ وارانہ سیاست کے کبھی حامی نہیں رہے۔ ہم نے ملک و وطن اور خود مسلمانوں کے لئے اس کو ہمیشہ سخت مضر اور نقصان رساں سمجھا ہے اور آج بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں اور برابر سمجھتے رہیں گے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ جس طرح ہمارے کہنے سننے کا پہلے کوئی اثر نہیں ہوا اب بھی نہ ہوگا۔ اور مسلم لیگ کو جس طرح پہلے فروغ ہوا تھا اب بھی ہوگا۔ عام مسلمانوں کو اس کی طرف بہ نسبت کسی اور جماعت کے میلان اور کشش زیادہ ہے، ابھی حال میں اترپردیش کے بعض مقامات میں مسلم لیگ کے جو عظیم اجتماعات ہوئے ہیں وہ اس کی غمازی کر رہے ہیں، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ایک ربع صدی تک جن مسلمانوں نے کبھی مسلم لیگ کا نام بھی نہیں لیا اب کیا بات ہوئی کہ وہ اس کا احیا کر رہے اور اس کو فعال بنانے کی فکر کر رہے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پچیس برس تک کانگرس پر بھروسہ کیا۔ اس کے جمہوریت اور سکولرزم کے دعوول اور حکومت کی بار بار کی یقین دہانیوں اور وعدوں پر اعتبار کیا، ان کو بار بار چرکے لگتے اور پے بہ پے مایوس کن حوادث پیش آتے رہے، لیکن وہ ہمیشہ اپنے دل کو یہ سمجھاتے رہے کہ حکومت اور کانگرس اپنے قول و قرار میں مخلص اور راست باز

ہے، البتہ چونکہ ملک میں جمہوریت کی جڑیں ابھی مضبوط نہیں ہیں اس لئے حکومت جو چاہتی ہے وہ کر نہیں پا رہی ہے، ایک مضبوط اور غالب اکثریت رکھنے والی پارٹی اور اس کی حکومت کے لئے اصلاحِ حال کے واسطے پچیس برس کی مدت کم نہیں ہوتی لیکن مسلمان محسوس کرتے ہیں اور بجا کرتے ہیں کہ اس طویل مدت میں بھی ان کے کسی درد کا درمان اور ان کی کسی بیماری کا علاج نہیں ہو سکا ہے، بلکہ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ فسادات ہوتے ہیں تو مسلمانوں کے نقصانات کی کوئی تلافی نہیں ہوتی۔ فساد زدہ علاقہ پر اجتماعی جرمانہ نہیں ہوتا اور مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔ ملازمت کا دروازہ ان پر اب بھی کشادہ نہیں، اردو اپنے طبعی اور واجبی حق سے اب تک محروم ہے، مسلم یونیورسٹی کا معاملہ بد سے بدتر ہو گیا۔ اکثریت کے اداروں اور پبلک مفادات کے مرکزوں میں اب بھی ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، کتنی مسجدیں ہیں کہ اب تک قبضۂ اغیار میں ہیں، غرض کہ مسلمانوں میں یہی بیچارگی اور کس مپرسی کا احساس ہے جس کا مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا اور اب وہ مسلم لیگ کی شکل میں ایک پھوڑا بن کر ابھر آنے کے لئے بے قرار ہے، اس لئے اس کی بڑی ذمہ داری کانگرس اور اس کی حکومت کے سر عائد ہوتی ہے۔

رسول اللہؐ کے اجداد

(۱)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

عربی اخبار و آثار کے مطابق پیغمبر مسیحؑ سے تقریباً تین ہزار برس پہلے پیغمبر ابراہیمؑ اپنے لڑکے اسماعیلؑ اور فرشتے جبریل کے ساتھ بُراق پر سوار ہو کر شام سے مکہ آئے اور وہاں مرکزِ توحید کعبہ کی بنیاد رکھی، اس کے بعد وہ اسماعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ کر شام واپس چلے گئے۔ اُس وقت مکہ میں یمن کا ایک مہاجر خاندان جُرہُم حکمران تھا، اس خاندان کے لوگ مُوحّد ہو گئے، اسماعیلؑ نے ایک جُرہُمی عورت سے شادی کر لی اور جُرہُم اکابر کے تعاون سے حج اور کعبہ کی نگرانی، توحید کی اشاعت اور مکہ پر حکومت کرنے لگے۔ اسماعیلؑ کی اولاد میں آٹھ نو سو برس بعد مکہ کے ایک معزز گھرانے میں قُصَیّ نامی ایک شخص پیدا ہوا۔ اس وقت مکہ کی حکومت اور کعبہ کی نگرانی یمن کے ایک دوسرے مہاجر خاندان خزاعہ کے ہاتھ میں تھی جس نے جُرہُم کو ان کی مبینہ بدعنوانیوں کے باعث مکہ سے نکال دیا تھا۔ قُصَیّ بلند حوصلہ اور با تدبیر آدمی تھا، وہ کعبہ کا متولی اور مکہ کا حاکم بننا چاہتا تھا، اس کی دلیل تھی کہ چونکہ وہ براہ راست اسماعیل بن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہے اس لئے اسے اور اس کے خاندان کو خُزاعہ کی نسبت تولیت کعبہ اور حکومت مکہ کا زیادہ حق حاصل ہے۔ اُس نے خزاعہ کے خلاف تحریک چلا دی جو پھلنے پھولنے لگی اور اپنے خاندان و قبیلے کے علاوہ آس پاس کے عرب قبائل کی مدد سے خُزاعہ کو مکہ سے نکال دیا اور خود کعبہ کا متولی اور کعبہ کا حاکم ہو گیا۔ قُصَیّ

پہلا عرب تھا جس نے قریش کی عظمت و سربلندی کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اس کا خاندان بنو نضر کہلاتا تھا جس کی کچھ شاخیں مکہ میں اور بیشتر مکہ سے باہر مختلف وادیوں میں بکھری ہوئی تھی۔ بنو نضر کا پیشہ تجارت تھا لیکن اس وقت تک بیرونی ملکوں سے ان کے تجارتی روابط نہیں تھے، نہ دولت و ثروت ان کے پاس زیادہ تھی۔ قصی نے بنو نضر کے سارے پراگندہ خاندانوں کو مکہ میں زمینیں دیکر الگ الگ محلوں میں بسادیا، اس عمل کے بعد بنو نضر کا نام قریش (متحد و مجتمع) پڑ گیا اور قصی کو مُجمّع (متحد کنندہ) کے پُر افتخار لقب سے یاد کیا جانے لگا۔[1] قصی نے دار الندوہ قائم کیا اور اس کا دروازہ خانہ کعبہ کی طرف رکھا، قریشی اکابر سارے اہم معاملات اسی جگہ طے کرتے تھے، جنگ و صلح کے مسائل پر اسی جگہ غور و خوض کیا جاتا تھا، قریش کے تجارتی قافلے یہیں سے روانہ ہوتے تھے، بچوں کی ختنہ یہیں ہوتی تھی، شادی بیاہ کی تقریبات یہیں منعقد ہوتی تھیں، قریشی لڑکیاں جب بالغ ہوتیں تو ان کے بلوغ کا لباس ایک پبلک تقریب کے ساتھ دار الندوہ میں انھیں پہنایا جاتا تھا اور شادی کرنے والے اس موقع پر بیویوں کا انتخاب کر لیتے تھے۔ قصی اپنے کارناموں کے باعث قریش کا ہیرو اور آمر بن گیا، قریشی اکابر اس کی رائے کا ویسا ہی احترام کرتے، جیسا مذہبی احکامات کا کیا جاتا ہے۔ قصی ہر تاجر سے جو مکہ میں داخل ہوتا دس فیصد ٹیکس لیتا تھا، اس نے خانہ کعبہ اور حج سے متعلقہ عہدوں کی از سرِ نو تنظیم کی، زائرین کعبہ اور حاجیوں کے آرام، اپنی اور اپنے قبیلہ کی ناموری اور عربوں کی نظر میں سرخروئی کے لئے اس نے دو نئے ادارے قائم کئے ــــ رِفادہ و سِقایہ، رفادہ کے ماتحت حاجیوں کو حج کے اہم اجتماعات کے موقع پر مفت کھانا کھلایا جاتا تھا اور سِقایہ کے ماتحت مناسک حج کے دوران مفت پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ ان دونوں اداروں کے عظیم مصارف کے لئے قصی خود چندہ دیتا اور قریش کے مالدار لوگوں سے بھی چندہ لیتا تھا۔[2] چندہ مہم کا آغاز قصی نے اس تقریر سے کیا: معشر قریش، آپ لوگ خدا کے

---

[1] ابن سعد (کتاب طبقات الکبیر، بیروت) ۱/۴۸، ۵۰، ۵۳، ۵۴

[2] ایضاً ۱/۶۷-۷۱، ابن ہشام (سیرۃ رسول اللہ، لندن) ص۵۵-۵۸، انساب الاشراف (بلاذری مصر) ۱/۴۹-۵۰

پڑوسی ہیں، اس کے گھر والے اور حرم کے مجاور، حاجی خدا کے مہمان ہیں اور اس کے گھر کے زائر، ہر دوسرے مہمان سے خاطر مدارات کے زیادہ مستحق، اس لئے حج کے دوران ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیجئے — یا معشر قریش، انکم جیران الله و أهل بيته و أهل الحرم و إن الحاج ضيفان الله و زوار بيته و هم أحق الضيف بالكرامة فاجعلوا لهم طعاما و شرابا أيام الحج حتى يصدروا عنكم[1]۔

قُصَیّ کے چار لڑکے تھے۔ عبدالدار، عبدمناف، عبدالعزیٰ، اور عبدقُصَیّ، آخری تینوں نے اپنی وسیع تجارت، دولت، داد و دہش اور صلہ رحمی سے معاشرہ میں خوب وجاہت حاصل کرلی تھی، لیکن سب سے بڑا لڑکا عبدالدار جو قدرتی طور پر کم صلاحیت تھا، سماجی افق پر نہ چمک سکا، اس کی تلافی قصی نے اس طرح کی کہ عبدالدار کو حج، کعبہ اور مشاورتی و فوجی امور سے متعلقہ وہ سارے عہدے دیدئے جن کی نگرانی اعلیٰ خود اس کے ہاتھ میں تھی — رفادہ، سقایہ، حجابہ، لواء اور ندوہ[2]۔

قُصَیّ کی وفات پر اس کا دوسرا لڑکا عبدمناف جو اپنے حسن وجمال کے باعث قمر کہلاتا تھا مکہ کا حاکم اور قریش کا زعیم اعلیٰ ہوا، اس کے چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں، لڑکیاں دولتمند، معزز اور با اثر قرشی اکابر کو بیاہی تھیں، لڑکے سب ہونہار نکلے، چار نے تجارت کو غیر معمولی فروغ دیا اور معاشرہ میں نمایاں وقار حاصل کیا۔ مطلب، ہاشم، عبدشمس اور نوفل۔ اب تک قریش کی تجارت مکہ اور آس پاس کے ہاٹوں تک محدود تھی، بیرونی ملکوں سے ان کے تجارتی تعلقات نہیں تھے۔ دوسری اقوام کے لوگ — فارسی، نبطی اور شامی سامان تجارت لے کر مکہ آجاتے تھے اور قریش ان سے خرید کر مکہ اور قریب کے بازاروں میں جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے

---

[1] ابن سعد ۱/۷۳، انساب الاشراف ۱/۵۲

[2] ابن سعد ۱/۷۳، انساب الاشراف ۱/۵۳، ابن ہشام ص۸۳

رہتے تھے جیسے عکاظ، مجنہ اور ذو مجاز بیچ دیا کرتے تھے[1]۔

تجارت کی ترقی اور رفاہی جذبہ میں ہاشم اپنے سارے بھائیوں سے بازی لے گیا تھا۔ وہ شام گیا، وہاں ہر دن ایک بکری ذبح کرتا اور اس کا سالن (ثرید) پکوا کر آس پاس جو لوگ ہوتے انھیں کھلا دیتا، اس کی فیاضی کے چرچے ہونے لگے، کسی افسر نے بادشاہِ شام قیصر کو ہاشم کی انوکھی ضیافتوں سے مطلع کیا، ہاشم بڑا خوش رو اور متناسب اعضاء جوان تھا، قیصر نے اسے بلا بھیجا، اس کی جسمانی ملاحت اور عمدہ گفتگو سے وہ کافی متاثر ہوا، ایک دن ہاشم نے قیصر سے کہا: میری قوم تجارت پیشہ ہے، اگر آپ انھیں ملک میں تجارت کرنے کی اجازت دیدیں تو وہ حجاز سے اعلیٰ قسم کے چمڑے کا سامان اور عمدہ یمنی کپڑا لا کر آپ کے ملک میں بیچد یا کریں گے جس سے آپ کے ملک کی معیشت کو فائدہ ہوگا۔ قیصر نے اجازت پر مشتمل دستاویز لکھدی[2]۔ ہاشم یہ دستاویز لے کر واپس ہوا اور مکہ۔ شام کی تجارتی شاہراہ پر آباد عرب قبیلوں کے زعیموں سے ملا اور انھیں قیصر کی تحریر دکھا کر کہا کہ اگر تم اپنے اپنے علاقوں میں قریش کے قافلوں کو سلامتی سے گزرنے کی تحریریں لکھ دو تو اس کے بدلہ میں تمھارا سامان بلا اجرت شام کے بازاروں میں لے جا کر بکوا دوں گا اور نفع مع راس المال تمھیں دیدوں گا۔ وہ تیار ہو گئے اور تحریریں لکھدیں۔ ہاشم کے بڑے بھائی مطلب نے یمن کے رئیسوں سے تجارت کے لئے اجازت اور راستے کے قبائلی سرداروں سے قافلوں کی سلامتی کی ضمانت لے لی۔ عبد شمس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے تجارتی پرمٹ لے لیا اور سب سے چھوٹے بھائی نوفل نے شہنشاہ کسریٰ سے عراق میں تجارت کے لئے لائسنس حاصل کر لیا اور عراق۔ مکہ کی راہ پر جو قبیلے آباد تھے ان کے سرداروں سے قافلوں کی سلامتی سے گذرنے کے ضمانت نامے لے لئے[3] اس طرح قریش کے لئے پڑوسی

---

[1] منمق (ابن حبیب، حیدرآباد ہند) صـ ۳۱-۳۲ [2] ایضاً صـ ۳۳

[3] ابن سعد ۱/۷۸، انساب الاشراف ۱/۵۹، منمق صـ ۳۱-۳۲

ملکوں میں تجارت کا ایک نیا اور بڑا وسیع میدان کھل گیا۔ وہ گرمی کے چھ ماہ میں شام کو قافلے لے جاتے تھے اور سردی کے چھ ماہ میں یمن، حبشہ اور عراق کو اور ہر ملک کا سامان ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل کرتے اور بیچ کر خوب نفع کماتے تھے۔

مکہ میں ایک بار بارش کا سخت قحط پڑا، ہاشم شام گیا اور بڑی مقدار میں روٹی پکوائی اور بوریوں میں بھر دا کر مکہ لایا، اونٹ جو روٹی لاد کر لائے تھے ذبح کرا دئے اور ان کے گوشت نیز روٹی کا سالن (ثرید) پکوا کر شہر کے لوگوں کو خوب سیر شکم ہو کر کھلایا، اس کار خیر سے پیدا ہونے والی نیکنامی پر ہاشم کے بھتیجے اُمیہ بن عبد شمس کو رشک ہوا، اُمیہ خود بھی بڑا مالدار تاجر تھا، ہاشم کی نیکنامی اور بڑھتی ہوئی وجاہت کی عمارت ڈھانے کے لئے اس نے بھی اہل مکہ کی ضیافت کی لیکن اس کا کھانا کمیت اور کیفیت دونوں میں ہاشم کے کھانے سے گھٹیا تھا۔ ہاشم کے احباب اور مداحوں نے اُمیہ کے کھانے کا مذاق اڑایا اور اسے بدنام کرنے کی کوشش کی، اُمیہ مشتعل ہو گیا، اس کا دل ہاشم اور اس کے ہوا خواہوں کی طرف سے مکدر ہو گیا، اس نے ہاشم سے کہا: چلو کسی بڑے آدمی کی رائے لیں کہ ہم دونوں میں سے کسے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ اس طرح کا مقابلہ عرف عام میں مُنافرت کہلاتا تھا اور عرب معاشرہ میں ایسے لوگ جو صلہ رحمی، حاجت مندوں کی دستگیری اور عوام کی ضیافت کر کے ایک دوسرے کے حریف ہو جاتے تھے کسی کاہن، رئیس کبیر یا کسی اور بڑی ہستی سے اپنی تحسین و تقدیر کراتے تھے اور اس کے فیصلہ کا احترام کرتے تھے۔ ہاشم نے اپنی بڑھی ہوئی نیکنامی اور سنجیدہ مزاجی کے باعث مُنافرت کے لئے اُمیہ جیسے نو عمر کا مد مقابل بننا مناسب نہ سمجھا لیکن اس کے حامیوں نے جب اسے مجبور کیا تو وہ اس شرط پر تیار ہو گیا کہ ہارنے والا جیتنے والے کو پچاس نیتی اونٹ دے گا اور اسے دس سال کے لئے جلا وطن بھی ہونا پڑے گا۔ امیہ نے دونوں شرطیں مان لیں۔ دونوں ایک کاہن کے پاس گئے۔ اس نے ہاشم کو اُمیہ سے افضل قرار دیا۔ اُمیہ کو پچاس اونٹ دینا پڑے جنھیں ذبح کر کے ہاشم نے اہل مکہ کی ضیافت کی، اُمیہ کو شرط کے

مطابق دس سال تک شام میں جلاوطنی بھی اختیار کرنا پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت سے ہاشم اور اُمیّہ کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور دونوں کے خاندانوں میں رقابت، حسد اور نفسیاتی انحراف کا بیج پڑ گیا۔[1]

جیسے جیسے قریش کی دولتمندی بڑھتی گئی اور اسی تناسب سے ان کی داد و دہش، رفاہی سرگرمیاں اور قبائلی مواخذات میں مالی اعانت بھی، ویسے ویسے ان کے اکابر میں رعونت پیدا ہوتی گئی اور رقابت کا جذبہ شدید تر ہوتا گیا۔ اس رعونت و رقابت کا ایک بڑا مظہر وہ جھگڑا تھا جس نے قُصَیّ کے پوتوں بنو عبد مناف اور بنو عبد الدار کے درمیان سر اٹھایا۔ بنو عبد مناف (مطلب، ہاشم، عبد شمس اور نوفل) نے محسوس کیا کہ تمول اور سماجی سرخروئی میں ہم بنو عبد الدار سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اس لئے ان کی نسبت ہمیں کعبہ، حج، مشاورت اور فوجی امور سے متعلقہ اعلیٰ عہدوں۔ رفادہ، سقایۃ، حجابۃ، لواء اور ندوہ پر فائز ہونے کا زیادہ حق ہے، بنو عبد الدار ان کا یہ حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دو قرشی گھرانوں کے علاوہ جو غیر جانبدار رہے باقی سارے قریش کی دو پارٹیاں ہوگئیں، ایک بنو عبد مناف کے حمایتیوں کی، دوسری بنو عبد الدار کے ہواخواہوں کی۔ بنو عبد مناف کی پارٹی میں یہ خاندان تھے ـــ بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم اور بنو حارث، بنو عبد الدار کی پارٹی میں بنو مخزوم، بنو سہم، بنو جمح اور بنو عدی تھے یہ دسوں خاندان قریب یا دور کے خونی و ازدواجی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے، اس کے باوجود خاندانی اعزاز اور شخصی پندار کے تقاضوں نے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ بنو عبد مناف کی پارٹی نے عہد کیا کہ اگر صلح و آشتی سے ان کے مطالبے نہ مانے گئے اور جنگ تک نوبت پہنچی تو وہ پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ دوسری پارٹی سے لڑیں گے، پارٹی کے سارے اراکین نے یہ عہد کیا اور اسے زیادہ پختہ کرنے کے لئے ایک خوشبودار مرکب گھولا، اس سے ہاتھ رنگے اور کعبہ کی دیواروں پر چھاپ لگا دی، اس عمل کے

---

[1] ابن سعد ۱/۷۶، انساب الاشراف ۱/۵۸

کے باعث ان کا لقب مُطَیَّبُون پڑگیا، دوسری پارٹی کے ارکان نے ذبح کئے ہوئے جانور کے خون میں ہاتھ رنگ کر ان کا نقش کعبہ کی دیوار پر لگا دیا، بعض ارکان نے کچھ خون چاٹ لیا، یہ پارٹی اَحلاف اور لَعَقَۃ الدم کے نام سے مشہور ہوئی۔ دونوں فریقوں نے پہلے مصالحت کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ان کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوگئیں۔ اس نازک وقت میں طرفین کے انجام پر نظر رکھنے والے عناصر کو اپنے اپنے موقف سے ہٹ کر اس سمجھوتہ کے لئے تیار ہونا پڑا کہ رِفادہ اور سِقایہ کے عہدے بنو عبد مناف کو دیدیئے جائیں اور لواء حجابہ اور ندوہ کے مناصب پر بنو عبد الدار فائز رہیں۔[1] اگرچہ پانچ عہدوں میں سے بنو عبد مناف کو دو عہدے ہی ملے تاہم یہ عہدے تھے سب سے زیادہ اعزاز کے حامل، ان پر فائز ہونے والا قریش کا سب سے مالدار و مخیر شخص سمجھا جاتا تھا اور اس کی طرف سے مفت کھانا اور پانی پاکر ہزاروں عرب زائرینِ کعبہ کے دلوں میں اس کی عزت کا نقش بیٹھ جاتا تھا، اس عزت کے بنو عبد مناف بھوکے تھے اور یہ انھیں حاصل ہوگئی۔ عبد مناف کے لڑکوں (مطلب، ہاشم، عبد شمس اور نوفل) نے دونوں عہدوں کے لئے قُرعہ ڈالا، قُرعہ ہاشم کے حق میں نکلا، اس وقت ہاشمی و مطلبی خاندانوں میں ہاشم ہی سب سے زیادہ مستعد، مالدار اور خیر خیرات کرنے والا شخص تھا، ہاشم ایک بڑی رقم رِفادہ اور سِقایہ کے لئے اپنے پاس سے دیا کرتا تھا اور قریش سے بھی چندہ لیتا تھا۔ رِفادہ وسِقایہ کا اعزاز پاکر اس نے ایک تقریر کی جس میں کہا: معشر قریش، آپ خدا کے پڑوسی ہیں اور اس کے گھر والے، موسمِ حج میں زائرین آکر خدا کے گھر کی تعظیم کرتے ہیں اس لئے وہ خدا کے مہمان ہوئے، خدا کا مہمان ہر مہمان سے عزت و احترام کا زیادہ حقدار ہے، خدا نے اپنی مہمانی کے فرائض کے لئے صرف آپ کو منتخب کرکے آپ کی عزت افزائی کی ہے، لہذا مہمانوں کی خاطر تواضع کیجئے جو ہر علاقہ سے لاغر تھکے اونٹوں پر پریشان حال

---

[1] ابن سعد ۱/ ۷۷، ابن ہشام صہ ۸۴، انساب الاشراف ۱/ ۵۵-۵۶

آتے ہیں، گرمی اور عرصہ تک غسل نہ کرنے سے جن کے جسم بودار ہوجاتے ہیں، جن کے کپڑوں میں کھٹمل پڑجاتے ہیں، جن کا زاد راہ ختم ہوجاتا ہے، ان کی ضیافت کیجئے اور پانی پلایئے ـــ یامعشر قریش! إنکم جیران اللہ و أھل بیته و إنه یأتیکم فی ھذا الموسم زوار اللہ یعظمون حرمة بیته فھم ضیف اللہ و أحق الضیف بالکرامة ضیفه و قد خصکم اللہ بذلك و أکرمکم به وحفظ منکم أفضل ما حفظ جار من جاره، فاکرموا ضیفه و زوره یأتون شعثا غبرا من کل بلد علی ضوامر کالقداح قد أزحفوا و تفلوا و قملوا و أرملوا فاقروھم و اسقوھم[1] ہاشم چاہ زمزم کے پاس چمڑے کے حوض بنواتا تھا، کنوؤں سے پانی منگواکر حوضوں کو بھرتا تھا اور حاجیوں کو پانی پلاتا تھا۔ مکہ، منیٰ اور عرفات میں ان کی ضیافت کرتا تھا، ضیافت میں روٹی، گوشت کا سالن (ثرید)، کبھی روٹی اور مکھن کا سالن ہوتا تھا، ستو اور کھجور بھی تقسیم کراتا تھا۔ مکہ سے آٹھ نو میل منیٰ میں بھی ہاشم نے پانی پلانے کا انتظام کیا تھا۔

ہاشم رسول اللہؐ کا پردادا تھا اور اپنے پردادا قصیؔ کی طرح موحد لیکن مورتیوں کی تعظیم بھی کرتا تھا، ہاشم کے چھ بیویوں سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں جو قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں بیاہی تھیں۔ ہاشم کی ایک بیوی سلمیٰ مدینہ کے قبیلۂ خزرج کے ایک رئیس کی بیوہ لڑکی تھی اور ہاشم کی طرح تجارت کرتی تھی، ہاشم نے ایک تجارتی سفر کے دوران مدینہ میں اس سے شادی کرلی اور شادی کے بعد اپنے تجارتی قافلہ کے ساتھ شام چلا گیا، وہاں بمقام غزہ بیمار پڑا اور ایسا کہ جانبر نہ ہوسکا۔ آٹھ نو ماہ بعد ہاشم کی بیوہ کے بطن سے شیبہ نامی ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے عبدالمطلب کے نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ ہاشم کا سب سے زیادہ لائق، ہوشمند اور نامور لڑکا تھا، بڑا قد آور، حسین و جمیل اور اپنے عہد میں مکہ کے مذہبی، قبائلی اور سیاسی افق کا سب سے روشن ستارہ تھا، ہاشم نے وفات کے وقت اپنے بڑے بھائی مطلب کو رفادہ اور سقایہ کے عہدے

---

[1] ابن سعد ۱/۷۸، انساب الاشراف ۱/۸۲-۸۳

سونپ دیئے تھے[1]۔ ایک تجارتی سفر کے دوران مطلب کا یمن کے شہر ردمان میں انتقال ہوگیا، مکہ کی ریاست اعلیٰ اور رفادہ وسقایہ کے عہدوں پر عبدالمطلب جو اس وقت خوب جوان تھے فائز ہوئے۔ عبدالمطلب کے بارے میں عربی آثار و اخبار کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

عبدالمطلب خدا پرست آدمی تھے، ان کی نظر میں ظلم اور بدکرداری گناہ عظیم تھے (کان عبدالمطلب یتألہ ولیعظم الظلم والفجور)۔ عبدالمطلب ہر قرشی سے زیادہ وجیہ، قدآور، بردبار، فیاض اور ہر طرح کے عیوب سے پاک تھے، جو بادشاہ انھیں دیکھتا ان کی عزت کرتا اور ان کی سفارش کو شرف قبول عطا کرتا، وہ آخری دم تک قریش کے زعیم اعلیٰ رہے۔ عبدالمطلب اور ان کا حریف (ابوسفیان کا والد) حرب بن اُمیہ بن عبدشمس منافرت کے لئے حبشہ کے شاہ نجاشی کے پاس گئے، اس نے دونوں کی تثمین و تقدیر کرنے سے انکار کردیا، پھر انھوں نے ایک غیر جانبدار قرشی بزرگ نُفَیل بن عبدالعزیٰ عَدَوی کو ثالث بنایا اور اس سے پوچھا کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ بافضیلت ہے۔ نُفیل نے حرب بن اُمیہ کو مخاطب کرکے کہا: ابوعمرو تم ایسے شخص سے مناقب میں مقابلہ کرنے چلے ہو جو تم سے قد میں لمبا ہے، جس کا سر تمہارے سر سے بڑا ہے، جو تم سے زیادہ شکیل و جمیل ہے، جس میں کمزوریاں تم سے کم ہیں، جس کی اولاد تم سے زیادہ ہے، جو تم سے زیادہ گرانقدر عطیے دیتا ہے اور جسے بات کرنے کا تم سے بہتر سلیقہ ہے۔

یا اباعمرو أتنافر رجلاھو أطول منك قامةً و أعظم منك ھامةً و أوسم وسامةً وأقل منك لامةً و أكثر منك ولدًا و أجزل منك صفدًا و أطول منك مذودًا۔[2]

عبدالمطلب توحید کے قائل تھے، عہد و پیمان کا پاس کرتے تھے، انھوں نے ایسے ضابطے وضع کیے جن میں سے بیشتر کا قرآن نے حکم دیا ہے اور جن پر رسول اللہؐ عمل کرتے تھے۔ مثلاً

---

[1] ابن سعد ۱/ ۶۸، ۶۹

[2] ایضاً ۱/ ۸۵، ۸۷، انساب الاشراف ۱/ ۷۳

عہد و پیمان کی پابندی، دیت میں دس کی جگہ سو اونٹ ادا کرنا، ذو محرم سے نکاح کی ممانعت، گھروں میں پچھلے دروازوں سے داخل ہونے کی ممانعت، چور کا ہاتھ کاٹنا، بچیوں کو افلاس یا شادی کے عار سے قتل کرنے کی ممانعت، مُباہلہ کرنا، تحریم شراب وزنا، حدزنا، قرعہ اندازی، ننگے بدن خانہ کعبہ کے طواف کی ممانعت[1]۔

عبدالمطلب نے چھ شادیاں کیں، اُن کے ڈیڑھ درجن بچے تھے، بارہ لڑکے چھ لڑکیاں[2]۔ عبدالمطلب کی طرح ان کے سارے لڑکے تنآور، خوبصورت، گورے اور ستوان ناک تھے اور سب کو معاشرہ میں عزت ورسوخ حاصل تھا۔

مکہ اور اس کے آس پاس کئی برس تک بارش نہیں ہوئی، پانی اور چارہ کی قلت کے باعث بہت سے مویشی ہلاک ہوگئے۔ ہاشم کی پوتی اور عبدالمطلب کی بھتیجی رُقیقہ نے خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ ایک ایسا شخص منتخب کرو جس کا حسب نسب اچھا ہو، قد لمبا، رنگ گورا، بھویں جُڑی ہوئی، پلکیں لمبی، بال گھنگرالے، گلے چکنے، ناک تپلی، یہ شخص اپنے لڑکوں اور شہر کے ہر خاندان کے ایک مرد کے ساتھ پاک وصاف ہوکر ابوقبیس پہاڑی پر کھڑا ہوکر استسقار کی دعار مانگے۔ عبدالمطلب میں مذکورہ صفات موجود تھیں، وہ مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت کے ساتھ ابوقُبیس پر چڑھ گئے اور یہ دعار مانگی: مالک، یہ تیرے غلام اور غلاموں کے غلام ہیں، تیری کنیزیں اور کنیزوں کی بچیاں، ہم جس مصیبت میں مبتلا ہیں تو اس سے واقف ہے، بارش کے مسلسل قحط سے چوپائے اور مویشی ہلاک ہوگئے اور انسانوں کی جان پر بن آئی ہے، مالک قحط دور کردے اور مینہ برسادے۔ لاھُمّ ھولاء عبیداك وبنو عبیدك وإماؤك وبنات إمائك وقد نزل بنا ما ترى وتتابعت علينا هذه السنون فذهبت بالظلف

---

[1] یعقوبی (تاریخ، بیروت) ۲/۱۰-۱۱

[2] ابن سعد ۱/۹۲-۹۳

والخف و أشفقت علی الانفس نأذہب عنا الجدب وأتتنا بالحیا والخصب[۱]۔ ذرا دیر بعد اتنی بارش ہوئی کہ وادیاں بہنے لگیں۔

مخرمہ بن نوفل: عبدالمطلب کے انتقال کے وقت میں بیس سال کا تھا، میری ماں رقیقہ بنت ابوصیفی بن ہاشم نے مجھ سے کہا: بیٹے، نانا کے غم میں قمیص پھاڑ ڈالو، اب کس کے لئے اسے محفوظ رکھنا ہے۔ میں نے دیکھا کہ عبدمناف کی عورتوں نے (عبدالمطلب کے سوگ میں) اپنے بال کاٹ ڈالے ہیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر اسی نوے کے درمیان بتائی جاتی تھی، ان کا قد بالکل سیدھا تھا، وہ پہلے شخص تھے جو غارِ حرا میں عبادت کے لئے جاتے تھے (کان اول من تحنث بحراء)، جب رمضان کا چاند نکلتا تو وہ غارِ حرا میں داخل ہو جاتے اور مہینہ ختم کرکے نکلتے، (غارِ حرا میں) غریبوں کو کھانا کھلاتے، کعبہ کا بکثرت طواف کرتے، مکہ میں ظلم وستم انھیں سخت ناپسند تھا[۲]۔

رسول اللہؐ کی ولادت کے وقت قریش

چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں حجاز کے عرب قبائل میں قریش کا قبیلہ سب سے زیادہ متمدن تھا، خانہ بدوش عربوں کے برخلاف جو سال کے بیشتر حصہ میں گھاس اور پانی کی تلاش میں صحرا نوردی کیا کرتے تھے قریش کی بود و باش ایک میدانی شہر میں تھی جس کا نام مکہ تھا، بکریاں اور اونٹ پالنے کے مروجہ عرب پیشہ کی بجائے وہ تجارت کرتے تھے، پرچون اور تھوک دونوں۔ پرچون تجارت کم استطاعت قریشی کرتے تھے، تھوک تجارت متمول اور سرمایہ دار لوگ، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تجارت کرتی تھیں، کچھ خود بیچتی تھیں اور کچھ اجرت پر کارندوں سے خرید و فروخت

---

[۱] ابن سعد ۱/۸۹-۹۰، انساب الاشراف ۱/۸۲-۸۳
[۲] انساب الاشراف ۱/۸۴

کرائی تھیں۔ قریش میں لکھنے پڑھنے کا بھی رواج تھا، متوسط اور اعلیٰ درجہ کے قرشی تاجر بالعموم اپنا حساب کتاب رکھنے اور خط وکتابت کرنے کی حد تک لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کے بعض افراد جیسے وَرَقہ بن نوفل اور نضر بن حارث عبرانی، سریانی اور فارسی زبانوں سے بھی واقف تھے اور انجیل، توراۃ، زَبُور اور اَوَستا کا مطالعہ کرتے تھے۔ قریش کی تمدنی ترقی کے دو سبب تھے: ایک خانہ کعبہ اور متعلقہ اداروں کی تولیت اور دوسرا بیرونی متمدن ملکوں سے تجارتی روابط۔ خانہ کعبہ توحید کا قدیم مرکز تھا جسے تین ہزار برس پہلے پیغمبر ابراہیمؑ نے قائم کیا تھا، ابراہیمؑ کے لڑکے اسماعیلؑ کے بعد ان کے جانشینوں کی معرفت مکہ کی مٹی میں بعض اہم اخلاقی و انسانی قدریں جڑ پکڑ گئی تھیں۔ رِفادہ اور سقایہ کے اداروں کی عظیم مالی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک طرف قریش میں تجارت کے ذریعہ دولت کمانے کا داعیہ پیدا ہوا تو دوسری طرف اس اعزاز و وجاہت کے شایانِ شان زندگی بسر کرنے کی اہمیت کا احساس بیدار رہا جو مفت کھانا کھلانے اور پانی پلانے سے ہزاروں عربوں کی نظر میں انھیں حاصل ہوگئی تھی، اس احساس کے ماتحت وہ گھٹیا، نازیبا اور رسواکن کاموں سے بالعموم احتراز کرتے تھے۔ دارالندوہ نے ان میں سماجی شعور اور جنگ و تشدد کی بجائے حتی الامکان مشورہ کے ذریعہ خاندانی، قبائلی اور بین القبائلی معاملات طے کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ وہ پڑوس کے ان چار ملکوں میں تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے۔ عراق، شام، یمن اور حبشہ۔ یہاں کی متمدن ہوا میں سانس لینے، مدنیت کے مظاہر دیکھنے، عیسائی، یہودی اور صابئی مذاہب کے لوگوں سے میل جول، علماء اور مذہبی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کرنے، مالدار تاجروں سے خلط ملط رکھنے، رسم و رواج سیاست و معاشرت کی جھلکیاں دیکھنے سے ان کی ذہنی سطح بلند ہوگئی تھی، انھوں نے ان ملکوں کے ایسے طور وطریق اختیار کرلئے تھے جن پر عربی ماحول میں عمل کرنا ممکن تھا۔

قریش میں نہ ملوکیت تھی نہ آمریت، ان کے دس بارہ ممتاز خاندان تھے جن کے اکابر نے اپنی دولتمندی اور صلہ رحمی سے اپنے خاندانوں میں اعزاز و رسوخ حاصل کرلیا تھا۔

یہ اکابر دار الندوہ میں بیٹھ کر خاندانی، قبائلی اور بین القبائلی مسائل پر گفتگو کر کے فیصلے کیا کرتے تھے، فیصلے متفقہ یا اکثریت کی رائے سے ہوتے تھے۔ ہر خاندان کو اکثریت کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق تھا، اس صورت میں بالعموم اس کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی جاتی تھی البتہ وہ ہدفِ ملامت بن جاتا تھا۔ قبیلہ میں نسبی شرافت کے بعد عزت و رسوخ حاصل کرنے کے دو طریقے تھے: دولتمندی اور دولت کو اپنے کنبہ کے علاوہ دوسرے ضرورتمندوں، بھوکوں، قحط زدوں، قرض داروں، رفاہی کاموں اور ہنگامی مالی مواخذات پر خرچ کرنا۔ چونکہ سب خاندانوں کی دولت اور داد و دہش یکساں نہ تھی اس لئے قبیلہ میں سب کی عزت و رسوخ بھی یکساں نہ تھا۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں سب سے زیادہ دولتمند اور داد و دہش کرنے والے خاندان تین تھے، بنو ہاشم و مطلب، بنو اُمیہ اور بنو مخزوم۔ بنو ہاشم و مطلب کے خاندان میں رفادہ و سقایہ کے ادارے بھی تھے اس لئے انھیں قبیلہ سے باہر سارے ملک کے عربوں میں بھی عزت و وجاہت حاصل تھی، اس وجاہت نے ان کی مقامی عزت و وقار میں چار چاند لگا دئے تھے اور سارے قرشی خاندانوں میں انھیں ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اکثر قرشی خاندانوں اور بالخصوص ان تینوں میں دولت بڑھانے اور اسے اعانتی کاموں میں خرچ کر کے معاشرہ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عزت و رسوخ حاصل کرنے کا مقابلہ رہتا تھا۔ کم عزت اور کم دولت خاندان زیادہ دولتمند اور زیادہ معزز خاندانوں پر رشک کرتے تھے جس میں حسد کی بھی چاشنی ہوتی تھی لیکن وہ لڑتے نہ تھے، لڑائی کی جگہ ان خاندانوں یا ان کے افراد میں منافرت نے لے لی تھی۔ جب دو خاندانوں کے دو ممتاز فرد معاشرہ میں اپنی دولتمندی، اعلیٰ نسب، داد و دہش اور نیکنامی کے باعث سمجھتے کہ ہم دوسرے سے بہتر ہیں تو وہ کسی کاہن، کسی عظیم ہستی یا بھروسہ کے آدمی کو ثالث بنا کر اس سے اپنی تثمین و تقدیر کراتے تھے۔ اس طرح کی تثمین و تقدیر کرانے والے قرشی افراد و خاندانوں کے چند نام یہ ہیں: ہاشم و اُمیہ بن عبد شمس، عبد المطلب اور حرب بن اُمیہ، عائذ بن عبد اللہ مخزومی اور حارث بن اسد بن عبد العزیٰ، خاندان

قُصَیّ اور خاندان مخزوم، خاندان مخزوم اور خاندان اُمیّہ۔[1]

اکابر قریش نہ خود لڑتے تھے نہ پڑوس کے عرب قبیلوں میں لوٹ مار کرتے تھے جیسا کہ دوسرے بہت سے قبیلے قحط، ناداری یا انتقامی جذبہ کے ماتحت کیا کرتے تھے، قریش حتی الامکان خون ریزی سے بچتے اور بد امنی کی فضا پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ مکہ کے باہر مشرق میں دور تک بہت سے چھوٹے بڑے قبیلے آباد تھے، قریش کے مُورث اعلیٰ اسماعیلؑ کی اولاد میں جیسے کِنانہ، نضر بن کنانہ، اسد بن کنانہ، دِلیش، احابیش، مالک بن نضر، فہر بن مالک، مُحارب بن فہر، لُوّیّ بن غالب، کعب بن لوی، اور مُرّہ بن کعب۔ ان قبیلوں کے پڑوس میں غیر اسماعیلی نسل کے متعدد قبیلے آباد، اسماعیلی وغیر اسماعیلی قبیلوں میں گاہے گاہے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے، کبھی اسماعیلی قبیلہ کا کوئی شخص غیر اسماعیلی قبیلہ کے کسی فرد کو طیش میں آکر یا کسی بد عنوانی پر مار ڈالتا تھا اور کبھی غیر اسماعیلی قبیلہ کا کوئی آدمی اسماعیلی قبیلہ کے آدمی کے ساتھ اسی طرح کی کوئی حرکت کر بیٹھتا تھا جس کے نتیجہ میں دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی تھی۔ اسماعیلی قبیلوں نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے، اپنی دفاع موثر بنانے اور غیر اسماعیلی قبیلوں کے جارحانہ رجحانات کی روک تھام کے لئے قریش اکابر سے باہمی مدد کے معاہدے کر لئے تھے جنھیں عرف عام میں حِلف کہتے تھے اور حِلف کرنے والوں کو حلیف۔ اگر ایک حلیف پر کوئی پڑوسی قبیلہ دست درازی کرتا تو دوسرے حلیف پر اس کی مدافعت کرنا لازم تھا۔ قریش نے ایسے غیر اسماعیلی قبیلوں سے بھی باہمی مدد کے معاہدے کر لئے تھے جو ایک زمانہ میں مکہ کے حکمران اور کعبہ کے متولی رہے تھے، جنھیں بعد میں قریش کے پہلے حاکم قُصَیّ نے مکہ سے نکال دیا تھا یا جو ناساعد حالات سے مجبور ہو کر خود مکہ چھوڑ کر آس پاس کی وادیوں میں بس گئے تھے جیسے خُزاعہ کی شاخیں۔ یہ حلیف قبیلے جنگ کی لپیٹ میں آکر قریش اکابر سے مدد مانگتے تو معاہدوں کے تحت انھیں مدد کرنا پڑتی لیکن ان کی

---

[1] منمق ص ۹۴، ۹۸، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۴

مد بیشتر ہتھیار، گھوڑوں اور اونٹ یا ان تینوں کی فراہمی کے لئے روپیہ کی شکل میں ہوتی، قریش خود جنگ و قتال میں نہ تو ماہر تھے نہ پیسے کو جان پر قربان کرنا پسند کرتے تھے، وہ مصالحت کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاکر لڑائی بند کرادیتے تھے۔ رسول اللہؐ کے بچپن سے ہجرت تک چالیس پچاس سال کے عرصہ میں قریشی اکابر نے کئی بار اپنے حلیف قبیلوں کی مدد کی جب پڑوسی قبیلے ان سے متصادم ہوئے۔ ان میں سے دو جنگوں نخلہ اور شمطہ میں رسول اللہؐ خود بھی اپنے چچاؤں کے ساتھ شریک ہوئے تھے[1] ان دونوں میں فریقین کے دو سو سے زائد آدمی ہلاک ہوئے لیکن باقی لڑائیاں معمولی جھڑپوں تک محدود رہیں، ان معرکوں میں جو ایام الفجار کے نام سے مشہور ہیں قریشی اکابر نے جنگ کے دواعی دور کرنے، مقتولین کی دیت ادا کرنے اور فریق مخالف کی تالیف قلب کرکے جنگ ختم کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔ بیرونی قبیلوں کے علاوہ قریش نے اپنے خاندانوں سے بھی متعدد حلف کئے تھے جن میں سے حلف فضول کو خاص اہمیت حاصل تھی، یہ حلف ظلم وحق تلفی کا سدباب کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ اس کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ایک قریشی نے کسی یمنی تاجر کا سامان خریدا اور قیمت ایک مقررہ وقت پر ادا کرنے کا وعدہ کرلیا لیکن وعدہ وفا نہ کیا، جب یمنی تاجر کے سارے تقاضے بے سود ثابت ہوئے تو اس نے ایک ہاٹ میں برملا شکایت کی۔ قریشی اکابر نے جو ہاٹ میں بسلسلہ تجارت آئے ہوئے تھے بہت خفیف ہوئے اور ظلم و بدمعاملگی کی روک تھام کے لئے خاندان ہاشم و مطلب، خاندان زہرہ اور خاندان تیم کے اکابر ایک قریشی رئیس عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور معاہدہ کیا کہ اگر مکہ میں کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و بے انصافی کرے گا تو معاہدہ کرنے والے سارے خاندان اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مظلوم کا ظالم سے حق دلوادیں گے[2]

---

[1] انساب الاشراف ۱/ ۱۰۰، ۱۰۲

[2] سنن ص۱۹۵، ۲۰۶، ابن سعد ۱/ ۱۲۸، ۱۲۹، یعقوبی ۲/ ۱۷

قریش موحد تھے لیکن ان کا سواد اعظم مخصوص مورتیوں ۔ لات، عزیٰ، مناف اور ہُبل کی تعظیم کرتا تھا، اُن کا عقیدہ تھا جیسا کہ متعدد قدیم تہذیب یافتہ اقوام، یونانیوں، ہندوؤں اور صابئہ کا تھا کہ مورتیاں خدا کی مقرب ہستیاں ہیں جن کی اگر تعظیم کی جائے، خوش رکھا جائے، جنھیں نیازمندی دکھائی جائے، جن پر قربانیاں کی جائیں تو وہ خدا سے سفارش کر کے حاجتمندوں کی حاجتیں پوری کرا دیتی ہیں اور ان کے کاموں میں برکت پیدا کرتی ہیں۔ قریش کے آباؤ اجداد میں مورتیاں رائج کرنے والا پہلا شخص عمرو بن لُحَیّ خِندِفی تھا، اسماعیل کی اولاد میں، قریش کے پہلے حاکم قُصی سے بارہ پشتیں قبل۔ قریش میں ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے رہے جو خالص موحد تھے، جو دربار خداوندی میں بتوں کے مقرب ہونے اور ان کی معرفت خدا سے سفارش کا عقیدہ باطل قرار دیتے تھے، جو مورتیوں کو پتھر کے ڈھانچہ سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے اور اُن لوگوں کو سادہ لوح، کج فہم اور گرفتارِ توہم سمجھتے تھے جو بتوں کی تعظیم کرتے تھے، یہ لوگ خود کو حنیف اور دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں:

۱۔ ابوکبشہ (وجز بن غالب) رسول اللہؐ کی پرنانی کا باپ، یہ مورتیوں اور ان کی تعظیم کرنے والوں کی مذمت کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے بعض قرشی اکابر رسول اللہؐ کا مذاق اڑانے کے لئے انھیں ابوکبشہ کہا کرتے تھے[1]۔

۲۔ عثمان بن حُویرث بن عبدالعزی بن قُصَیّ۔ رسول اللہؐ کا ہمعصر[2]۔

۳۔ وَرَقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزی بن قُصَیّ۔ خدیجہؓ کا چچا زاد بھائی اور رسول اللہؐ کا ہمعصر[3]۔

---

[1] انساب الاشراف ۱/۹۱

[2] منمق ص ۱۷۵

[3] ایضاً ص ۱۷۶، اغانی ۳/۱۴۱

۴۔ عبیداللہ بن جحش بن رئاب اسدی۔ رسول اللہ کا ہمعصر[1]۔

۵۔ زید بن عمرو بن نُفیل بن عبدالعزیٰ عَدوِی۔ عمر فاروقؓ کا چچازاد بھائی۔ عربی اخبار و آثار میں زید کے بارے میں یہ تصریح ملتی ہے : زید نے بتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا، صحیح مذہب کی تلاش میں شام آیا، یہود و نصاریٰ سے گفتگو کی لیکن ان کے مذہب سے مطمئن نہیں ہوا اس نے مردہ، خون اور مورتیوں پر قربانی کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میں ابراہیمؑ کے رب کی عبادت کرتا ہوں، وہ ملت ابراہیمی کا پیرو تھا، ایک شخص نے دیکھا کہ زوال آفتاب کے بعد زید نے کعبہ کا رخ کرکے ایک رکعت نماز پڑھی اور دو سجدے کئے، وہ حج کرتا اور عرفہ میں کھڑے ہو کر کہتا ـــ لبّیك لا شریك لك ولا نِدَ، پھر عرفہ سے چلتے وقت کہتا : لَبّیك متعبداً امرقوقاً۔ زید اُن لڑکیوں کا کفیل ہو جاتا تھا جنھیں ان کے والدین ناداری سے بچنے کے لئے زندہ درگور کرنے کے درپئے ہوتے تھے اور وہ جب بڑی ہو جاتیں تو ان کے والدین سے کہتا : لڑکیوں کو لے لو یا میرے پاس چھوڑ دو۔ عبداللہ بن عمر ـــ اعلانِ نبوت سے پہلے رسول اللہؐ زیرین بلدح میں زید سے ملے اور اسے زادِ راہ پیش کیا جس میں گوشت بھی تھا، زید نے یہ کہکر گوشت کھانے سے انکار کر دیا کہ میں ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا جسے خدا کے نام پر ذبح کرنے کی بجائے مورتیوں پر ذبح کیا گیا ہو[2]۔

چند ممتاز قریشی موحد

۱۔ اُمیّہ بن ابی الصلت ثقفی۔ توحید خالص کا قائل تھا، ملت ابراہیمی کی تلاش میں اس نے شام کا دورہ کیا تھا، ایک اطلاع کے مطابق وہ خود نبی بننا چاہتا تھا اور اس کے لئے مناسب

---

[1] منتق ص۱۷۶

[2] ابن سعد ۳۸۱-۳۷۹/۲

موقع کا منتظر تھا کہ رسول اللہؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کردیا۔ اُمیہ شاعر بھی تھا اور اپنے کلام میں گرمجوشی کے ساتھ توحیدی خیالات کی ترجمانی کرتا تھا، اس کے بہت سے شعر عربی لٹریچر میں محفوظ ہیں، اس کا کلام سن کر رسول اللہؐ بہت محظوظ ہوتے تھے[۱]۔

۲۔ اسعد بن زُرارہ۔ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا مالدار زعیم، موحد اور رسول اللہؐ کا ہمعصر[۲]

۳۔ ابوقیس صرمۃ نجاری۔ قبیلہ خزرج کا ایک خداپرست زاہد اور رسول اللہؐ کا ہمعصر[۳]۔

۴۔ ابوعامر راہب (عبدعمرو بن صیفی) اوس کا بااثر لیڈر، موحد اور رسول اللہؐ کا ہمعصر[۴]۔

۵۔ ابوھیثم مالک بن تیہان۔ قبیلہ اوس کا سردار، موحد اور رسول اللہؐ کا ہمعصر[۵]۔

(باقی آیندہ)

---

[۱] اغانی (ابوالفرج اِصفہانی مصر) ۲/۱۸۷

[۲] ابن سعد ۳/۴۴۸

[۳] ابن ہشام ص ۳۴۸

[۴] سمہودی (وفاء الوفاء مصر) ۱/۲۵۷، دیاربکری (تاریخ الخمیس مصر) ۲/۱۲۳، انساب الاشراف ۱/۲۸۱-۲۸۲

[۵] ابن سعد ۳/۴۴۸

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
تقسیم کے بعد
(۱۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ساتھ ملک آزاد ہوا تو اب یونیورسٹی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تقسیم کو جس اصول اور جن وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ منظور کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں ۳ جون ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ہاں کی اقلیتوں کے بارہ میں جو کچھ فرمایا تھا اگر اس پر عمل کیا جاتا تو بات ہی کچھ نہ تھی، جس طرح ملک کی دوسری یونیورسٹیاں تھیں ایک یہ یونیورسٹی بھی تھی۔ ان کی ہیئتِ ترکیبی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس یونیورسٹی پر بھی نہ ہوتا، لیکن تقسیم سے پہلے جو شدید فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اور جس کے نتیجہ میں سرحد کے اُدھر اِدھر جو سیلابِ اشک وخون متلاطم ہوا اس نے یونیورسٹی کے نفسِ وجود کو معرضِ خطر میں ڈال دیا۔ تقسیم کے وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب مرحوم تھے جو مسلم لیگ کے بھی ایک نہایت اہم اور باوقار سربراہ تھے۔ اگر حالات نارمل ہوتے تو کوئی ضرورت نہ تھی کہ موصوف کو تقسیم کے بعد ان کا ٹرم ختم ہونے سے پہلے وائس چانسلر کے عہدہ سے سبکدوش کیا جاتا، لیکن حالات ایسے تھے کہ موصوف نے خود اس عہدہ پر قائم رہنا پسند نہیں کیا اور وہ الگ ہوگئے۔ ان کے بعد پنڈت جواہرلال

نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی متفقہ رائے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس عہدہ کے لئے منتخب ہوئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت اِس سے بہتر کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر صاحب ہندوستان کی ایک نہایت باوقار، معزز اور محترم شخصیت تھے، ان کو حکومت اور اکثریت اور مسلمانوں سب کا اعتماد حاصل تھا، ان کی لیاقت و قابلیت، ان کا تعلیمی تجربہ، ان کی اخلاقی سربلندی اور عظمت، ان کی جرأت حق گوئی و حق کوشی، ایک اعلیٰ مقصد کے لئے غیر معمولی ایثار و قربانی، ان کی سادہ اور بے لوث زندگی، یہ سب چیزیں روزِ روشن کی طرح ہر شخص پر عیاں تھیں، اس بنا پر جب وہ وائس چانسلر منتخب ہوئے تو ملک میں ہر طرف اس پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے سپرد جو ذمہ داری کی گئی تھی وہ وقت کی ایک نہایت اہم، نازک مگر سخت دشوار اور مشکل ذمہ داری تھی، اس ذمہ داری سے باحسن وجوہ وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو دل میں سوز رکھتا ہو اور روشن دماغی کے ساتھ جس کی نظر بھی پاک ہو۔ اور ڈاکٹر صاحب میں ان اوصاف کی کمی نہیں تھی، مرحوم کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول (یادوں کی دنیا ص ۱۴۱) مرحوم کو شروع میں علی گڑھ جانے میں پس و پیش تھا، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار پر وہاں جانے پر رضامند ہو گئے اور انھوں نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری سنبھال لی۔

ڈاکٹر صاحب یہاں کم و بیش آٹھ برس رہے، ان کے اس عہد کا یقیناً یہ بڑا کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی کے نفسِ وجود کو ہی جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا، یونیورسٹی اس خطرہ سے نہ صرف یہ کہ محفوظ رہی، بلکہ جہاں تک تعلیمی اور انتظامی شعبوں کا تعلق ہے ان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی اور وہ ملک کی دوسری اعلیٰ ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی، ڈاکٹر صاحب کو یقیناً اس بات کا بھی کریڈٹ ملنا چاہیئے کہ اس مدت میں انھوں نے کبھی اس امر

کو فراموش نہیں کیا کہ وہ کسی عام یونیورسٹی کے نہیں، بلکہ "مسلم یونیورسٹی" کے وائس چانسلر ہیں، چنانچہ نواب زادہ لیاقت علی خاں جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے ان کی وفات پر طلبا نے اپنی یونین کی دیرینہ ضابطہ کے ماتحت جب یونیورسٹی کا سائرن بجا دیا اور اس پر ہندو فرقہ وارانہ اخبارات نے یونیورسٹی پر گندگی اچھالی تو ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر یونیورسٹی کے دفاع میں ایک ایسا پرزور بیان شائع کیا کہ ان اخبارات کے دانت کھٹے ہو گئے۔ لوگوں کا عام تاثر یہ ہے کہ یہ بیان ایسا ہی دندان شکن تھا جیسا کہ مولانا آزاد کی پارلیمنٹ میں وہ اہم تاریخی تقریر تھی جو انھوں نے ٹنڈن جی کی ایک تقریر کے جواب میں کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ میں قدم رکھا (اکتوبر ۱۹۴۸ء) تو اس وقت عالم یہ تھا کہ یونیورسٹی کے نامور اور دیرینہ اساتذہ کی ایک خاصی تعداد پاکستان جا چکی تھی، بچے کھچے جو یہاں تھے ان میں بھی متعدد اساتذہ جانے کے لئے پر تول رہے تھے، علاوہ ازیں ملک کے اور دوسرے علاقوں کا حال بھی یہی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہندوستان میں خال خال رہ گئے تھے، بیرونی ممالک میں جو مسلمان اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے ان سے توقع نہ تھی کہ وہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن کا رخ کریں گے، اس لئے اس وقت سب سے بڑا اہم سوال یہ تھا کہ یونیورسٹی میں پروفیسروں اور ریڈروں کی جو جگہیں عنقریب خالی ہونے والی ہیں، ان کا بندوبست کیا ہوگا؟ تعلیم اور علاجِ امراض ان دونوں میں فرقہ واریت کے کوئی معنیٰ نہیں ہیں، اس بنا پر اس سوال کا ایک صاف اور سیدھا سا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں ہی نہیں تو یونیورسٹی میں پروفیسر یا ریڈر اور لکچرر کی جو جگہ بھی خالی ہو اس پر بے تکلف کسی مستحق غیر مسلم کا تقرر ہو جانا چاہیئے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ کسی شخص یا قوم کے جذبات اور اس کے نفسانی احساسات ہمیشہ منطق اور فلسفہ کے تابع نہیں ہوتے، اس بنا پر مسلم یونیورسٹی اگر اعلیٰ درجہ کے مسلمان اساتذہ سے خالی ہو گئی تو اس کا یونیورسٹی کی ہیئتِ انتظامیہ اور خود مسلمانوں کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑے گا،

ان وجوہ کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے اسٹڈی لیو (Study Leave) یعنی رخصت برائے تکمیل تعلیم کے قواعد وضوابط میں بہت کچھ ردوبدل کیا اور مختلف فیکلٹیز میں جو لائق وقابل اور ہونہار نوجوان اساتذہ تھے ان کو آمادہ کیا کہ وہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی تکمیل کریں اور وہاں اپنے مضمون میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری لیکر علی گڑھ واپس آئیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریص وترغیب پر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس پر آمادہ ہوگئی اور موصوف نے ان لوگوں کے لئے ملک کے اندر اور باہر ہر قسم کی سہولتوں اور مالی امداد کا بندوبست کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے سخت صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات کے پیش نظر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ اس درجہ اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب نے یہ کارنامہ انجام دیکر اس حیثیت سے یونیورسٹی کے مسلم کردار کو تباہ ہونے سے بچالیا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

چنانچہ آج آپ دیکھ لیجئے! عربی، فارسی، اردو اور دینیات کا تو کہنا ہی کیا ہے یہ شعبے تو مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں، آرٹس، سوشل سائنسیز، سائنس، کامرس، قانون، انجینرنگ ان سب فیکلٹیوں میں اور پالی ٹکنک اور زنانہ کالج میں آپ کو مسلمان پروفیسروں کی جو اکثریت نظر آتی اور سب ہی فیکلٹیوں کے ڈین جو مسلمان دکھائی دیتے ہیں تو یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کی ہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری کی دین ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے جو داغ بیل ڈالی تھی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان کے جانشینوں نے اس کو آگے بڑھایا، ترقی دی اور پروان چڑھایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج علم وفن کا کوئی شعبہ یونیورسٹی میں ایسا نہیں ہے جس میں یورپ اور امریکہ وغیرہ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والے مسلمان اساتذہ کثرت سے موجود نہ ہوں، اور جو اگر لکچرر ہیں تو ریڈر کی اور ریڈر ہیں تو

پروفیسر کی جگہ پر مقرر ہونے کا استحقاق نہ رکھتے ہوں۔

یونیورسٹی کے "مسلم کردار" کے سلسلہ میں اس اہم کارنامہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے تین اہم ریسرچ اسکیمیں جو لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کی تھیں حکومت سے منظور کرائیں، ان میں ایک مشرق وسطیٰ پر ریسرچ کی، ایک اسلامیات پر ریسرچ کی، اور ایک اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم تھی، حکومت نے اس سلسلہ میں جس فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی اسلامی ملک بھی اس سے زیادہ اور کیا کرے گا، یہ دوسری بات ہے کہ آخری دو اسکیموں پر جو کام ہوا ہے وہ مجموعی اعتبار سے یونیورسٹی کی نیک نامی نہیں بلکہ اس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث ہوا ہے، لیکن یہ قصور ان لوگوں کا ہے جن کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، اس میں گورنمنٹ یا ڈاکٹر صاحب کا کیا قصور؟ ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ پہونچے ہیں تو اس وقت یونیورسٹی کا بجٹ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ لیکن آٹھ سال کے بعد جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو بجٹ پچاس لاکھ سالانہ تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس مختصر مدت میں ہی یونیورسٹی کے کاموں میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے[1] لیکن جمالیات کا ذوق فطری تھا اور پھول پھلواری کا انھیں بڑا شوق تھا، اس کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے پوری

---

[1] جب جامعہ قرول باغ میں تھی، ہمارا دفتر برہان بھی وہیں تھا، اس لئے ہم لوگ اکثر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر اور ڈاکٹر صاحب بھی کبھی دفتر برہان میں اور کبھی ہمارے مکان پر آتے جاتے رہتے تھے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن کس قدر سادہ تھا! اس زمانہ میں اس کا باور کرنا بھی شاید مشکل ہو۔ ایک تخت جس پر کھدر کی چادر بچھی ہوتی تھی، دو چار مونڈھے، بس شیخ الجامعہ کے ڈرائنگ روم کی کل کائنات تھی، چائے آتی تھی تو ہندستان کی بنی ہوئی پیالیوں میں اور وہ بھی اس طرح کہ کبھی اس کے ساتھ بسکٹ یا دال سیو آگئے تو آگئے ورنہ صرف چائے، اس زمانہ میں پیدل پھرنا۔ یکہ، تانگہ اور ٹراموے میں سفر کرنا ڈاکٹر صاحب کیلئے روزمرہ کی بات تھی۔

یونیورسٹی کی چمن بندی کر کے اس کو لالہ زار بنا دیا۔ غرض کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہی کے سخت نازک دور میں مسلم یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی، بلکہ اس نے صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے جو غیر معمولی ترقی کی وہ جہاں ایک طرف گورنمنٹ کی کشادہ دلی اور فیاضی کی دلیل ہے تو دوسری جانب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیدار مغزی، روشن دماغی اور ان کے عزم و خلوص کا بھی روشن ثبوت ہے۔

۱۹۵۱ء کا ایکٹ

ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بجائے ایک نیا ایکٹ بنا جو ۱۹۵۱ء مسلم یونیورسٹی امنڈمنٹ کہلاتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے ۲۰ء کے ایکٹ کی متعدد دفعات بدل گئیں، مثلاً ۲۰ء ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی کورٹ کی ممبر شپ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی اب اس کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھول دیا گیا۔ پہلے وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ کے ممبر کرتے تھے اب یہ قرار پایا کہ اگزکٹو کونسل تین اشخاص پر مشتمل ایک پینل بنائے گی اور صدر جو اپنے عہدہ کے اعتبار سے یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے وہ ان تین میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کو وائس چانسلر بنائیں گے، ۲۰ء کے ایکٹ میں دینیات کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری تھی۔ اب دینیات کو لازمی مضامین میں سے ایک مضمون بنایا گیا، یعنی اگر کوئی مسلمان طالب علم چاہے تو وہ دینیات کے علاوہ اس کا ایک متبادل مضمون بھی اختیار کر سکتا ہے، علاوہ اور چھوٹی بڑی تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن اہم اور بنیادی تبدیلیاں یہی تھیں۔ ہماری رائے میں یہ تبدیلیاں وقت اور حالات کے تقاضہ کے مطابق تھیں اور ناگزیر تھیں، اگر سر سید زندہ ہوتے تو یقین ہے وہ خود بھی ان کو قبول کر لیتے، کیونکہ انگریزوں کے عہد میں تو ہندو اور مسلمان الگ الگ دو کیمپ میں تھے۔ ہندو بنارس یونیورسٹی صرف ہندوؤں کے لئے تھی اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے، اس لئے وہاں کوئی مسلمان کورٹ کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں کورٹ کی ممبر شپ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی، لیکن اب ملک آزاد تھا، یہاں ایک قومی حکومت قائم تھی، اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلیم

گے میدان میں بھی تعدد افتراق کی جو دیوار حائل تھی اسے لامحالہ گرنا تھا، یونیورسٹی اب سنٹرل گورنمنٹ کی یونیورسٹی تھی اور اس کے تمام اخراجات کی متکفل گورنمنٹ تھی اس بنا پر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ کورٹ میں گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کا کوئی نمائندہ نہ ہو، یا یونیورسٹی کے غیر مسلم اساتذہ میں سے جس کو اپنے عہدہ کے اعتبار سے کورٹ کا ممبر ہونا چاہئے تھا اسے محض غیر مسلم ہونے کے باعث کورٹ کی ممبری سے محروم رکھا جاتا، یہی صورت حال اکزکٹو کونسل اور اکاڈمک کونسل کی بھی تھی، البتہ اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ یہ ایک اسلامی تہذیب کی نمائندہ یونیورسٹی تھی اس بنا پر اس کے اسلامی کردار کو باقی رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کورٹ میں بہرحال اکثریت مسلمانوں کی رہے، کیونکہ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے اور اس لئے یہاں فیصلے ووٹوں کی اکثریت پر ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ووٹ اگر کم ہوئے تو اندیشہ ہے کہ کورٹ کبھی اپنے غیر مسلم ممبروں کے ووٹوں سے کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس سے یونیورسٹی کا اسلامی کردار مجروح ہو جائے۔

اگرچہ بدقسمتی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اسلامی ملکوں میں بھی مسلمانوں میں "ترقی پسند" افکار و خیالات کے عام اور مقبول ہو جانے کے باعث اب کسی ادارہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو بھی اسلامی مفادات کے تحفظ اور ان کی بقا کا ضامن نہیں کہا جا سکتا[1]، اور پھر یہ بھی ایک

---

[1] چنانچہ ۱۹۵۰ء میں جب میں کلکتہ سے علی گڑھ آیا تو بعض دوستوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے عہد میں جب دینیات کا معاملہ اکاڈمک کونسل میں آیا تو ترقی پسند مسلمانوں کے ایک گروپ نے اس مضمون کو سرے سے ختم ہی کر دینے کی تجویز کی اور اس پر تقریریں کیں، لیکن جن لوگوں نے اس تجویز کی مخالفت میں سخت تقریریں کیں اور دینیات کو حسب سابق لازمی مضمون کی حیثیت سے باقی رکھنے کی پرزور حمایت کی ان میں پیش پیش دو ہندو پروفیسر بھی تھے، ایک فزکس ڈپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر گل اور دوسرے شعبۂ ہندی کے صدر پروفیسر شرما۔ اور اس طرح دینیات کا مضمون اپنی حیثیت میں محفوظ رہ گیا۔ علاوہ ازیں خود میرے زمانہ کی بات ہے۔ ایک مرتبہ جب کورٹ میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی میں (بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر)

حقیقت ہے کہ اسلامی مفاد ہے کیا؟ اس سوال کے جواب میں بھی کوئی بات قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے، مثلاً ایک پختہ اور راسخ العقیدہ مسلمان کی ایمانداری سے یہ رائے ہے کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی علم وفن کے ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہئے کیونکہ یہ زمانہ مسابقت اور مقابلہ کا ہے اور اس لئے اسلامی مفاد کا تقاضا ہے کہ جن چیزوں سے قومیں ترقی کر رہی اور آگے بڑھ رہی ہیں ان میں مسلمانوں کا قدم بحیثیت ایک قوم کے کسی سے پیچھے نہ ہو، لیکن چند دوسرے مسلمان ہیں جو اس خیال کے حامی نہیں ہیں، اور دلائل کا سرمایہ ان کے پاس بھی کم نہیں، اب فرمایئے! اس صورت میں آپ کس خیال کو اسلام کے مفاد میں کہیں گے! بہرحال عام رسم وراہ اور قانون ودستور کے لحاظ سے کسی ایک قوم کے مفاد کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے افراد اکثریت میں رہیں، وہ افراد اگر خود ہی اپنے گھر کو آگ لگانے پر تل جائیں تو دنیا میں اس کا علاج کہیں بھی نہیں۔ اس بنا پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد (اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تب بھی) ۲۰ء کے ایکٹ میں امنڈمنٹ ضروری تھا اور یہ امنڈمنٹ ۵۱ء ایکٹ سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، اور ہونا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے اور یہ ایکٹ انھیں کے دماغ کا تراشیدہ تھا، اور کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) موسیقی کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ کھولا جائے تو میں نے اور بعض ممبروں نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں، لیکن ایک مسلمان پروفیسر نے جو نماز روزہ کے پابند تھے اس تجویز کی حمایت میں ایک طویل اور پرزور تقریر کی اور استدلال میں کہا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں حجاز، بغداد اور کوفہ وبصرہ موسیقی کا گہوارہ ہو گئے تھے، میں ان کی تقریر پر حیران رہ گیا۔ موصوف اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ کورٹ کی میٹنگ کے بعد جب میں نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے یہ کیا کیا تو ایک بڑے زور کا قہقہہ لگا کر بولے۔ مجھے یقین تھا کہ تجویز منظور نہ ہوگی، لیکن میں چاہتا تھا کہ دیکھوں آپ میری دلیل کا کیا جواب دیتے ہیں۔

مسلمان اس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ملک میں اسلامی مفاد کے تحفظ کا جو درد اس کے دل میں ہے وہ مولانا کے دل میں بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں یہ بل آیا اور منظور ہوا۔ اور اس وقت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی (جمعیت العلماء) اور مسٹر محمد اسماعیل (مسلم لیگ) پارلیمنٹ میں موجود تھے، کسی نے اس بل کی مخالفت نہیں کی۔ اخبارات میں اور پبلک میں بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھی۔ اور کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا۔[1]

اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ میں مسلمانوں کی اکثریت کو محفوظ رکھنے کا بندوبست یہ کیا گیا تھا کہ مسلم اداروں اور مسلم علاقوں (Constituency) کو نمائندگی خاطر خواہ طور پر دی گئی تھی، چنانچہ اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ کی جو تشکیل ہوئی اس میں جب تک یہ ایکٹ نافذ رہا مسلمانوں کی نمایاں اکثریت قائم رہی، اب رہا وائس چانسلر کا انتخاب! تو اگرچہ پہلے (۱۹۲۰ء ایکٹ کے ماتحت) اس کا انتخاب کورٹ کرتا تھی، اور اب یہ انتخاب بہ صورت پینل (Panel) اکزکٹو کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہی ہوتی تھی تو اس میں فرق ہی کیا پڑا؟ فرق صرف اس قدر ہوا کہ اب پینل میں سے انتخاب وزیٹر کے سپرد کر دیا گیا، اس سے اسلامی کردار کس طرح مجروح ہوسکتا ہے؟ وزیٹر آخر یونیورسٹی کا سب سے بڑا عہدہ دار ہے اور ملک کا صدر جمہوریہ! اگر اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو آخر یہ مسلمان اس ملک میں رہیں گے کس طرح؟ بہرحال جہاں تک کورٹ کی ممبر شپ، اس کے اختیارات اور اس کے نفوذ و اثر اور وائس چانسلر کے انتخاب کا معاملہ ہے، ۱۹۵۱ء کے ایکٹ میں ہرگز کوئی بات

---

[1] اس بے دماغی اور سبک ذہنی کی مثال بھی شاید کہیں اور مشکل سے مل سکے گی کہ جو حضرات اس وقت خاموش رہے تھے اب ۱۹۶۵ء امنڈمنٹ ایکٹ سامنے آیا تو اس کے ساتھ ساتھ وہ ۱۹۵۱ء میں بھی کیڑے نکالنے لگے ہیں گویا اب تک وہ سو رہے تھے اب جاگ پڑے ہیں یا اُس وقت اُن کی زبان بندی تھی اب زبان کھل گئی ہے۔

ایسی نہیں ہے جو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض یا اشتباہ انگیز ہو، بلکہ حق یہ ہے کہ جدید حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دستوری طور پر دوسری سنٹرل یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ تبدیلیاں ناگزیر اور ضروری تھیں!

دینیات

اب رہا دینیات کا معاملہ! تو اس میں بے شک یہ تغیر ضرور ہوا کہ پہلے یہ مضمون ہر مسلمان طالب علم کے لئے لازمی تھا، لیکن اب یکے از مضامین لازمی ہو گیا، اور ایک مسلمان طالب علم کو بھی یہ حق ہو گیا کہ اگر وہ چاہے تو اس کو چھوڑ کر اس کا کوئی دوسرا متبادل مضمون لے سکتا ہے، لیکن اس تبدیلی کو بھی یونیورسٹی کے اسلامی کردار پہ اثر انداز کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ دینیات کا مضمون اب تک لازمی ضرور تھا، لیکن عملاً اس کی حیثیت کیا تھی؟ اس کا نصاب کس درجہ ناقص اور اصلاح طلب تھا، اور اس کی تعلیم کس درجہ بے اعتنائی اور بے توقیری کے ساتھ ہوتی تھی، لوگ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں اس کے نصاب اور طریق تعلیم کا مذاق اڑاتے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایک عملی اور حقیقت پسند آدمی تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ یہ محض کاغذی طور پر اس کو لازمی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو طلباء اسے پڑھنا چاہتے ہیں انھیں ضرور اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے، لیکن تعلیم صحیح معنی میں تعلیم ہونی چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ایک کمیٹی مقرر کر دی جس کے ممبر (جیسا کہ اب مجھے یاد ہے) حسب ذیل افراد تھے:

(۱) نواب حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی (۲) مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۳) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (۴) مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی (۵) ڈاکٹر عبد العلیم (۶) سعید احمد اکبر آبادی۔

جب میں اس کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے کلکتہ سے علی گڑھ آیا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ

سے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ساتھ شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ حسب معمول بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے، اثنائے گفتگو میں دینیات کا ذکر آیا تو اپنے مخصوص والہانہ انداز میں فرمایا: لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ دینیات کا مضمون لازمی نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ کاغذی تحفظات اور محض رسم پرستی کا وقت نہیں ہے، بلکہ عمل کا اور کچھ کر دکھانے کا وقت ہے، جو طلبار کسی وجہ سے دینیات پڑھنا نہیں چاہتے ان کو خواہ مخواہ اس پر مجبور کرنا عقلمندی نہیں ہے، البتہ جو طلبار پڑھنا چاہتے ہیں ــــ اور مجکو امید قوی ہے کہ اکثریت عظمیٰ ایسے ہی لڑکوں کی ہوگی ــــ ان کو دینیات ضرور پڑھنی چاہیئے، لیکن اس کی تعلیم محض رسمی اور برائے خانہ پری نہیں، بلکہ حقیقی اور اس کی اصل اسپرٹ کے ساتھ ہونی چاہیئے، اس سلسلہ میں سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے جو وسیع وہمہ گیر اور یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ یہ کمیٹی اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اور آپ کو یہ کام کرنا ہے۔

جب میٹنگ ہوئی تو نصاب سے متعلق بحث وگفتگو ہوئی اور آخر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ میں انٹرمیڈیٹ اور بی، اے کی کلاسوں کے لئے ایک نصاب بنا کر کلکتہ سے بھیجدوں، میں نے اس تجویز کی تعمیل کی اور ایک نصاب بنا کر حاجی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شیروانی کو جو غالباً اس کمیٹی کے کنوینر تھے بھیجدیا، اس کے بعد کمیٹی کی پھر ایک میٹنگ ہوئی جس میں بعد مسافت کے باعث شریک نہ ہوسکا۔ کمیٹی نے اس نصاب پر غور کر کے اس کو منظور کرلیا، اور پھر غالباً مولانا ابوالحسن علی میاں کی تحریک سے کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب میں ہی اس نصاب کے مطابق ایک کتاب تیار کروں، میں اس زمانہ میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے بعض انتظامی معاملات کی وجہ سے سخت پریشان اور پراگندہ خاطر تھا اور ابھی اپنی کتاب "صدیق اکبرؓ" کی تصنیف سے فارغ ہوا ہی تھا۔ بہرحال میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور جس طرح بن پڑا دو تین مہینہ میں "دینیات" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے حاجی صاحب موصوف کی خدمت میں اس کا مسودہ ارسال کردیا۔ کمیٹی نے اس کو بھی پسند کیا اور منظور فرمالیا، اور خصوصاً مولانا علی میاں نے اس کی بڑی تحسین کی،

چنانچہ یہ کتاب شائع ہوکر دینیات کے نصاب میں شامل ہوگئی اور الحمد للہ کہ آج تک گریجویٹ کلاسز میں وہ شاملِ نصاب ہے، اس کے متعدد اڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نصابِ دینیات کی مقبول اور پسندیدہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ بدقسمتی سے بعض مسلمانوں کا وطیرہ یہ ہوگیا ہے کہ ایک بات پکڑلی اور اس پر شور مچانا شروع کر دیا۔ ان حضرات کو ۵۱ء ایکٹ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ پہلے دینیات لازمی تھی، اب اس کی حیثیت باقی نہیں رکھی گئی۔ حالانکہ گذشتہ سطور سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ دینیات نہ صرف یہ کہ باقی رکھی گئی ہے، بلکہ اس کی فعالیت اور افادیت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے، رہا اس کا لازمی نہ ہونا! تو عملاً اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا، کیونکہ عملاً مسلمان طلبار اب بھی ننانوے فی صدی دینیات ہی لیتے ہیں، بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ۵۱ء ایکٹ سے یونیورسٹی کے اصل بنیادی مقاصد اور اس کی ہیئت ترکیبی پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوتا۔ اور یہ ایکٹ یونیورسٹی کو وقت اور زمانہ کے حالات و مقتضیات کے ساتھ مطابق کرنے کی کوئی نامستحسن کوشش نہیں ہے، جو لوگ ۷۲ء کے ایکٹ کی آڑ میں اب اس کا بھی ماتم کر رہے ہیں ان کا طریقِ فکر اور کریزیت پژوہی خود لائق ماتم ہے۔

ایک مختلف فیہ شخصیت

مسلمانوں کے بعض حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت مختلف فیہ بھی ہے، اور بعض دماغوں میں اس سلسلہ میں بڑے شکوک و شبہات ہیں۔ پھر چونکہ مسلم یونیورسٹی اپنے اس سخت بحرانی اور انقلابی دور میں ڈاکٹر صاحب کی سربراہی اور ان کی قیادت میں ہی داخل ہوئی اور اس نے اس لرزتی ہوئی زمین میں اپنے پیر جمائے ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہم لوگ جب قرول باغ میں رہتے تھے اور جامعہ بھی وہیں تھی اس زمانہ میں سب اربابِ جامعہ اور خصوصاً ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا بڑا اختلاط اور رابطہ وضبط تھا، ہم ان کے مکان پر اور وہ ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس طرح

ہم نے انھیں خلوت میں بھی دیکھا ہے اور جلوت میں بھی، ان کی پبلک لائف بھی ہمارے سامنے ہے اور ان کی خانگی زندگی بھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے ذہن اور دماغ، علم و فضل، فکر و نظر، کردار و عمل اور اخلاق و فضائل کے اعتبار سے ایک نہایت بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھوں میں بڑی مقناطیسی کیفیت تھی اور باتوں میں بڑا رس تھا۔ ان کا اندازِ گفتگو بڑا مخلصانہ اور دل کو موہ لینے والا تھا، جس کسی سے بات کرتے تھے وہ بے اختیار ان کی طرف کشش محسوس کرتا تھا۔ ان کے تبسم میں شہد و انگبیں کی حلاوت تھی، جس نے اسے دیکھا اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ایک مثالی شخصیت تھی، اگرچہ ان کے حلقہ میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا لیکن ڈاکٹر صاحب خود ایک راسخ العقیدہ اور پختہ مذہبی فکر کے انسان تھے، نماز روزہ کے پابند تھے، اسلامی شعائر و روایات کے احترام کا جذبہ رکھتے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی سے بڑی عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ جب تیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہندوستان واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے بڑے شوق اور جذبہ سے ان کو اپنے ہاں جامعہ میں مہمان رکھا اور ان کے تمام اخراجات برداشت کئے، اوکھلے کے قیام کے زمانہ میں متعدد مرتبہ نظام الدین کے تبلیغی مرکز بھی گئے اور ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے ہیں، ان کو اسلام سے وہی محبت تھی جو ایک سچے اور پکے مسلمان کو ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ انھیں محبت نہیں عشق تھا۔ اور آخر میں تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کہتے ہیں: "ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہونے کے بعد بدل گئے تھے" میں کہتا ہوں: جی ہاں! بدل گئے تھے لیکن ان کا دل نہیں بدلا تھا، چنانچہ جس سال ان کا انتقال ہوا ہے غالباً اسی سال

ہندوستان کی طرف سے جو جج ڈیلی گیشن گیا تھا اس کے ایک ممبر ہمارے فاضل اور نہایت عزیز دوست مولانا سید منت اللہ صاحب، حالی امیر شریعت بہار بھی تھے، مولانا کا بیان ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے رسمی طور پر ہم لوگوں کو چائے پر مدعو فرمایا، فراغت کے بعد جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! میرے لائق خدمت کوئی کام!" ڈاکٹر صاحب نے یہ سنتے ہی میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے اور بولے: "بس! مولانا! حضور پرنور کی سرکار میں میرا سلام عرض کیجئے اور دعا فرمایئے کہ میری عاقبت بخیر ہو"۔ مولانا کا بیان ہے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کے دونوں ہاتھ کپکپا رہے تھے، آنکھیں اشک آلود تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی، سینہ میں جذبات کا طوفان امڈتا ہے تو مدعائے دل زبان وبیان کی گرفت میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہکر چپ ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی دیر تک مولانا کے ہاتھ پکڑے اور ان کی طرف دیکھتے کھڑے رہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خادم خاص کا جو ہر وقت ان کی خدمت میں رہتا تھا بیان ہے کہ مرحوم بہت صبح سویرے بیدار ہو جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، چنانچہ جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس روز بھی ان کا یہ معمول ناغہ نہیں ہوا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: "ذہنی طور پر وہ (ذاکر میاں) عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان ہیں، جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع وخضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی عبادت کرتے ہوئے دیکھے، ..... ان کی عبادت نمائش کے لئے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہار عبودیت کے لئے ہے[۱]" (یادوں کی دنیا ص ۱۲۹) ان شواہد کی روشنی میں اس میں شک وشبہ

---

[۱] چونکہ عبادت کا معاملہ اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان راز ونیاز اور سرگوشی (بقیہ ص ۱۱۱ پر)

نہیں ہوسکتا کہ ڈاکٹر صاحب عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے سچے اور مخلص مسلمان تھے۔

فلسفۂ انقلاب

کہتے ہیں کہ آخر میں وہ بدل گئے تھے اور ان کی زندگی جو تقسیم کے بعد تھی اس زندگی سے مختلف تھی جو تقسیم سے پہلے تھی، آئیے اب اس پہلو پر بھی غور کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو ہمیشہ وہاں دو جماعتیں ہوتی ہیں (۱) انقلاب آفریں اور (۲) انقلاب زدہ، پہلی جماعت وہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں فتحمندی و کامرانی کا علم ہوتا ہے، اقتدار کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور وہ طاقت و قوت کی اورنگ نشین ہوتی ہے، اس کے برخلاف دوسری جماعت انقلاب کی ماری ہوئی ہوتی ہے، انقلاب کے سیلابِ بلا کی تلاطم آفریں موجیں اس جماعت کے شیرازۂ امن وسکون کو درہم برہم اور اس کے کاشانۂ اطمینان وعافیت کو تہ وبالا کر کے رکھدیتی ہیں۔ انقلاب کی عظیم و شدید تباہ کاریاں اس قوم کو اس درجہ خستہ حال، زبون و پامال کر دیتی ہیں کہ اس پر خوف و دہشت اور مایوسی و ناکامی کا غلبہ ہوجاتا اور میدان زندگی تنگ نظر آنے لگتا ہے، اس وقت انقلاب زدہ قوم میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ "دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے" کے مطابق اپنے آپ کو وقت کے سیلاب کی موجوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جدھر وہ موجیں لے جائیں اور جہاں چاہیں انھیں غرق کر دیں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اکثریت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر) د مناجات کا ہے اس لئے ہم نے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ مسجد میں فرض جماعت کے ساتھ ادا کئے اور اپنے خلوت کدہ میں چلے گئے وہاں وہ سنن اور نوافل اور اوراد و وظائف جو کچھ پڑھنے ہوتے تھے اور اس خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اس وقت ان حضرات کا خشوع وخضوع اور ان کی محویت واستغراق کا یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ یہ منظر ایک مرتبہ ہم نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال کا بھی دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے طبیعت پر اب تک اس کا اثر ہے۔

ایسے افراد کی ہوتی ہے جنہیں اپنے گھر کے پرانے در و دیوار سے عشق ہوتا ہے، محلہ کے گلی کوچے جن میں ان لوگوں نے بچپن کے دن اور جوانی کی راتیں گذاری ہیں ان کی ایک ایک اینٹ انھیں پیاری ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو موجوں کے حوالہ کر دینے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں موجوں کی بلا انگیزی کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت اور طاقت نہیں ہوتی، اس بنا پر وہ عالم حسرت و نامرادی میں اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور اکثر اوقات مکان کی کھڑکیاں اور دیواروں میں روشندان بھی بند کر لیتے ہیں کہ کہیں سیل رواں کی موجیں اچھل کر اُدھر سے اندر نہ آجائیں، غرض کہ پوری انقلاب زدہ قوم کے لئے اس کی زندگی کا یہ موڑ انتہائی نازک اور خطرناک ہوتا ہے، اور تشتت و انتشار، اور پراگندگی و سراسیمگی کا شکار ہوجاتی ہے، اس پر "نہ جائے رفتن و نہ پائے ماندن" کا عالم حیرانی طاری ہوتا ہے، اس کو اپنے ماضی کی شاندار عمارتیں کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں، حال مایوس کن اور مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ جو لوگ اس عالم میں کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رخشِ امواج کی پشت پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں، یقین ہے کہ اب وہ اپنے وطن کو واپس نہ لوٹ سکیں گے، موجیں یا تو انھیں غرق کر دیں گی اور یا اگر وہ زندہ اور سلامت رہے بھی تو کسی دوسرے ملک کے ساحل پر انھیں پٹخ دیں گی اور وہ اس ملک کی زبان اور تہذیب اختیار کر کے اپنے لوگوں کے لئے اجنبی اور پردیسی بن جائیں گے، اب رہے وہ لوگ — اور کثرت انھیں لوگوں کی ہے — جو سیلاب کی ہولناکیوں سے ڈر کر اپنے گھروں اور حویلیوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہیں! تو یہ بھی اپنی خیر کب تک منائیں گے، دیواریں بوسیدہ اور پرانی ہیں اور سیلاب کی قہرمانی شدید اور مسلسل موجیں ہیں کہ در و دیوار سے برابر ٹکرا رہی اور شورِ قیامت برپا کر رہی ہیں، آخر ایک وقت آئے گا جب یہ دیواریں بھی بیٹھ جائیں گی اور دروازے مقاومت کی تاب نہ لا کر دھڑام سے گر پڑیں گے، اور موجیں گھروں کے اندر گھس

آئیں گی، اس وقفہ میں اگر بڈھے بوڑھے اپنی جان سلامت لے بھی گئے تو موجیں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو بہالے جائیں گی، اس طرح پوری قوم انقلاب کی زد پہ اور اس کا نشانہ ہوتی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اور جو بلا ان پر مسلط ہوگئی ہے اس سے کیونکر اور کس طرح رستگاری حاصل کی جائے۔

اگر قدرت کو اس قوم کو زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو اس عالم اضطراب وکشمکش میں آخر کچھ لوگ پردۂ ظہور پر آتے ہیں، یہ روشن خیال اور بالغ نظر ہوتے ہیں، ان کو ایک جانب اپنے ماضی کی تابناکی اور قومی وملی انفرادیت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری جانب وقت کی ہواؤں کا رخ پہچان لینے کا ان میں سلیقہ ہوتا ہے، وہ زمانہ کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ سکتے اور انقلاب روزگار کی صداؤں کو سن سکتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اب نہ مقاومت مجہول سے کچھ فائدہ ہوگا اور نہ عزلت گزینی وفراریت کی راہ اختیار کرنے سے کام بنے گا۔ اب وقت جد وجہد اور سعی وعمل کا ہے جو وقت کے دھارے کا رخ اس طرح موڑ دے کہ وہ ہلاکت کے بجائے ان کی سلامتی کا سبب بن جائے، اور یہ کام مصالحت اور مطابقت کے ذریعہ ہی سرانجام ہوسکتا ہے، یہ لوگ شک وتردد اور حیص بیص کا لبادہ اتار کر عزم وہمت اور پامردی واستقلال کے ساتھ اپنی کشتی لیکر سیلاب میں کود پڑتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

یہی وہ لوگ ہیں جو اس وقت قوم کی قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ان کی کوششوں کے صدقہ میں قوم کو حیات نو اور نشاۃ ثانیہ حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی راہ آسان نہیں ہوتی۔ ایک طرف وہ انقلاب آفریں قوم ہوتی ہے جو اقتدار کی مالک ہوتی ہے اور اس کے دل میں انقلاب زدہ قوم کی طرف سے شکوک وشبہات کا جس میں کچھ جذبۂ انتقام بھی شامل ہوتا ہے ایک طوفان برپا ہوتا ہے، اور دوسری جانب خود اپنی قوم ہوتی ہے جس میں احساسِ شکست، کم نظری اور کم حوصلگی، پست ہمتی اور کوتاہ بینی

کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ، اس بنا پر اس قائد کو ایک نہیں بلکہ دو دو محاذوں پر کام کرنا ہوتا ہے ، وہ غیروں کو اپنانے اور اپنے زخموں کو دھو دینے کی جو کوشش کرتا ہے اس میں بسا اوقات خود اپنوں سے جن کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے طعن وتشنیع اور سب وشتم سننے پڑتے ہیں ، وہ اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے اور بات بات پر اس پر نکتہ چینی اور حرف گیری کرتے ہیں ، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وقت کے سیلاب کی موجیں شدید اور باد مخالف تیز وتند ہوتی ہیں اس بنا پر کشتی شروع شروع میں اسی سمت چلتی ہے جس سمت موجیں جا رہی اور ہوائیں ان کو لئے جا رہی ہیں ۔ لیکن کشتی کا ملاح اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب کہ سیلاب کی رفتار دھیمی ہو ، موجوں کا تلاطم کم ہو اور ہوائیں مخالف نہ رہیں ۔ جب ایسا وقت آتا ہے تو کشتی کا ملاح اپنے پتوار اور بادبان درست کر لیتا ہے اور پھر کشتی کو اپنی منزل کی طرف لے آتا ہے ، یہ پورا عمل وہ ہے جو عمل مطابقت (Adgustment) کہلاتا ہے اور اگر یہ کامیاب رہے تو اس سے قوم کو دوبارہ توانائی اور مصافِ زیست میں پیش قدمی کرنے کی ہمت ملتی ہے ۔

قوموں کے عروج وزوال کا یہی آئینِ فطرت اور ازلی دستور ہے ، اور تاریخ میں ہمیشہ اسی پر عمل ہوتا آیا ہے ، دور جانے کی ضرورت نہیں ، سر سید کو دیکھئے ! انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کام کیا اور جس نہج پر کیا اس کی نوعیت یہی تھی ، یہ ضروری نہیں ہے کہ نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی جد وجہد میں ایک قائد جو کام بھی کرے اور اس سلسلہ میں اس کے زبان وقلم سے جو کچھ بھی نکلے وہ سب من وعن درست اور صحیح ہی ہو ، نہیں ! بلکہ اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور آپ اس کو اپنی زبان میں "مرعوبیت" یا فکر ونظر کی بے اعتدالی بھی کہہ سکتے ہیں ، لیکن اس شخص کی نیت اور جذبہ پر حملہ کرنا ایک شخص کے چند جزوی اقوال و اعمال کے باعث اس کی زندگی کے تمام واقعات اور اس کے کیریر سے منکر ہو جانے کے مترادف ہوگا ۔ ایک جنرل جو کسی مصلحت سے اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے یا میدان جنگ چھوڑ دینے

کا حکم دے رہا ہے آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے اس کو ملک اور قوم سے غداری کا الزام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ سرسید کی نسبت کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ بڑی حد تک ان کی ہی کوششوں اور جد وجہد کی مرہون احسان ہے، لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سرسید کا دامن غلطیوں سے پاک نہیں ہے، اور بعض غلطیاں ۔کوئی شبہ نہیں بہت شدید اور ناقابل تلافی ہیں، لیکن اس کے باوجود سرسید کا جو مرتبہ ومقام انیسویں صدی کے اکابر واعاظم اسلام میں ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے!

سرسید اور ذاکر حسین کا موازنہ

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کو پیش نظر رکھکر سرسید اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا موازنہ کیجئے تو دونوں میں بہت سی باتوں میں مشابہت ملے گی، ذاکر صاحب کی نسبت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ "وہ ذہنی طور پر عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان تھے" غور کیجئے، یہ فقرہ کس طرح ہو بہو سرسید پر بھی صادق آتا ہے۔ جہاں تک مذہب کے احکام ومسائل اور اس کے مباحث کا تعلق ہے سرسید کی عقل پسندی نے معتزلہ اور علم کلام کے بعض دوسرے مذاہب کے دامن میں پناہ لی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقل پسندی کو تصوف کے مختلف مکاتب فکر اور صوفیائے کرام کے مسلک صلح کل سے سہارا ملا۔ راگ دونوں کے الگ الگ ہیں لے بہرحال ایک ہی ہے، سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا تھا جو مسلمانوں کے خلاف شدید جذبۂ انتقام سے پر تھے اور ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوؤں سے معاملہ صاف کرنا تھا جو تقسیم اور اس کے ہولناک نتائج کے باعث مسلمانوں کے خلاف بری طرح بپھرے ہوئے تھے، سرسید اگر اپنی دھن اور لگن میں قرآن مجید میں تفسیر بالرائے بلکہ سچ یہ ہے کہ تحریف کی منزل تک پہونچ گئے، انگریزی لباس پہننے اور انگریزوں کی طرح پر کھانے پینے لگے تو آپ کو اس پر تعجب کیوں ہو کہ کل کا شیخ الجامعہ شنکر اچاریہ کے چرنوں میں جاکر بیٹھ گیا، دونوں ہاتھ جوڑکر نمسکار اور ہندی میں تقریر کرنے لگا۔ سرسید کا نظریہ تھا کہ انگریز اہل کتاب ہیں اس لئے ان کے ساتھ یگانگت اور مجالست پیدا کرنا

چاہیئے، ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ ہندو ہمارے ہم قوم و ہم وطن ہیں ، ان کی اور ہماری تہذیب جو ہندوستانی تہذیب کہلاتی ہے مشترک ہے اس لئے ہم کو اسے اپنانا چاہیئے ، سرسید انگریزوں کی استرضا میں اتنے آگے نکل گئے کہ جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ۔ ذاکر صاحب کو اپنے عہدۂ صدر جمہوریہ کی وضعداری میں اتنا غلو ہوا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ، مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی رہی لیکن انھوں نے اپنی زبان بند رکھی ، درحقیقت یہ سب وقت کے وہ تھپیڑے ہیں جو کم یا بیش ہر اس شخص کو کھانے پڑتے ہیں جو سمندر کی متلاطم موجوں اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں بھی اپنی کشتی کے بادبان کو الٹ جانے سے بچانے کی فکر کرتا ہے ۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلیں

جو غلطی ہے وہ ہزار تاویلوں اور برہان تراشیوں کے بعد بھی غلطی رہے گی، لیکن جو لوگ قوم کی خاطر "شب تاریک و بیم موج گردابے چنیں ہائل" سے دوچار ہوں اگر کہیں ان کا پاؤں پھسل جائے تو "سبکساران ساحلہا" کو زیب نہیں دیتا کہ ان کا مذاق اڑائیں ، ان پر پھبتی کسیں یا خدائی فوجدار بن کر اپنی مغفرت سے زیادہ ان حضرات کی مغفرت کی فکر کرنے لگیں ، ہونا تو نہیں چاہیئے تھا لیکن بدقسمتی سے ہوتا یہی آیا ہے ، سرسید نے کالج قائم کیا اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن جب کالج کے اسٹاف سے متعلق پالیسی کا معاملہ آیا اور پرانے ساتھیوں سے ان کو اختلاف ہوا تو مولوی طفیل احمد منگوری جیسے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ "سرسید آخر میں وہ نہیں رہے تھے جو شروع میں تھے ، بلکہ بدل گئے تھے" یہی معاملہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ پیش آیا ، وہ یونیورسٹی کے سربراہ ہوئے اور اس کی تاریخ کے نہایت نازک دور میں اس کی حفاظت کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط بنا کر اسے ترقی دی ، لیکن جب ان کی بعض چیزوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا تو انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب بدل گئے

تھے ، حالانکہ جہاں تک دل اور ضمیر اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا تعلق ہے ڈاکر صاحب
کا حال اس شعر کے مصداق تھا :

نہ میں بدلا نہ تم بدلے نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے عہد وائس چانسلری میں یونیورسٹی کا نہ اسلامی کردار بدلا اور
نہ وہ جسے آج کل اقلیتی کردار کہتے ہیں تبدیل ہوا۔ طلباء اور اساتذہ میں ، کورٹ میں اور اگزیکٹو
کونسل میں ہر جگہ مسلمانوں کی اکثریت تھی ، دینیات کی تعلیم کا وہی اہتمام تھا ، مساجد اور ان میں
اماموں اور موذنوں کا وہی انتظام ، عربی ، فارسی ، اردو اور اسلامیات اور ریسرچ کا بندوبست
پہلے سے زیادہ ، رمضان شریف کے احترام اور عید میلاد النبی کے جلسے کی وہی شان ، تجوید
وقرأت کی تعلیم کا وہی ساز و سامان ، غریب مسلمان طلباء کے لئے وظائف اور مالی امداد کے
وہی طریقے ۔ یہ سب چیزیں علیٰ حالہا اور بجنسہا قائم رہیں ۔ بلکہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کے
مطابق ان میں ترقی ہوئی ۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے عہد میمنت مہد میں یونیورسٹی کی ہیئت ترکیبی
واجتماعی میں چند در چند ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئیں جنھیں دیکھکر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب
یونیورسٹی کا چلن وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا اور اب وہ ایک دوسرے ہی ڈگر پر چل پڑی ہے ،
لیکن یہ تبدیلیاں جن وجوہ اور اسباب سے پیدا ہوئیں غالباً ڈاکٹر صاحب کا ان پر اختیار نہ تھا
تھا اور وہ خود بھی ان پر خوش اور مطمئن نہ تھے ، چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب
ان سے بددل اور بیزار ہوکر اپنے عہدے کے دوسرے ٹرم کے پورا ہونے سے کئی سال پہلے
ہی اس عہدہ سے سبکدوش ہوکر اپنے گھر جامعہ نگر میں جا بیٹھے ، ڈاکٹر صاحب کی بددلی اور
بیزاری کے کیا اسباب تھے ؟ اس پر اس واقعہ سے روشنی پڑے گی ، بہار کے گورنر ہونے
کے زمانہ میں جب جنوری ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر صاحب جدیو پور یونیورسٹی میں خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد

پڑھنے کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور کئی روز کلکتہ میں مغربی بنگال کی گورنر مس پدمجا نیڈو کے مہمان کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاؤس میں قیام فرمایا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ازراہ کرم وعنایت مجکو بھی یاد فرمایا۔ چنانچہ ایک دن میری درخواست پر مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں بھی تشریف لائے، تمام اساتذہ اور طلبار سے ملاقات کی اور مدرسہ کے کاموں اور اس کی عمارتوں کا معائنہ کیا، اور اس کے علاوہ جب تک وہ کلکتہ میں رہے میں روزانہ شام کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اس وقت حسب عادت وہ بہت بے تکلف ہو کر گفتگو کرتے تھے جس میں سنجیدہ علمی موضوعات کے ساتھ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتی تھیں، ایک دن اسی طرح کی گفتگو کے موقع پر میں نے عرض کیا: ڈاکٹر صاحب ابھی تو آپ کی وائس چانسلری کی مدت کے ختم ہونے میں دو برس باقی تھے، آپ اس سے پہلے ہی سبکدوش ہو گئے، کیوں؟ اپنے خاص انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے فرمایا: میں کیا کرتا! وہ لوگ جن کو میں اپنا دست و بازو بنا کر علی گڑھ لایا اور ان کو ترقیاں دیں، جب وہ ہی قدم قدم پر میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے تو میں علی گڑھ نہ چھوڑتا تو کیا کرتا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ ان کے سوز دروں اور کرب نہاں کا غماض ہے، میں اگرچہ علی گڑھ سے بہت دور تھا، لیکن وہاں کے حالات اور سیاست سے بے خبر نہ تھا، ڈاکٹر صاحب یہ جملہ فرما کر خاموش ہو گئے اور میں نے بھی اس کی مزید تشریح کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ علی گڑھ سے ان کی یہ ناراضگی آخر وقت تک رہی اور ان کا دل کبھی ادھر سے صاف نہیں ہوا۔

اسلامی حدود کی حکمت

از مولانا حبیب ریحان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ ، البیضاء (لیبیا)

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

شریعت کی بخشی ہوئی تمام آسانیوں سے اسلامی حکومت کا ہر باشندہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کسی شخص سے گناہ سرزد ہوتا ہے اور وہ حدود الٰہیہ کو توڑتا ہے اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، وہ اپنے ہر گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پاک وصاف بن سکتا ہے، اس کی توبہ کے لئے کسی تیسرے وسیط، شیخ، بزرگ، پیر یا پادری کی مطلق ضرورت نہیں، سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ جو اوپر لکھی گئی تھی صاف حکم دیتی ہے کہ صرف خدا سے دعا اور توبہ کرو، اور حسب ذیل آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ گناہ کو بخشنے کا حق صرف خدا کو ہے، اور یہ کہ کسی بڑے سے بڑے فحش گناہ یا اپنے نفس پر ظلم کے بعد بھی اگر اخلاص اور دکھے ہوئے دل کے ساتھ انسان خدا کو یاد کرے اور توبہ کی شرطوں کے ساتھ توبہ کرے جس میں گناہ پر اصرار نہ ہو اور ندامت ہو تو خدا اس کو اپنی رحمت ومغفرت سے معاف کر دیتے ہیں وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ أَجْرُ

الْعَامِلِیْنَ (آل عمران - ۱۳۵ - ۱۳۶) ترجمہ "جنت جن لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے ان میں سے چند کا تذکرہ کرنے کے بعد) اور وہ لوگ (بھی) جو جب کوئی کھلا گناہ کریں یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کریں یعنی غافل اور بدمست نہ ہو جائیں) اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہیں اور کون ہے جو گناہوں کو بخشے سوائے اللہ کے ؟ اور وہ اپنی بدعملی پر اصرار نہ کریں جانتے ہوئے، ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے اور وہ جنتیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ رہیں گے اس میں، اور عمل کرنے والوں کا اجر (بدلہ) بہت خوب ہے۔" پھر دوسری آیت میں خدائے پاک نے فحش وظلم کے اس حکم کی تشریح اس طرح کی ہے کہ شرک کے سوا ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں ظلم سے مراد شرک سے کم درجے کے گناہ ہیں، ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرِکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء - ۱۱۶) ترجمہ (اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم کو جس کے لئے چاہتا ہے بخش دیتا ہے)، .... خدا نے توبہ کا حکم دیا ہے اور گناہ کے بعد توبہ سے مایوسی اور خدا کی رحمت سے قنوط (یاس) کی ممانعت کی گئی ہے، بلکہ تمام گناہگاروں، خطاکاروں اور نفسِ بشری کی غلطیوں سے آلودہ ہو جانے والے انسانوں کے لئے مژدۂ بشارت ان کے رب کی طرف سے اس طرح موجود ہے کہ رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو اور توبہ کرو اور توبہ یہی ہے کہ اطاعت کرو اور سب سے اچھی اور کامل شریعت کی پیروی کرو کہ اس آسمانی ہدایت کی پیروی نہ کرنے والے دنیا و آخرت کی حسرتوں سے دوچار ہوں گے، چند آیتیں ملاحظہ ہوں، گنہگاروں کو کیسا اصلاح واتباع کا درس دیا گیا ہے، اور یہ درس تمام امت پر واجب ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ، وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمْ

الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (زمر۔ ۵۳۔ ۵۵) ترجمہ (کہدو، اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر (گناہ کے ذریعے) زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بیشک اللہ سارے گناہ بخش دیتا ہے، بیشک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی حکم برداری کرو، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے اور تمھاری مدد (کسی کی طرف سے) نہ کی جائے۔ اور اتباع (پیروی) کرو اس اچھی بات (اسلام، قرآن اور شریعت) کی جو تمھاری طرف اتاری گئی تمھارے رب کی طرف سے، اس سے پہلے کہ اچانک تم پر عذاب آجائے اور تمھیں خبر بھی نہ ہو)

اس آیت کے ابتدائی حصے میں گناہگاروں کے لئے مغفرت کی بشارت ہے، اور وسط میں اتباع کتاب الہی و شریعت اسلامیہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت ہے، اور آیت کے آخری فقرے میں اسلام کی مکمل تابعداری اور شریعت مُنزَّلہ پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اچانک عذاب کی وعید بھی موجود ہے، اور جس طرح افراد کے گناہ دربار الہی میں توبہ کے ذریعے معاف ہوسکتے ہیں اسی طرح قوموں، امتوں اور مسلم سوسائیٹیوں کے گناہ بھی معاف ہوسکتے ہیں، صرف شرط یہ ہے کہ گناہ کا پہلے تو تعین ہوجائے اور پھر اس پر اصرار نہ ہو، گناہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے بجائے انسانی قوانین اور وضعی شریعتیں نافذ ہیں، ان کو باقی رکھنے پر اصرار توبہ کے منافی ہے، اور اخلاص کے ساتھ شریعت اسلامیہ کا قانون اور خدا کی بتائی ہوئی راہ اگر اپنالی جائے پھر رحمت و مغفرت کے دروازے کھل سکتے ہیں اور سکون و سعادت کے بادل آسمان سے ایسی بارش کرسکتے ہیں کہ کشت زار ہستی امید و ارمان کے پودوں سے لہلہا سکتی ہے، کشت و خون کا بازار سرد پڑسکتا ہے، چوری، ڈاکہ اور تمام اخلاقی جرائم کم سے کم تر ہوسکتے ہیں۔

اسلامی نظام قضا میں رحم و کرم کے اصول جیسا کہ بیان کیا جاچکا، ہر گناہ اور غلطی اور حد تک کی معافی توبہ اور دعا سے ہوسکتی ہے کیونکہ معافی کا حق صرف خدا کو ہے اور بندہ کسی گناہ کے بعد اگر وہ کسی کو معلوم نہیں ہوا ہے اور عدالت تک نہیں پہنچا ہے

توبراہ راست خدا سے توبہ کرسکتا ہے، لیکن گناہ اگراتنی شہرت، ڈھٹائی اور عام طور پر یہ ظاہر کرکے کیا گیا ہے کہ وہ قضیہ (کیس) بن کر عدالت تک پہنچ گیا ہے تو اس صورت میں اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ مجرم، مجنی علیہ (جو اس جرم سے متاثر ہوا) اور سوسائٹی تینوں کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کرنا چاہتی ہے، اور ایسے کل اصول پیش کرتی ہے جن سے جرم کا انسداد ہو، اور جرم کے تصور ہی سے مجرم کے رونگٹے کھڑے ہوں اور سوسائٹی جرم سے باز رہے، قانونی طور پر جرائم کے سلسلے میں تین قانون اسلام نے پیش کئے ہیں، ایک قصاص کا قانون، دوسرا حدود کا اور تیسرا تعزیرات کا قانون، قتل کی صورت میں معافی کا حق حاکم یا کورٹ کو نہیں بلکہ مقتول کے ولی الدم کو رہتا ہے اور سزا کی تنفیذ کا حق حاکم کو، تاکہ اس طرح دلوں میں نفرت، غصہ اور حقد کے بجائے محبت کی فضا دوبارہ قائم ہو جائے اور اس طرح دیت دی جاسکتی ہے، لیکن ولی الدم کو خون بہا لینے کا پورا پورا حق بھی شریعت نے دیا ہے، تعزیرات وہ جرم ہیں جن کی سزا شریعت میں منصوص (واضح طور پر محدود اور معلوم) نہیں ہے، تعزیرات کی دو قسمیں ہیں، اللہ کا حق اور بندوں کا حق، اللہ کا حق یہ ہے کہ سوسائٹی میں گناہ اور منکر کو دیکھکر اس سے باز رکھنے کی کوشش ہر شخص کرے، لیکن قانونی طور پر اضطراب وقلق اور انتظامی خلل کے خطرے سے تعزیر امام یا عدالت ہی کو نافذ کرنی چاہئے، حقِ الہٰی جیسے نماز کو ترک کرنا اور شرعی اوامر کو ادا نہ کرنا یا گناہ کرنا وغیرہ، ان میں تعزیر امام پر واجب ہے، کیونکہ برے افعال پر تادیب اگر نہ کی جائے تو اس سے زیادہ فحش اور قبیح کام کرنے کی ہمت اور عادت ہو جائے گی ہمسری کا قول ہے کہ اس میں کوئی چیز مقدر (مقرر) نہیں ہے، بلکہ قاضی کی رائے اور مجرم کی نوعیت جرم اور جرم سے باز رہنے اور رک جانے کی صلاحیت دیکھکر وہ جو چاہے سزا دے سکتا ہے۔ (فتح القدیر ۴۔ ۲۱۲) تعزیر کی شکلیں اور حدیں فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، بندوں کا حق یہ ہے کہ کسی شخص پر کوئی الزام یا تہمت لگائی گئی، تہمت کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک کسی ایسی چیز کی تہمت جس پر شرعی حد مقرر ہے، خصوصیت کے ساتھ زنا کی تہمت، اس کو قذف کہتے

ہیں اور شریعت میں اس کی حد مقرر ہے، دوسری وہ تہمت جس میں حرام کا الزام نہیں لگایا جاتا بلکہ شخصیت مجروح ہوتی ہے، گالی گلوچ، تکلیف پہنچانا، کسی پر خیانت کا الزام یا اس قبیل کی دوسری حق تلفیاں، اس تعزیر کا حق بھی امام یا اس کے نائب، عدالت کو ہے، لیکن معاف کرنے کا حق عدالت کو نہیں اسی کو ہے جس پر تہمت لگائی گئی یا زیادتی کی گئی۔ حدود وہ جرم ہیں جن کی سزائیں کتاب وسنت میں واضح اور محدود و مقرر ہیں، ثبوت قطعی کے بعد ان میں معافی کا حق نہ حاکم کو ہے نہ کورٹ کو اور نہ مجنی علیہ کو، اور یہ بات عقلی طور پر بھی صحیح ہے کیونکہ معافی کی صورت میں دوسرے غیر مجرموں کو جرم کی رغبت ہوتی ہے اور جرم کرنے کے بعد جرم کی سزا سے چھوٹ جانے کا دروازہ کھل جاتا ہے، صرف حد حرابہ کے سلسلے میں نص قرآنی کی رو سے اس پر اتفاق ہے کہ حاکم ان کو معاف کر سکتا ہے اور شریعت کی مصلحت اس میں یہ ہے کہ کسی منظم اور مسلح فسادی گروہ پر معافی اور توبہ کا دروازہ کھول کر مزید ظلم وستم سے اس کو اور عوام کو بچانا مقصود ہے، اگر ان کی معافی نہ ہو تو پھر وہ آخر دم تک ہتیار نہ ڈالیں گے اور اس طرح فساد کا طوفان مچاتے رہیں گے اور عوام، پولیس اور ان کی جانیں اس ہنگامے اور ضد میں مزید تلف ہوں گی، حرابہ کے علاوہ دوسری حدود حاکم یا عدالت معاف نہیں کر سکتی، لیکن کیا یہ حدود توبہ سے ساقط ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کی تحقیق تفصیل انشاء اللہ تفصیلی مقالے میں پیش کروں گا۔

مجرم کے ساتھ نرمی کا برتاؤ شریعتِ اسلامیہ اس طرح کرتی ہے کہ اگر عدالت کے پاس کیس آنے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع ہو جائے تو بات ختم ہو جاتی ہے، عام انسانوں کو چشم پوشی اور معافی کی ترغیب دی گئی ہے، گواہی کی شرطیں بہت سخت ہیں، مجرم کو کسی بھی قانونی یا فطری چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے، حد کو شبہ سے بھی ختم کیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ تعزیر ہو سکتی ہے، یعنی اگر ۹۹ چیزیں مجرم کے خلاف ہیں اور ایک چیز میں شک یا اشتباہ ہے تو حد ختم ہو سکتی ہے، اور دوسری ایسی تفصیلی اشیاء فقہ اسلامی میں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا

ہے کہ شریعت نے مجرم کے ساتھ کس قدر نرمی اور احتیاط برتی ہے اور حدود کا قیام کس قدر مشکل اور نادر الوقوع ہے، ان اشیاء کی کچھ تفصیل راقم حدود سے متعلق تفصیلی مضمون میں کرے گا۔

مجنی علیہ کے ساتھ رحم وکرم یہ ہے کہ اس کو قانونی طور پر اپنے حقوق واپس لینے کا پورا پورا حق موجود ہے تاکہ وہ مظلومیت کا نہ شکار ہو اور نہ اسے اس کا احساس ہو۔

اور سوسائٹی کے ساتھ منصفانہ اور رحیمانہ برتاؤ یہ ہے کہ حدود کے قیام سے قبل ہی صرف ان کا اعلان، قانون اسلامی میں اس بات کی ضمانت ہے کہ سوسائٹی میں عامۃ الناس ان قبائح کے ارتکاب سے باز رہیں گے جن پر حدود نافذ ہوں گی، اور پھر اس جرم کے ظاہر ہونے اور عدالت میں ثابت ہونے کے بعد کسی ایک شخص یا چند افراد پر حد کا قیام اور شرعی سزا کا اجرا، پوری سوسائٹی کے لئے عبرت اور سبق آموزی کا ایسا لازوال درس ہوگا جو سینکڑوں قوانین، جیلیں اور دوسری تعزیرات نہیں پیدا کرسکتیں، اور اسلام صاف اور نظیف سوسائٹی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جب اور جہاں اسلامی حدود اور قوانین نافذ ہوئے ہیں جرموں کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر کم ہوگئی ہے اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں بہشت دنیا جہنم زار بن گئی ہے۔

اسلامی حدود پر بربریت کا الزام اور اس کا جواب

بہرحال اسلامی قانون کا نام سن کر ہی آزاد خیال بلکہ یوں کہئے کہ مغربی افکار کے غلام اور مشرقی اوہام کے شکار چراغ پا ہو جاتے ہیں، لیکن اسلامی حدود کا نام سن کر تو پریشانی اور حیرانی میں ہسٹیریا کے مریض معلوم ہونے لگتے ہیں، اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے بعد اسلامی ہمدردی کے طور پر اسلام ہی کو ایک بیمار دین ثابت کرنے لگتے ہیں، لیکن اسلوب اور لہجہ ایسا اختیار کرتے ہیں جس سے بظاہر واقعی ہمدردی اور حسن نیت ظاہر ہو، اور بین الاقوامی ضمیر، اور انسانی قیمت، ہمدردی اور مسلمانوں کی رسوائی اور اس نظام میں وحشیت اور بربریت

ذیبو کی نمایاں دینے لگتے ہیں، حالانکہ اگر یہ وحشیت اور لاقانونیت ہوتی تو اقوام متحدہ میں سعودی عرب کو رکنیت وشمولیت نہ ملتی، اور امریکن جرائم سے عاجز آئے ہوئے اجتماعیات کے ماہر اور اسپشلسٹ، جرائم کے انسداد کے لئے سعودی عرب کی مثال استحسان اور خوبی کے لہجے میں بار بار پیش نہ کرتے ـــ اور یہ ہمدرد یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس طرح سوسائٹی میں ہر طرف لنجے اور لنگڑے نظر آئیں گے، حالانکہ اگر بفرضِ محال ایسا ہو بھی تو وہ اس سے تو بہتر ہے کہ سوسائٹی میں ہر طرف ساہوکار کے بھیس میں چور، رشوت خور، قانون شکن، اور اخلاق باختگی کے دلدادے، ظلم وستم میں درندے، اور مکر وفریب پر فریفتہ لوگ نظر آئیں، حالانکہ بات ایسی نہیں ہے، اس سلسلے میں ہم اختصار کے ساتھ وہی جواب دے سکتے ہیں جو اسلامی تربیت اور حدود کی حکمت کے سلسلے میں اوپر لکھا گیا ہے، اور اس کے بعد ہاں ان لوگوں کے لئے جن کے زندہ اور حساس ضمیر کے لئے جو چوری، ڈاکہ، حرام خوری، حرام کاری، شراب نوشی، بلیک، ذخیرہ اندوزی، سود خواری اور ان جیسی رزیلتوں اور لاخلاقی حرکات کے خلاف پابندی کو برداشت نہیں کرسکتے اور اسلامی حدود پر اعتراض کرتے ہیں آپ دو جواب اور بھی دے سکتے ہیں، ایک عقلی اور ایجابی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا واقعاتی اور سلبی پہلو رکھتا ہے، یہ دونوں جواب دوبارہ لکھنے کے بجائے راقم اپنی مطبوعہ کتاب سے پیش کرتا ہے اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، چوری کی وجہ سے اکثر گھرانوں کا سکون مٹ جاتا ہے، برسوں کی پونجی لٹ جاتی ہے اور نوبت چور کی طرف سے قتل تک آجاتی ہے اور سوسائٹی سے چوری ختم نہیں ہوتی، اس کے برخلاف جب اسلامی حدود نافذ تھیں شاذ ونادر ہی چوری ہوتی تھی اور آج بھی دنیا میں سب سے کم چوری کی شرح سعودی عرب میں ہے۔ حیرت نہیں تو اور کیا ہے کہ وحشی، لیٹری اور چوری کی عادی قوم، ـــ آج سے پچاس سال قبل کے احوال جاننے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں ـــ کس طرح ایماندار اور چوری سے باز رہنے والی بن گئی، کوئی

صاحب یہ توجیہ نہ کریں کہ مال وزر کے انبار انھیں مل گئے، کیونکہ امریکہ یقیناً سعودی عرب سے زیادہ مالدار، زیادہ تعلیم یافتہ اور عصرِ حاضر کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے، وہاں چوری اور سنگین جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور اس کے حساب کے لیے اب منٹ تک ناکافی ہو کر نوبت سیکنڈ وں تک آ گئی ہے، اور اس کے مقابلے میں شاہ عبدالعزیز کی پوری مدت حکومت چوبیس سال میں صرف سولہ چوری کی وارداتیں ہوئیں، جبکہ عبدالعزیز کا شروع زمانہ فقر و مصائب اور مشاکل کا زمانہ تھا، یہ بجائے خود اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا جائے تو ہر طرف لنجے ہی لنجے نظر آئیں گے حالانکہ یہ اعتراض بالکل قابل اعتبار نہیں، کیونکہ اس طرح تو پھر ہر اچھی چیز کو چھوڑنا پڑے گا، موٹروں کو ایکسیڈنٹ کے خطرے اور سوسائٹی میں اپاہج پیدا کرنے کے الزام میں چھوڑنا پڑے گا، ہوائی جہاز، فیکٹریاں اور تعمیر و ترقی کے سارے پلان بند کرنے پڑیں گے کیونکہ عام فائدہ کی ہر چیز میں کسی نہ کسی فرد کے لیے کوئی نقصان نکل ہی سکتا ہے۔ اس سلسلے کی آخری بات رہ گئی، وہ یہ کہ عصرِ حاضر کے ترقی پسند، آزاد اور مہذب ذہن اور زندہ ضمیر سے جو حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کرے کہ قاتل کو قتل کیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹا جائے، اور اسلامی قصاص و حدود کو قبول کر لے جس جس طرح عالمی ضمیر نے ویٹ نام میں ہلاکت کا سامان بہم پہنچایا ہے اور سرخ انقلاب میں پانچ ملین انسانوں کو آزادی اور مساوات کے نام پر خاک و خون میں تڑپایا، اسلامی خلافت کے سارے مشرقی و مغربی علاقوں پر ظلم و ستم کی دردناک کہانیاں پیش کیں، پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی اجازت دی، چور کی سزا قتل تک تجویز کی، سامراجی زمانہ میں پھانسی کے تختے لگائے۔ انسان کی چربی سے صابون بنائے گئے، انسانی کھال جوتوں میں استعمال کی گئی، آتشیں بموں نے شہروں کو ویران اور جسموں کو خاکستر بنایا اور پستول کی گولیاں چوروں، ڈاکوؤں اور بعض اوقات قانون اور امن کے محافظوں کے ذریعہ ہر پرامن شہری کے سینے کو داغدار کرنے

کا ارمان رکھتی ہیں، اور آبرو باختگی اور جنسی انارکی کے مریض ہر عفت مآب گھرانے کا سکونِ دل لوٹنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں، ایسے پاکباز، طاہر و نظیف اور بیدار مغربی و مشرقی، مسیحی یا ملحد عالمی ضمیر پر ذرا سی کوشش بھی اگر کی جائے تو شاید مجرم کو شرعی طور پر سزا دینے پر وہ راضی ہو ہی جائے اور اسلام کی منظم اور محتاط طریقوں پر نافذ کی جانے والی حدود اسے اپنے غیر قانونی کردار اور جنگل کے دستور کے مقابلہ میں زیادہ منصفانہ، ہلکی اور موثر نظر آئیں[1]۔

---

[1] تخلیق انسانی کا مقصد دین و شریعت کا قیام ۱۸۹ — ۱۹۰ مطبوعہ دار التصنیف والترجمہ بھوپال

مکتوبات مجدّد الف ثانی

از جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ مطابق ۵ جون ۱۵۶۴ء کو ہوئی اور وفات ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۶۲۴ء میں، آپ کا پورا نام ابوالبرکات احمد بدرالدین ہے اور لقب امام ربانی مجدد الف ثانی، مجدد صاحب کے چھٹے دادا امام رفیع الدین فیروز شاہ تغلق کے دور میں سرہند آکر آباد ہوئے، امام رفیع الدین اپنے وقت کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے اور ان کی اولاد بھی صلاح و تقویٰ اور علم کے زیور سے آراستہ رہی، حضرت مجدد صاحب کے والد بزرگوار کا نام مخدوم عبدالاحد ہے، مخدوم خواجہ عبدالاحد جید عالم اور پاک باز صوفی تھے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت شیخ گنگوہی رح کے صاحبزادے شیخ رکن الدین رح سے حاصل کی، مخدوم عبدالاحد کے سات صاحبزادوں میں مجدد صاحب چوتھے صاحبزادے ہیں، مجدد صاحب کی پیشانی پر بچپن ہی سے ہوش مندی اور ذکاوت و نجابت کے آثار نمایاں تھے، بچپن میں ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے، آپ کی والدۂ ماجدہ نے اس وقت کے بزرگ شیخ کمال قادری کیتھلی سے دعائے صحت کی درخواست کی، شاہ صاحب نے دعا کی اور فرمایا پریشان نہ ہو، یہ بچہ بڑا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس سے بڑے بڑے کام لے گا، تو سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور پھر اپنے والد ماجد خواجہ عبدالاحد اور دوسرے علماء سے محنت، لگن اور مکمل

انہماک سے مروجہ کتابیں پڑھیں ، ۱۷ سال کی عمر میں تمام کتب درسی سے فراغت حاصل کرلی اور والد سے تجدید بیعت کی ، مجدد صاحب کی جو کیفیت علوم ظاہری کی تحصیل کے وقت تھی وہی کیفیت مراحل سلوک طے کرنے کے وقت رہی ، چنانچہ مدارج تصوف سے جلد جلد گزرتے چلے گئے اور ان منازل کی تکمیل کے بعد والد صاحب نے آپ کو سندِ خلافت مرحمت فرمادی۔

۱۰۰۸ھ حج کے ارادے سے دہلی پہونچے اور آپ کی ملاقات شیخ حسن کشمیری سے ہوئی ، شیخ حسن مجدد صاحب کی طالب علمی کے زمانے کے دوست اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ، ان کو مجدد صاحب کے رجحانات کا اندازہ تھا کہ طریقۂ نقشبندیہ سے قلبی لگاؤ ہے اور کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں رہتے ہیں ، اسی بنیاد پر شیخ حسن نے اپنے مرشد کا ذکر کیا اور خواہش کی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات کریں ، مجدد صاحب ان کے ساتھ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ، دونوں صاحب کمال تھے اور دونوں کے دل انوار الٰہی سے منور تھے ، ملاقات کے ساتھ ہر ایک کی حالت و کیفیت دوسرے پر منکشف ہوگئی اور اس طرح آپ کی دیرینہ آرزو بر آئی اور حضرت خواجہ صاحب کے سلسلہ میں داخل ہوگئے دو اڑھائی سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کمالات کے اعلیٰ درجات تک پہونچادیا یہاں تک کہ خواجہ صاحب نے اپنے تمام مریدوں کو آپ کی تربیت میں دے دیا ، خواجہ صاحب کا ۲۵ جمادی الاُخریٰ ۱۰۱۲ھ کو وصال ہوگیا اور مجدد صاحب سرہند واپس تشریف لے آئے ۔ حضرت مجدد صاحب کا دور اکبر اور جہانگیر کی شوکت و سطوت کا دور تھا ، مغل سلاطین کے اس دور میں آپ نے حق کی شان اور صداقت کی آن قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کے مصائب برداشت کئے یہاں تک کہ دو سال تک قلعۂ گوالیار میں قید بھی رہے بالآخر وقت کے اقتدار اعلیٰ کو

آپ کی عزیمت کے سامنے جھکنا پڑا اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے آپ نے جو راہ اختیار کی تھی زندگی کے آخری لمحات تک اُس پر ایک مضبوط چٹان کی طرح جمے رہے، زیرِ نظر ریڈیائی تقریر حضرت مجدد صاحب کے حالات و سوانح اور مجددانہ کارناموں کی تفصیل پر نہیں صرف مکتوبات اور ان کی خصوصیات پر ہے، ریڈیو سے جو تقریریں نشر ہوتی ہیں، مختصر بھی ہوتی ہیں اور ان کا رنگ بھی جدا ہوتا ہے، امید ہے قارئین اس تقریر کو اسی نظر سے پڑھیں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ہندوستان میں اسلامی دور کے ملفوظات اور مکتوبات کا معتبر و مستند سرمایہ بہت کم ہے، ملفوظات و مکتوبات دونوں میں تحریف و تلبیس کا امکان زیادہ ہوتا ہے، ملفوظات کے بہت سے مجموعے جنھیں لوگ مستند سمجھتے ہیں فی الحقیقت بے اصل اور موضوع ہیں۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رح کی اس جعلی لٹریچر کے متعلق یہ رائے تھی: "درآں بسیار الفاظ است کہ مناسب اقوال ایشاں نیست" اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی معتبر مجموعۂ ملفوظات و مکتوبات سامنے آگیا ہے تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی اثر آفرینی سے پورے ماحول اور سماج کو متاثر کیا ہے بلکہ دلوں کی دنیا بدل دی ہے، شہنشاہِ سخن امیر خسرو نے امیر حسن علاء سنجری کے مرتب کردہ مجموعۂ ملفوظات حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رح "فوائد الفواد" کے متعلق بے اختیار کہہ دیا تھا "کاش کہ تمامی کتب کہ عمر دراں صرف کردہ ام برادر امیر حسن را بودے، و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردہ است مرا بودے" یعنی کاش میری تمام تصنیفات جن کی ترتیب و تدوین پر عمر کا بہترین حصہ صرف ہوا ہے برادر امیر حسن کی ہوتیں اور صرف ان کے جمع کئے ہوئے سلطان المشائخ کے ملفوظات میرے ہوتے" بہرحال بہت تھوڑے حضرات ایسے ہیں جن کے ملفوظات اور مکتوبات کو سندِ اعتبار و صحت اور نعمتِ مقبولیت حاصل ہو سکی ہو، حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی رح کے مکتوبات ہمارے ملک کے اسلامی دور کے سب سے قیمتی، سب سے محفوظ اور

ضخیم و عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، معرفت و تصوف کی چند ہی کتابوں کو وہ شہرت و عظمت اور قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے جو مکتوبات امام ربانی کے حصے میں آئی، مجدد صاحب کی حیات ہی میں اُن کے خطوط کی نقلیں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں اور لیل و نہار کی ہزاروں گردشوں کے باوجود آج بھی اُن کی اہمیت و مقبولیت کا یہی عالم ہے ، فارسی سے دوسری زبانوں میں ترجموں کے علاوہ روس کے ایک مکی مہاجر ملا مراد نے عربی میں ان کا ترجمہ کیا جو ٹائپ میں چھپ کر تمام عرب ممالک میں پہونچ گیا، عربی زبان میں اشاعت کے بعد حدیث و تفسیر کی کتنی ہی کتابوں میں مکتوبات کے مضامین نقل کئے گئے. علی الخصوص سلطان عبدالحمید خاں ترکی خلیفہ کے عہد کے مشہور و مقبول عالم علامہ سید محمود آلوسی کی تفسیر "روح المعانی" میں تو اس کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے کہ جس جگہ بھی ان مکاتیب کے ذکر کا موقع آجاتا ہے "قال المجدد الفاروقی" کے نام سے آپ کے خاص خاص نظریات اور تعبیرات کو بڑے اہتمام سے پیش کرتے ہیں اور اہم تر مسائل کے تصفیہ میں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان مکتوبات کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ ایک طرف ان کے مضامین عالیہ کی اثر انگیزی، ان کی انقلابی اور اصلاحی اسپرٹ، صاحب مکتوبات کی وسیع و عمیق علمیت اور روحانی شرف و فضیلت ہے، دوسری طرف ان کا اچھوتا اور دل نشین طرزِ تحریر ہے۔ مکتوبات کو پڑھکر یہ حقیقت پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے کہ حضرت مجدد، ایک مجددِ وقت، ایک دانائے روزگار حکیم، ایک بلند پایہ عالمِ دین اور ایک بیدار قلب روحانی پیشوا ہی نہیں تھے بلکہ اول درجہ کے انشاء پرداز بھی تھے، جن کی تحریریں ادب و انشاء کی نزاکتیں اور لطافتیں موجود ہیں۔ وہ تحریر خطوط کے وقت تحریر کی انشائی اور ادبی باریکیوں پر مبصرانہ نظر رکھتے تھے، ان کے مکتوبات کے بڑے حصے میں علمی، دینی اور حکمت و معرفت کے مسائل ہیں اور اُن پر محققانہ بحثیں ہیں، ان کے بیان کے لئے انھوں نے وہی عالمانہ تحقیقی طرز تحریر اختیار کیا ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی اور حقائق ادا ہو جائیں، وہ اگرچہ ارباب تصوف

اور اصحابِ باطن کی مروجہ اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور اسی لئے ناواقف لوگوں کو بعض مطالب کے سمجھنے میں دشواری بھی پیش آتی ہے، لیکن ان میں ثقیل الفاظ بہت کم ہیں، خاص طور پر ان خطوط کی زبان جو عقیدوں کی وضاحت یا مبتدیوں اور نوجوان طالبوں کے لئے لکھے گئے ہیں نہایت سلیس، سبک اور عام فہم ہے۔ مکتوبات کا ایک حصہ ہم عصر اُمراء کے نام ہے، اس میں ان امیروں اور دولت مندوں کو روحِ شریعت کی حفاظت اور دینِ حق کی مدد کی تلقین کی گئی ہے، اس طرح کے تمام مکاتیب کا اندازِ تحریر علمی خطوط سے قطعی طور پر مختلف ہے، ان خطوط میں عالمانہ بھاری بھرکم اصطلاحیں کم ہیں، الفاظ اگرچہ روحانیت کے پُرشکوہ قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن سریع الفہم ہیں، آسانی سے اُن کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے، اس کے باوجود اسلوب بیان میں خطیبانہ جوش اور داعیانہ ولولہ ہے، اِن خطوط کا ایک ایک لفظ روحانی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ تمام خطوط دلِ پاک باز سے نکلے ہوئے جذبات کا صاف و شفاف آئینہ ہیں اس لئے قدرتی طور پر ان کا اثر براہِ راست باطن پر پڑتا ہے اور دل کی شکنیں کھلتی چلی جاتی ہیں، پیش نظر مقصد کی تشریح کے لئے کہیں کہیں کوئی نفیس شعر یا شعر کا کوئی مصرعہ بھی استعمال کرتے ہیں جس سے مضمون کی دل نشینی اور اثر انگیزی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ الفاظ کے موزوں انتخاب اور تقابل کے حُسن کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کی ادبی اور روحانی طاقت سے ایک عظیم اور زبردست سماجی انقلاب کی آبیاری کی، ایک پورے عہد کو بدل ڈالا اور ایک نئے عہد اور اُس کی لطافتوں اور امنگوں کو پیدا کیا۔ اُن کے دامنِ عقیدت کے وابستگان میں درویش بھی ہیں اور صوفی بھی، سالک بھی ہیں اور مجذوب بھی مادہ پرست فلسفی بھی ہیں اور عارفینِ حق اور کاملین حکمت و معرفت بھی، نامور فاتحین بھی ہیں اور صاحب سطوت اُمراء بھی۔ آئیے اس پس منظر کی روشنی میں ان کے مکتوبات پر ایک ہلکی سی نظر ڈالیں۔

حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کے تین دفتر اور تین حصے ہیں، حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کے بعد اِن مکاتیب کی ابتدار ہوئی، کم وبیش چار سال کی مدت میں بیس خط اپنے پیر و مرشد کو لکھے، ان مکتوبات کی حیثیت باقی خطوط کے سرنامے کی ہے، اس طرح تحریرِ خطوط کی ابتدار ۱۰۰۸ھ سے ہوئی ہے۔ مکتوبات کے پہلے دفتر کے جامع اور مُرتب مولانا یار محمد الجدید البدخشی الطالقانی ہیں، ۱۰۲۵ھ میں مکتوبات شریف کی تعداد ۳۱۳ ہو گئی تو تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق حضرت مجدد صاحب نے مولانا یار محمد سے فرمایا کہ خطوط کی یہ تعداد اصحابِ بدر کی تعداد کے برابر ہو گئی ہے، بہتر ہو کہ اس دفتر کو اسی تعداد پر ختم کر دو، اس کے بعد خطوطِ مبارک کو مولانا عبدالحی حصاری نے جمع کرنا شروع کیا، ۱۰۲۸ھ میں دفترِ دوم کے خطوط کی تعداد ۹۹ ہو گئی تو ارشاد ہوا کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد بھی یہی ہے، اس حصے میں یہی تعداد رہے۔

تیسرے مرحلے میں آپ کے خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی نے یہ خدمت انجام دی، یہاں تک کہ جب خطوں کی تعداد ۱۱۴ ہو گئی تو فرمایا، قرآن مجید کی سورتوں کی بھی یہی تعداد ہے، تبرکاً وتیمناً اس حصے کو اسی عدد پر ختم کر دو، یہ ۱۰۳۱ھ کا واقعہ ہے، بعد میں اس تیسرے حصہ میں چند مکاتیب کا اور اضافہ ہوا، دفتر اول کا نام دُرّ المعرفت، دفترِ دوم کا نام نور الخلائق اور دفتر سوم کا نام معرفۃ الحقائق ہے۔

مجدد صاحب کی شخصیت کی طرح اُن کے خطوط کا یہ عظیم الشان ذخیرہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتا، اُن کے طرزِ تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ جمع ہو گئے ہیں، کہیں زورِ خطابت ہے، کہیں متکلمانہ اور فقیہانہ موشگافی اور کہیں انتہائی علمی متانت و وقار اور ہر منزل میں اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت اور اندازِ بیان کی اہمیت کا احساس، ــــ شریعت و طریقت اور حقائق و معرفت کے اس بحرِ ذخار کو اگر مختصر عنوانوں میں یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مکتوبات کا بنیادی تعلق تین عنوانوں سے ہے (۱) دینی،

(۲) سماجی اور اصلاحی (۳) سیاسی۔ دینی مکاتیب میں تصوف کے نازک اور الجھے ہوئے مسائل کو آپ نے جس حُسن و خوبی اور تحقیق و بصیرت سے حل فرمایا ہے اس کا پڑھنے سے تعلق ہے، ایک مکتوب میں عالمِ مثال کے متعلق لکھا ہے، یہ عالم صرف دیکھنے کی جگہ ہے، رہنے کی نہیں، کیونکہ یہ عالمِ روح اور عالمِ جسم کے درمیان میں ہے اور آئینہ کی طرح ہے، اس میں ان دونوں عالموں کا عکس نظر آتا ہے۔ توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی کے مسئلے پر معرکۃ الآرا مباحث اور تحقیقات ہیں، آپ نے ان مغالطہ انگیز بحثوں کو زیادہ سے زیادہ دل پذیر بنانے کی کوشش کی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "بے شبہ توحید وجودی کا مقام سالک کو پیش آتا ہے لیکن یہ مرحلۂ اول ہوتا ہے، انتہائے سفر نہیں ہے، اس مقام میں سالک نے شرابِ محبت کا جام پیا ہے، جس نے اس کو مدہوش کر دیا ہے، اس کو نہ اپنی خبر ہے نہ دوسروں کی، جب تک بے ہوش رہے گا اس کو محبوب حقیقی کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، اس مقام کی بے ہوشی اتنی پُرکیف اور رنگین ہے کہ اس سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا، اس مقام کے بعد عالمِ ظلال اور عالمِ خمار ہے، یعنی بے ہوشی اور ہوش کے درمیان کی حالت، اس مقام اور حال میں سالک نہ پورے ہوش میں ہوتا ہے نہ پوری مدہوشی میں، اس عالم کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کامل ہوش اور صحو کا مقام آتا ہے، اس کا نام مقامِ عبدیت ہے، یہ انکساری اور خاکساری کا مقام ہے، اس مقام پر بندہ بندہ ہے اور خالق خالق ہے، یہی مقام حضرات انبیاء کا ہے، جن سے اللہ کی مخلوق کی رہنمائی اور ہدایت وابستہ ہے، اس منصب پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو کامل ہوش میں ہو، اس مقام پر پہونچنے کے بعد سالکِ راہِ طریقت کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مدہوشی کے پہلے مقام میں اس کی زبان پر "تو ہی تو" کا جو نعرہ تھا وہ شرابِ محبت کا اثر تھا، بنابریں یہ توحید صرف شہودی ہے، حقیقی اور وجودی نہیں" وحدۃ الوجود کا سہارا لے کر بعض نام نہاد صوفیوں نے، اتحاد و حلول کی مصیبت اور گمراہی کھڑی کر دی تھی، حضرت مجدد صاحب نے اس زندقے اور الحاد کے خلاف بھی زبردست جنگ کی اور اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں

کے ساتھ حق کو واضح کیا، اس سلسلے میں اُن کے بہت سے خطوط مطالعہ کے لائق ہیں۔ مکتوب ۴۴ دفتر دوم میں تحریر فرماتے ہیں، جو حضرات وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے قائل ہیں اُن کا منشا و مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزیں اس کے ساتھ بالکل متحد ہیں اور حق تعالیٰ مرتبۂ تنزیہ سے اتر کر دائرہ تشبیہ میں آگیا ہے اور واجب ممکن بن گیا ہے، یہ سب کچھ الحاد اور گمراہی ہے، ہمہ اوست، کے معنیٰ یہ ہیں کہ صرف وہی موجود ہے اور سب نیست ہیں۔ مکتوب ۸۹ دفتر سوم میں لکھتے ہیں "جو صوفیائے کرام ہمہ اوست کے قائل ہیں وہ عالم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں جانتے اور علول وسریان ثابت نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ظلیت کے اعتبار سے کہتے ہیں وجود و تحقق کے لحاظ سے نہیں، اگرچہ اُن کی عبارتوں اور بیانات سے اتحادِ وجودی کا شبہ ہوتا ہے لیکن ان کی مراد ہرگز یہ نہیں، یہ تو کھلی ہوئی گمراہی ہے، اس لئے "ہمہ اوست کے معنیٰ، ہمہ از وست" ہی کے ہیں یعنی ظہور و شہود جو کچھ ہے اسی سے ہے۔ حضرت مجدد صاحب کی ٹھوس اور خاموش انقلابی تحریک کا ہلکا سا نقشہ مکتوب ۶۵ دفتر اول، مکتوب ۸۱ دفتر اول، مکتوب ۶۷ دفتر دوم، مکتوب ۴۷ دفتر اول اور مکتوب ۵۴ دفتر سوم اور اسی طرح کے بہت سے خطوط سے سامنے آجاتا ہے۔ خان جہاں جو سلطانِ وقت جہانگیر کے مقربانِ خاص میں تھے اُن کو ایک طویل مکتوب میں لکھتے ہیں۔ دیکھو بادشاہ مثل روح کے ہوتا ہے اور باقی انسان بمنزلہ جسم کے، روح ٹھیک ہے تو جسم بھی صحیح سلامت ہے، روح میں خرابی آجائے تو جسم بھی خراب ہو جاتا ہے، ضروری ہے کہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرو کہ یہی تمام لوگوں کی اصلاح کی کوشش ہے۔ ایک خط میں شیخ فرید کو جو بارگاہِ سلطانی کے ممتاز مقربین میں شامل تھے، تحریر فرماتے ہیں "حاکمِ وقت کو دنیا سے وہی نسبت ہے جو پورے بدن سے دل کو ہے، دل صحیح ہے تو بدن بھی صحیح ہے، دل میں فساد آیا تو بدن اور جسم بھی فاسد ہو جائے گا۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہ کی صلاح و فساد سے دنیا کا صلاح و فساد وابستہ ہے"۔ اسی طرح عام ماحول اور سماج کی اصلاح کے سلسلے میں بھی بہت سے خطوط ہیں، مکتوبات مجدد الف ثانی کی یہی وہ غیر معمولی

خصوصیات ہیں جنھوں نے ان کو "ادبِ ملفوظ" کی تاریخ میں بے مثال بنا دیا ہے۔ آخر میں علامہ اقبال کے اشعار بھی سنتے جائیے جو انھوں نے حضرت مجدد صاحب کے مزار پر اُن کی شان میں کہے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّد کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ زمیں مطلعِ انوار

اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)

ادبیات

غزل

جناب فضا ابن فیضی

قلم بھی حرف بھی لوح و کتاب بھی لے جاؤ
جو سہہ سکو مرے فن کا عذاب بھی لے جاؤ

بھٹکنے دو مرے ماحول کو اندھیروں میں
جہاں سحر ہو وہیں آفتاب بھی لے جاؤ

جزیرۂ مہ و اختر کے جادہ پیماؤ
وہیں پہ اب مری دنیا کے خواب بھی لے جاؤ

پھر اس کے بعد مرا دردِ تشنگی پوچھو
لہو بھی بانٹ لو میرا، شراب بھی لے جاؤ

مرے نفس میں ہے صرف اس کے پیار کی خوشبو
ہواؤ! نکہتِ گل کا جواب بھی لے جاؤ

دیارِ سنگ میں کیا خالی ہاتھ جاؤ گے
یہ زخمِ سر کے سلگتے گلاب بھی لے جاؤ

جنوں سے کم نہیں آشفتگی میں دیوانو!
ہماری دانشِ خانہ خراب بھی لے جاؤ

جہاں محیط ہے ظلمت دمکتے چہروں کی
وہیں یہ دامن و جیب و نقاب بھی لے جاؤ

نہ جانے پیاس کا کب زاویہ بدل جائے
سبو کدوں میں چمکتے سراب بھی لے جاؤ

وہ بزمِ محشرِ دیدہ وراں سہی، لیکن
وہیں مری نگہِ انتخاب بھی لے جاؤ

صبا اسے بھی کسی شاخ پر سجا دے گی
چمن میں یہ مرا زخمِ شباب بھی لے جاؤ

اک اچھی شے ہے نشاطِ مطالعہ کے لئے
جو پڑھ سکو مرے دل کی کتاب بھی لے جاؤ

بہ قدرِ ذوق نہیں اس کی نغمگی بھی فضا
یہ اک غزل کا شکستہ رباب بھی لے جاؤ

تبصرے

الهند فی العهد الاسلامی (عربی) از مولانا سید عبدالحی الحسنی لکھنوی، تقطیع کلاں، ضخامت ۴۰۰ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن قیمت درج نہیں۔ پتہ: دائرۃ المعارف العثمانیہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ۔ ۷

مولانا سید عبدالحی صاحب الحسنی الکھنوی اپنے ہم نام مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی طرح جامعیتِ علوم وفنون، وسعتِ نظر اور کثرتِ تصانیف کے اعتبار سے ہندوستان کے ان بلند پایہ علماء اور مصنفین میں سے ہیں جو اگرچہ بیسویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے کارنامے کمیت وکیفیت، اور نوعیت کے اعتبار سے علمائے سلف کے نہج پر ہیں، اردو میں چند کتابوں کے علاوہ مولانا کی دو کتابیں "نزہۃ الخواطر" (دس جلدوں میں) اور "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" جو شائع ہو کر عام ہو چکی ہیں عربی لٹریچر میں حوالہ کی کتابوں کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مولانا کے ہی قلم سے عربی زبان میں ایک اور ضخیم کتاب حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے خرچ پر بڑے اہتمام کے ساتھ چھپ کر شائع ہوئی ہے، اور یہ بھی مصنف علام کی جامعیت اور خصائص تصنیف کے آئینہ بردار ہونے کے باعث بڑی عجیب وغریب کتاب ہے، یہ کتاب اصلاً تین فنون پر تقسیم ہے، فن اول جو ہندوستان کے جغرافیہ پر ہے ایک مقدمہ اور پانچ ابواب پر تقسیم ہے، ان میں پہلے جغرافیہ کے مصطلحات کی تشریح کی گئی ہے اور پھر ہندوستان کا جغرافیہ طبعی یعنی محل وقوع، یہاں کے پہاڑ، ندیاں، آب وہوا، پیداوار، پھول پھل، جڑی بوٹیاں، باغ وداغ، حیوانات، کانیں،

مذاہب اور زبانیں، صوبے، مشہور شہر، گاؤں اور قصبے، مشہور خطے اور علاقے، ہندوستان کا سیاسی جغرافیہ، یعنی وہ علاقے جن پر ہندوستانیوں (ہندو اور مسلمان) کا قبضہ ہے اور وہ علاقے جو انگریزوں، فرانسیسیوں یا پرتگالیوں کے زیرنگیں رہے، پھر باشندگان ملک کی مجموعی آبادی اور مذہب وار ان کی تقسیم اور اعداد وشمار، یہ تمام چیزیں نہایت مفصل مکمل اور مرتب بیان کی گئی ہیں، فن ثانی جو ہندوستان کے بادشاہوں پر ہے دس ابواب اور ہر باب کے ماتحت مختلف فصول پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان میں اسلام کی آمد پر گفتگو کرنے کے بعد غزنوی، غوری، خاندانِ غلامان، خلجی، تغلق، پٹھان، مغل جو دلی کے تخت پر قابض رہے۔ ان کے علاوہ سلاطینِ کشمیر، شاہانِ دکن، سلاطینِ گجرات، سلاطینِ شرق (جونپور) بادشاہانِ مالوہ (منڈو) پھر ملوک الطوائفی کے زمانہ کے بنگال، دکن، بہار واڑلیسہ، میسور، کرناٹک، اودھ اور روہیلکنڈ وغیرہ کے نواب اور امرار، ان سب کا تذکرہ بڑے سلیقہ اور عمدگی سے کیا گیا ہے، فن ثالث جو خطط اور آثار پر ہے اور ہمارے نزدیک یہی حصہ کتاب کی جان اور اس کا مغز ہے تین ابواب اور ہر باب کے ماتحت چند در چند فصول پر مشتمل ہے، اس حصہ میں جو ایک سو چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ان تمام رفاہی، علمی، تعلیمی، تمدنی اور مذہبی وسیاسی اقتصادی ومعاشی اور تاریخی وادبی کارناموں اور یادگاروں کا معلومات افزا اور بصیرت افروز تذکرہ جو مسلمان بادشاہوں، امرار، وزرار، اور نوابان وسلاطین کے حسن ذوق وعمل اور ان کی حوصلہ مندانہ کوششوں اور مساعی کی مرہون احسان ہیں، چنانچہ اس میں بادشاہوں کے عادات واطوار، ان کا رہن سہن، ان کے طور طریق، طریق جہاں بانی، فوجوں کی تربیت و ترتیب، ان کے دفاتر، عہدے اور منصب، جشن اور تہوار، ان کے مطعومات ومشروبات، ان کی عدالتیں اور ان کے دربار، ان کے ملبوسات اور تزئینات، ان کا مالی نظام، ان کے لگائے ہوئے باغات اور چمن، سڑکیں اور شاہراہیں، مساجد اور مدارس، ان کی عمارتیں، ان کے عہد کی ایجادات واختراعات، نہریں اور حوض، پل، بازار، شفا خانے، سرائیں، دسائل

رسل و رسائل، عجائب گھر، چڑیا گھر، غرض کہ ان میں کونسی چیز ہے جس کا مبسوط اور مکمل تذکرہ و تعارف ان صفحات میں نہیں ہے، علاوہ ازیں چونکہ فاضل مصنف کی وفات حسرت آیات ۱۹۲۳ء کے اوائل میں ہوگئی تھی۔ اور ظاہر ہے اس وقت سے لیکر اب تک جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اس ملک میں نہایت اہم اور عظیم تغیرات و تبدلات ہوئے ہیں، اس بنا پر مولانا کے فرزندان گرامی ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نے "تذئیل و تکمیل" لکھکر اس کتاب کو بالکل اپ ٹو ڈیٹ بنا دیا ہے اور حق یہ ہے کہ فنِ ثالث کا بڑا حصہ انھیں دونوں بھائیوں کا مرہون قلم ہے، باپ بیٹے ہوں تو ایسے ہوں، فرزندان ارجمند نے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان و بیان، معلومات اور اندازِ جمع و ترتیب کے اعتبار سے اصل کتاب کے کینڈے میں اس طرح کھپ گیا ہے کہ اصل اور تذئیل میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا، واقعی! ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔ مزید برآں مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نے شروع میں مختصر (مفصل سوانح عمری مولانا کے ہی قلم سے شائع ہو چکی ہے) مصنف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح حیات اور ایک مقدمہ کتاب بھی لکھا ہے، یہ دونوں بھی خاصہ کی چیزیں اور بہت مفید ہیں، مقدمہ میں مولانا نے بجا طور پر مصنف علام کا موازنہ علامہ مقریزی اور ابن عساکر کے ساتھ کرکے یہ بتایا ہے کہ جس طرح ان بزرگوں نے اپنے اپنے ملک کی تاریخ لکھکر اس کے خد و خال کو اجاگر کیا اسی طرح مولانا نے یہ کتاب لکھکر ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کا حق ادا کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس موضوع پر ابوالفضل کی "آئین اکبری" ایک نہایت جامع کتاب ہے، لیکن اولاً تو وہ فارسی میں ہے اور پھر اس میں اسی زمانہ تک کے حالات و واقعات ہیں، اس کے بعد فارسی، انگریزی اور کسی حد تک اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں موضوع بحث کا اس درجہ جزئیاتی استقصار اور استیعاب کیا گیا ہو، اس کتاب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عرب ممالک جو ہندوستان

میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ سے عام طور پر کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں وہ واقف ہوجائیں گے اور اس کا فائدہ نہ صرف مسلمانوں کو، بلکہ حکومت اور ملک کو بھی پہونچے گا، ہمارے خیال میں حاجی الدبیر کی کتاب "ظفر الوالہ بمظفر وآلہ" کے تجزیہ پہلی تاریخ ہے جو ہندوستان کے اسلامی عہد پر عربی زبان میں اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ فجزاہ اللہ عنا احسن الجزاء۔

معرکۂ ایمان ومادیت | از مولانا سید ابوالحسن علی الندوی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۴۹ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت مجلد ہے/3 پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

سورۂ کہف قرآن مجید کی ایک نہایت اہم سورت ہے اور احادیث میں اس کے فضائل ومناقب بہت کچھ بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا نے اس سورت کی تفسیر پر پہلے چند مضامین لکھے، پھر ان مضامین کو مرتب کر کے عربی میں ایک کتاب شائع کی اور اب یہ زیر تبصرہ کتاب اسی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو حسب معمول مولانا محمد الحسنی مدیر البعث کے قلم شگفتہ رقم سے ہے سورۂ کہف کی سب سے بڑی فضیلت جو احادیث میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اس کا ورد رکھے گا وہ آخر زمانہ میں دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ مولانا علی میاں یہ نہیں سمجھتے کہ دجال سے مراد کوئی خاص شخص ہے، بلکہ اس سے مراد ایک عظیم تہذیبی، سیاسی اور اجتماعی فتنہ ہے، جو تہذیب فرنگ کی شکل میں موجود ہے اور اور اس تفسیر کا سارا تار و پود اسی ایک مفروضہ سے تیار ہوا ہے، اگرچہ سورۃ میں چار قصے بیان کئے گئے ہیں، لیکن مولانا کے نزدیک ان سب کا موضوع ایک ہی ہے یعنی "ایمان اور مادیت کی کشمکش" اور یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، یہ کس طرح ؟ مولانا نے تاریخ، روایات اور تجربات ومشاہدات کی روشنی میں ان سب کو ثابت کرنے اور مغربی تہذیب کی ہولناکیوں اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیروں پر سورت کے مشتملات

کو منطبق کرنے کی سعی کی ہے، خود مولانا نے کتاب کے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے کہ "اس سورۃ کے بارہ میں جو کچھ آگے آئے گا وہ مفسرین کے مخصوص طریقہ پر نہیں لکھا گیا ہے، بلکہ صرف تاثرات اور واردات کا مرقع اور سورۂ کہف کا ایک عمومی اور اصولی جائزہ ہے"۔ (ص ۶ و ۷) ہماری رائے میں بھی اس کتاب کو سورۂ کہف کی تفسیر کہنا صحیح نہ ہوگا، بلکہ سورت کے مضامین سے مجموعی طور پر مغربی تہذیب کے پس منظر میں جو تاثرات پیدا ہوئے ان کا ایک بے ساختہ اور اثر انگیز بیان ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے قابل دید اور لائق مطالعہ ہے البتہ دو باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ مولانا نے (ص ۱۳) توریت کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی پر یقین اور اس کے لئے تیاری، زمین میں تخریب و فساد کی ممانعت اور زہد و قناعت کے مضامین سے خالی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر قرآن مجید میں اس کو "ہدایت" اور "نور" کیونکر فرمایا گیا؟ کیا ان بنیادی اور اہم مضامین سے خالی کتاب بھی قرآن کے نزدیک ہدایت اور نور ہوسکتی ہے؟ اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ توراۃ میں تحریف ہوگئی ہے، تو گزارش یہ ہے کہ تحریف تو حضور پر نور کے زمانہ میں ہی ہوگئی تھی، تو پھر اس کے باوجود قرآن نے اس کی کیوں مدح سرائی کی؟ اور کیا توراۃ اور انجیل سے متعلق قرآن کا جو رویہ ہے اس کے پیش نظر حسن ادب کا یہ تقاضا نہ ہوگا کہ ہم بھی اس معاملہ میں محتاط رہیں، اور جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی مذمت کریں اور جو لوگ ان تحریفات کے ذمہ دار ہیں ان کو ملامت کریں، لیکن نفس توراۃ و انجیل کو برا بھلا کہنے سے مجتنب رہیں، علاوہ ازیں (۲) دوسری بات یہ ہے کہ مولانا نے جو عملی اور اخلاقی برائیاں یہود اور نصاریٰ میں بتائی ہیں کیا آج مجموعی طور پر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق) خود مسلمان ان میں مبتلا نہیں ہیں جس کی سزا آج وہ بھگت رہے ہیں، اگر مبتلا ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر یہود اور نصاریٰ اپنی ان تمام معصیت کوشیوں کے باوجود "وراثت ارضی" کے کیوں مالک ہیں اور مسلمان روز بروز کیوں بے وقعت اور کم حیثیت ہوتے جا رہے ہیں؟ یہ وہ دو اہم سوال ہیں

حق پر مولانا علی میاں جیسے روشن خیال اور وسیع النظر عالم اور بلند پایہ داعی اسلام کو ضرور غور کرنا چاہئے، !! پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک اور سوال جو دماغ میں ابھرتا ہے یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک سورۂ کہف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا موضوع "ایمان اور مادیت کشمکش" ہے، گذارش یہ ہے کہ یہ تو قرآن مجید کا خاص موضوع ہے اور اس میں سورۂ کہف کی ہی کیا خصوصیت! قرآن مجید کا تو ایک صفحہ بھی اس مضمون سے خالی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ اچھا تو پھر آپ کے نزدیک سورۂ کہف کی کیا خصوصیت ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ سورۂ کہف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو بظاہر ایک بالکل انہونی بات اور خلافِ عقل واقعہ ہے لیکن جب قرآن نے اس کو بیان کیا ہے تو وہ سچا ضرور ہے، ایک مسلمان جب اس کو بار بار پڑھے گا تو اس کے دل پر خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و جلالتِ شان کا نقش زیادہ سے زیادہ گہرا ہوگا، اور اس کے دل میں اس بات کا بھی یقین پیدا ہوگا کہ حقائق کونیہ کے ادراک میں عقل ایک مسافر آبلہ پا ہے، اور اس کا سب سے یقینی ذریعہ وحی الٰہی ہے، ان دونوں چیزوں کے اذعان و یقین سے ایمان باللہ پختہ اور مستحکم ہوتا ہے اور انسان اندھا بن کر عقل کے پیچھے دوڑنے سے باز رہتا ہے، پس یہ ہے سورۂ کہف کی وہ خصوصیت جس کے باعث اس کے اتنے فضائل و مناقب بیان فرمائے گئے ہیں۔

موجودہ دُنیا میں "اسلام" ہی نے "تبلیغی مذہب" کی یہ کہکر بنیاد رکھی تھی کہ "تم حسین ترین اُمت ہو اس لئے کہ تم بھلائیوں کو نافذ کرتے ہو ۔۔ بُرائیوں کی راہ بند کرتے ہو اور اللہ پر یقین کامل رکھتے ہو"۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج ساری دنیا میں اگر کوئی غیر تبلیغی مذہب ہے وہ اسلام ہی ہے اعیسائیت آج اپنا پیغام ساری دنیا کی قوموں کو ان کی اپنی زبان میں اس طرح پہنچا رہی ہے کہ اگر کسی کا پتہ انھیں مل جاتا ہے تو فوراً ان کا لٹریچر بلا قیمت آنا شروع ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ آج دُور اُفتادہ امریکہ میں بُدھ مت اور ہندو مت کے تبلیغی مرکز قائم ہو رہے ہیں اور یہ سارے مذاہب اور ان کے اصحاب خیر اپنی دولت اس مہم میں جھونک کر ان کے اصحاب قلم کو مفت مذہبی لٹریچر پھیلانے میں بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ ہماری تبلیغ کی ساری دوڑ دھوپ مسجد تک ہو کر رہ گئی یا قلمی راہ سے مسلمانوں کیلئے اردو ہندی میں کچھ رسالے نکالنے اور کتابیں چھاپنے سے شروع ہو کر وہیں کی وہیں ختم ہو گئی ۔ اسلام سے محروم انسانیت کا پورا سمندر ہماری تبلیغی رسائی سے دُور ہو کر رہ گیا۔ ہمارے پاس کوئی ایک بھی ایسا ادارہ نہیں کہ جو مختلف قوموں کی نفسیات کے مطابق ان کی اپنی زبانوں میں مفت لٹریچر شائع کرتا اور تقسیم کر سکتا ہو۔

خدا کا کس طرح شکر ادا کیا جائے کہ اس نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ہندی میں اسی مقصد کیلئے ماہنامہ "**مارگ دیپ**" نکالنے کی توفیق بخشی اور بہت جلد اس کو ان دردمندانِ انسانیت کی بارگاہ میں باریابی اور اس مقصد کی پکار بلند کرنے کی راہ دکھائی۔

اب ۔۔ ہم اس حقیر آواز کے ذریعہ ان تمام انسانوں کو ان کے اس عظیم ترین فرض کی پکار سناتے ہیں کہ جو کل ساری دنیا کے معبودِ حقیقی سے ملاقات کے دن اس معاملے میں سرخروئی کی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس مقدس ترین کام میں تعاون کر کے اپنے نامۂ اعمال کو ایک بلند ترین نیکی سے آراستہ فرمائیں۔ اعزازی خریداری کی رقم پانچ سو (۵۰۰) روپے سالانہ سے سو (۱۰۰) روپے سالانہ تک ۔۔ عام خریداروں کی رقم محض پانچ روپے سالانہ رکھی گئی ہے جو تقریباً لاگت کے بقدر ہے۔ اس لئے کہ اس رسالہ سے ہمارا مقصد اس سرائے فانی میں دولت کے ڈھیر لگا کر مرجانا نہیں ہے ۔ وباللہ التوفیق!

(ایڈیٹر ماہنامہ مارگ دیپ روشنی پبلشنگ ہاؤس، خسرو باغ روڈ، رام پور (یوپی)

انکم ٹیکس دہندگان!

محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے

ٹیکس دہندگان کو الاٹ کیا گیا ہے تاکہ ادائیگیوں کے چالانوں، گوشواروں اور دوسری خط و کتابت کو صحیح ڈھنگ سے ریکارڈ رکھا جاسکے اور انہیں فائل کیا جاسکے۔

اگر غلطی سے آپ کو دو مستقل کھاتہ نمبر الاٹ ہوگئے ہیں یا کوئی بھی نمبر الاٹ نہیں کیا گیا، تو براہ کرم اپنے انکم ٹیکس افسر / کمشنر انکم ٹیکس سے کہیں کہ وہ آپ کے دوسرے نمبر کو منسوخ کردیں یا کوئی نمبر الاٹ کریں۔

براہ کرم اپنے گوشواروں، چالانوں وغیرہ پر اپنے مستقل کھاتہ نمبر کا صحیح طور پر حوالہ دینا نہ بھولیں۔ اس سے جہاں آپ محکمہ کی مدد کریں گے، وہاں محکمہ بھی آپ کی بہتر طور سے انجام دے سکے گا۔

جاری کردہ:
ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس، پبلیکیشن)
نئی دہلی

برہان

جلد ۷۱	ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۳ء	شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی کا ۶۷-۶۸ برس کی عمر میں لکھنو میں انتقال ہوگیا، مرحوم بلندپایہ عالم اور خوش بیان مقرر ہونے کے علاوہ بڑے صالح اور متقی بھی تھے۔ فقہ ان کا خاص فن تھا اور استعداد بڑی پختہ تھی، اپنے معمولات کے بڑے پابند اور جو بھی ان کے افکار وخیالات تھے ان میں سخت جامد اور کٹر تھے۔ تواضع، فروتنی، سادگی اور بے لوثی ان کے اوصاف خصوصی تھے، ان اوصاف وکمالات کے باعث لکھنو کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، چنانچہ ان کے جنازہ کے نہایت عظیم جلوس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگوں کے علاوہ ان کی تعزیت کرنے والوں میں غیر مسلم حضرات کی بھی معتدبہ تعداد شامل تھی، عمل اور اخلاق کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ میں جس سال (غالباً ۲۱ء) مدرسۂ امدادیہ مرادآباد میں داخل ہوا ہوں اسی سال مرحوم بھی اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالغفور مرحوم کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اور مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی نگرانی میں رہتے تھے، دونوں بھائی نہایت کم آمیز، شرمیلے اور کم گو تھے، اور طلبا سے بہت کم ملتے جلتے تھے، ایک عرصہ دراز کے بعد علی گڑھ میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یہ زمانہ یاد دلایا تو انھیں یاد آگیا اور اس کے بعد ابھی ایک برس پہلے جب یہاں دلی میں ملاقات

ہوئی تو بڑی محبت اور تعلق خاطر کے ساتھ پیش آئے۔ اب ایسے باوضع، پاک باطن اور پاک نظر لوگ کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ ان کے درجات، ومراتب بلند فرمائے، آمین

خدا خدا کر کے لاکھوں ستم دیدگان روزگار انسان جن میں جوان اور بوڑھے بھی تھے، مرد اور عورتیں بھی، بچے اور بچیاں بھی اور جو دو برس سے امید وبیم اور خوف و رجا کی زندگی تینوں ملکوں میں الگ الگ بسر کر رہے تھے ان کی خلاصی ورستگاری کی راہ پیدا ہوئی اور ہندوستان وپاکستان کی حکومتوں کے نمائندگان خصوصی کی بات چیت پچھلے دنوں نئی دہلی میں کامیاب رہی، تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جنگ ہوتی ہے ہزاروں میدان جنگ میں کام آجاتے ہیں اور ہزاروں انسان اپنی آبادیوں میں رہتے ہوئے تباہی اور بربادی کے عفریت کا لقمہ بن جاتے ہیں، پھر جو بچ رہتے ہیں وہ مستقبل میں زندگی بسر کرنے کا نقشہ بناتے ہیں اور اب وہ بھول جاتے ہیں کہ کل کسی نے کسی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ آج تاریخ نے پھر اپنا وہ سبق دہرایا ہے اور مدیہ ہے کہ مصالحت کی گفتگو کے کامیاب ہو جانے کا سہرا خود پاکستان بنگلہ دیش کے سر باندھ رہا ہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس کریڈٹ میں ہندوستان اور پاکستان کا حصہ بھی برابر ہی کا ہے، بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اور اس سے انکار نہیں کہ بہت کچھ ہو چکا ہے اور تینوں ملک معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے اب تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور نہیں معلوم کب تک بھگتتے رہیں گے، اگر مصالحت کی بنیاد تینوں ملکوں کا یہ عزم صمیم اور سچے دل سے ان کا یہ عہد ہے کہ آیندہ وہ مل جل کر دوستی اور یگانگت کے جذبہ کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ خیر اندیشی اور خیر سگالی کا ہوگا تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ مصالحت بڑا مبارک اقدام ہے اور اس کو برصغیر میں پائدار امن اور تینوں ملکوں کی ترقی اور خوش حالی کے لئے ایک فال نیک اور اس کا پیش خیمہ کہنا

چاہیئے، ایک زمانہ میں یورپ کا کیا حال تھا؟ ایک ملک دوسرے ملک سے نبرد آزما تھا، آئے دن باہمدگر دست وگریبان رہتے تھے، اور وحشت و بربریت کا وہ کونسا سلوک تھا جسے ایک ملک اپنے حریف ملک کے لوگوں کے لئے روا نہ رکھتا ہو، لیکن علم وفن کی ترقی اور تہذیب و شائستگی کے عروج کے باعث اب ان کا کیا عالم ہے! اور کس طرح یورپ کے یہی ملک ایک دوسرے کے ساتھ متحد اور متفق ہیں، اگر مغرب میں یہ تجربہ کامیاب ہوسکتا ہے تو یہاں کیوں نہیں ہوسکتا، علی الخصوص اس وقت جب کہ اب سے ایک ربع صدی پیشتر یہ تینوں ملک ایک ہی تھے اور اب بھی جغرافیائی حدبندیوں کے باوجود تینوں میں نسلی، تاریخی، ثقافتی، لسانی اور تہذیبی روابط اور تعلقات ہیں، ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے یہ مصالحت پائدار امن کا پیش خیمہ ہو اور تینوں باہمدگر صلح وآشتی اور دوستی کے ساتھ رہیں۔ ولیس ذالک علی اللہ بعزیز۔

نومبر میں لکھنؤ میں اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی جو ایک عظیم الشان کانفرنس اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے ہورہی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جن اغراض و مقاصد کے لئے اس کا انعقاد عمل میں آرہا ہے اس کی کامیابی کے لئے دعاگو ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اس کانفرنس کے ایک نہایت سرگرم اور پرجوش کارکن دوست سے یہ معلوم کرکے سخت مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ ان غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی جو فہرست تیار ہوئی ہے اس میں اس وقت تک

ڈیڑھ ہزار ناموں کا اندراج ہو چکا ہے، اے واہ اردو کی شان!
اتنا ہی یہ ابھرے گی جتنا کہ دبا دیں گے

رسول اللہؐ کی ولادت

بچپن، شادی، بچے

(۲)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

محمد رسول اللہ کے والد عبداللہ اور دادا عبدالمطلب تھے۔ عبدالمطلب کا پردادا مکہ کا پہلا قرشی حاکم قصیٰ بن کلاب تھا جس نے پچاس ساٹھ برس پہلے قریش کے بکھرے ہوئے پسماندہ اور گمنام خاندانوں کو مکہ میں آباد کرکے، اور وہاں کے یمنی حکمرانوں کو نکال کر قریشی عظمت کی بنیاد استوار کی تھی۔ عربی روایت کے مطابق عبدالمطلب یمن کے کسی رئیس کے ہاں مہمان تھے کہ آسمانی کتابوں کے ایک عالم سے ان کی ملاقات ہوئی، اس نے بتایا کہ آپ کے خاندان میں نبی پیدا ہوگا جس کی ماں قریش کے زہرہ گھرانے کی عورت ہوگی۔ عبدالمطلب نے مکہ لوٹ کر پہلی فرصت میں اپنے لڑکے عبداللہ کی زہرہ خاندان کی لڑکی آمنہ بنت وہب سے شادی کردی۔ عبدالمطلب بھاری بھرکم، وجیہ وجمیل آدمی تھے، دیکھنے والا انھیں دیکھکر مرعوب ہوجاتا تھا، ان کے لڑکے بھی ان کی طرح قدآور، شکیل اور رعب دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ کی پیشانی پر نبوت کا نور جھلکتا تھا جسے دیکھ کر ایک قیافہ شناس باخبر عورت نے ان سے شادی کی فرمائش کردی تاکہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کی ماں بننے کا اسے فخر حاصل ہو، عبداللہ کی بات آمنہ سے طے ہوچکی تھی اس لئے اس کی مراد بر نہ آئی۔

رسول اللہؐ آمنہ کے پیٹ میں تھے تو کسی نے ان سے خواب میں کہا: تمہارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ اور نبیؐ ہے یا تمہارے ایک بچہ ہوگا، اس کا نام احمد رکھنا، وہ ساری دنیا کا بادشاہ بنے گا[1] یا تمہارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ ہے[2]۔ جب رسول اللہؐ پیدا ہوئے تو آمنہ نے دیکھا کہ ان کے جسم سے ایک روشنی نکلی جس سے بُصریٰ (شام) کے محل جگمگانے لگے[3]۔

رسول اللہؐ کی ولادت سے کئی ماہ پہلے ان کے والد عبداللہ ایک تجارتی قافلہ لے کر جنوبی شام کے ساحلی تجارتی مرکز غَزَہ گئے جسے آج کل انگریزی میں گاز Gaza کہا جاتا ہے۔ وہاں سے فروخت کے لئے شام کی مصنوعات لے کر آ رہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑ گئے اور علاج کے لئے مدینہ میں ٹھہر گئے جہاں ان کی ننھیال تھی، مرض نے پیچھا نہ چھوڑا اور ایک ماہ بیمار رہ کر پچیس سال کی عمر میں وفات[4] پائی۔

رسول اللہؐ کی ولادت لگ بھگ ۵۶۸ء عیسوی میں ہوئی، اُس وقت فارس کے شہنشاہ کسریٰ نوشیرواں کی تاجپوشی کو چالیس سال گذر چکے تھے[5]۔ ولادت کے بعد ان کے دادا عبدالمطلب انھیں خانہ کعبہ لے گئے، ان کی پیدائش پر خدا کا شکر ادا کیا اور ان کی سلامتی و کامرانی کی دعا مانگی۔
رسول اللہؐ اپنے آباؤ اجداد کی طرح صاحب جلال و جمال تھے۔ خوشحال عربوں میں ماؤں کی بجائے کنیزوں اور نادار عورتوں سے اُجرت دے کر دودھ پلوانے کا دستور تھا، پہلے رسول اللہؐ کے گھر کی ایک کنیز ثُویبہ نے کچھ دن دودھ پلایا پھر وہ پرورش اور دودھ پلانے کے لئے گاؤں کی ایک

---

[1] ابن سعد ۱/۹۸
[2] ایضاً ۱/۱۵۱
[3] ابن ہشام صہ ۱۰۲، انساب الاشراف ۱/۸۱
[4] ابن ہشام صہ ۱۰۲
[5] انساب الاشراف ۱/۱۰۳

عورت حلیمہ بنت عبداللہ کے سپرد کر دئے گئے۔ حلیمہ انھیں اپنے گاؤں لے گئی، گاہے گاہے
انھیں آمنہ کے پاس لاتی رہتی تھی۔ جب رسول اللہ پانچ سال کے ہوئے تو حلیمہ نے انھیں
مستقل طور پر آمنہ کے حوالہ کر دیا۔ چھ سال کی عمر میں آمنہ رسول اللہ کو لے کر مدینہ گئیں جہاں ان
کی ننھیال تھی، وہاں ایک ماہ قیام کے دوران رسول اللہ نے تیرنا سیکھ لیا[1]، واپسی پر مدینہ کے
مضافات میں بمقام ابوار آمنہ کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفنائی گئیں۔ رسول اللہ کی کھلائی ام ایمن
انھیں لے کر مکہ آگئیں۔ مکہ میں ان کے دادا عبدالمطلب ان کے سرپرست ہو گئے۔ عبدالمطلب حج
کے اہم ترین عہدوں۔ رفادہ وسقایہ پر فائز ہونے کے علاوہ مکہ کے سارے قرشی اکابر سے زیادہ
معزز، باوقار اور بارسوخ شخصیت تھے اور خانہ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں مجلس کیا کرتے تھے،
ان کے لئے ایک قالین پر گاؤ تکیہ رکھا جاتا تھا، قالین کے حاشیہ پر ان کے لڑکے اور ملاقاتی بیٹھ کر
ان کا انتظار کیا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ عبدالمطلب سے پہلے رسول اللہ آجاتے اور گاؤ تکیہ
سے لگ کر بیٹھ جاتے ان کے چچا انھیں ہٹانے کی کوشش کرتے لیکن وہ نہ ہٹتے، اتنے میں عبدالمطلب
آجاتے اور لڑکوں سے کہتے: بیٹھنے دو میرے بیٹے کو (گاؤ تکیہ سے لگ کر)، میرا بیٹا بادشاہ بننا
چاہتا ہے (إن ابنی لیحدث نفسہ بملک[2])

دو سال بعد جب رسول اللہ آٹھ سال کے تھے عبدالمطلب کا بیاسی (۸۲) سال کی عمر میں انتقال
ہو گیا، ان کے بارہ لڑکے، چھ لڑکیاں اور چھ بیویاں تھیں، مرتے وقت عبدالمطلب نے رسول اللہ
کو اپنے لڑکے ابوطالب کی سرپرستی میں دے دیا اور ہر طرح ان کا خیال رکھنے کی وصیت کر دی۔

جب رسول اللہ بارہ (۱۲) سال کے ہوئے تو ابوطالب نے شام کے سفر کی تیاری کی۔ ابوطالب
رسول اللہ کو بہت چاہتے تھے اور رسول اللہ بھی ان سے بہت مانوس تھے، اس کے باوجود

---

[1] ابن سعد ۱/۱۱۶

[2] ایضاً ۱/۱۱۶

ابوطالب نے سفر کی کلفتوں کے پیش نظر رسول اللہؐ کو شام لے جانا مناسب نہ سمجھا اور جانے والوں کی فہرست میں انھیں داخل نہیں کیا۔ رسول اللہؐ کو اس کا بہت دکھ ہوا، انھوں نے چچا سے ضد کی کہ مجھے ساتھ لے چلئے اور جب وہ نہ مانے تو رونے لگے۔ ابوطالب کا دل بھر آیا اور بھتیجے کو ساتھ لے لیا۔ شام پہنچکر ابوطالب کا تجارتی قافلہ شہر بُصریٰ کے ایک گرجا کے پاس اترا جو مشرقی اُردن میں شام کا ایک تجارتی مرکز تھا جہاں سے ہوکر کئی تجارتی راستے ملک کے بڑے بڑے شہروں کو جاتے تھے۔ گرجا کا ایک راہب تھا بحیرا نامی، رسول اللہؐ کا جلال وجمال دیکھکر وہ بہت متاثر ہوا، اسے ان کے چہرہ اور آنکھوں میں کچھ ایسی علامتیں نظر آئیں جو اس نے انجیل میں آنے والے نبی کی پڑھی تھیں، مثلاً لال آنکھیں، دونوں کندھوں کے درمیان کبوتر کے انڈے کے برابر ایک اُبھار، اُس نے ابوطالب سے کہا تمھارا بھتیجا منصب نبوت پر فائز ہوگا۔[1]

ابوطالب کی آمدنی کم اور مالی ذمہ داریاں زیادہ تھیں، خرچ کی ایک مد ہر سال زائرین کعبہ کے لئے کھانے پینے کا بندوبست تھا جس کے لئے انھیں چندہ میں ایک گراں قدر رقم دینا ہوتی تھی اور کبھی چندہ کی رقم وہ اپنے مالدار بھائی عباس بن عبدالمطلب سے قرض لے کر دیتے تھے۔ جب رسول اللہؐ بائیس ۲۲ تیئیس ۲۳ سال کے ہوئے تو ابوطالب نے ان سے کہا: میری مالی حالت خراب ہے، قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام جارہا ہے، اس میں خدیجہ بنت خُوَیلد کا کافی سامان ہے تم خدیجہ سے ملو اور شام میں ان کا سامان بیچنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرو، مجھے امید ہے کہ وہ بخوشی تمھاری خدمات قبول کرلیں گی۔[2] خدیجہ مکہ کے پہلے قرشی حاکم قُصَیّ کے پرپوتے کی لڑکی تھیں، شریف خاندان، منتظم اور نہایت مالدار، ان کے شوہر کا انتقال ہوچکا تھا، وہ ہر سال تجارت کا سامان خرید کر حجاز اور شام کے بازاروں میں بھیجا کرتی تھیں۔ ابوطالب کے حسب ہدایت

---

[1] ابن سعد ۱/۱۵۳-۱۵۵

[2] ایضاً ۱/۱۲۹

رسول اللہؐ خدیجہ سے ملے ، انھوں نے خوشی سے رسول اللہؐ کی خدمات دُوچند معاوضے کے بالمقابل حاصل کر لیں۔ شام میں داخل ہونے کے بعد حسب سابق رسول اللہؐ نے بُصریٰ کے گرجا کے پاس پڑاؤ ڈالا، اس موقع پر عربی روایت کے مطابق نسطور نامی راہب رسول اللہؐ کے جلال وجمال سے متاثر ہوا اور بحیرا کی طرح اسے ان کی لال آنکھوں اور چہرہ پر نبوت کی علامتیں نظر آئیں جن کا اس نے رسول اللہؐ کے ساتھی مَیسرہ سے ذکر کیا جسے خدیجہ نے رسول اللہؐ کی خدمت اور سامان کی نگرانی کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ مَیسرہ نے جو کچھ نسطور سے سنا رسول اللہؐ کو بتا دیا اور مکہ واپس آکر خدیجہ کو بھی مطلع کیا[1]۔ خدیجہ کو رسول اللہؐ کی معرفت تجارت کرانے سے سابق کی نسبت دگنا فائدہ ہوا اور انھوں نے رسول اللہؐ کو مقررہ معاوضہ سے دوچند معاوضہ دیا۔ وہ رسول اللہؐ کے جلال وجمال سے متاثر تھیں ہی، ان کی تجارتی کارگذاری اور ان کے بارے میں نبوت کی بشارت سے ان کی اور زیادہ گرویدہ ہوگئیں اور اُن سے شادی کی طلبگار ہوئیں۔ انھوں نے نفیسہ نامی ایک عورت کو رسول اللہؐ کا عندیہ لینے بھیجا، نفیسہ نے کہا: محمد تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ رسول اللہؐ: میرے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ مہر ادا کر سکوں۔ نفیسہ: اگر روپیہ کا بندوبست ہو جائے اور تمھیں ایک خوبصورت، مالدار، شریف خاندان اور تمھارے ہم رُتبہ عورت مل جائے تو اس سے شادی کرنا قبول کر لوگے؟ رسول اللہؐ: وہ عورت کون ہے؟ نفیسہ: خدیجہ بنت خُوَیلد۔ رسول اللہؐ: اس سے شادی کس طرح ممکن ہے؟ نفیسہ: اس کا بندوبست میں کر دوں گی۔ رسول اللہؐ: مجھے شادی منظور ہے۔ نفیسہ نے جا کر سب باتیں خدیجہ کو بتائیں۔ خدیجہ نے رسول اللہؐ سے کہلا بھیجا کہ فلاں وقت آکر مجھ سے مل لو۔ خدیجہ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے اپنے چچا عمرو بن اسد کو بلا بھیجا کہ آکر ان کی شادی کرا دیں۔ رسول اللہ اپنے چچاؤں کو لے کر آگئے، دو سو پچاس روپیہ مہر پر نکاح ہو گیا۔ اُس وقت رسول اللہؐ کی

---

[1] ابن سعد ۱/ ۱۳۰

عمر تیئیس[1] سال اور خدیجہ کی اٹھائیس[2] سال تھی۔ بعض لوگ پچیس[5] اور چالیس[6] سال بتاتے ہیں۔

خدیجہ کے رسول اللہؐ سے دو[2] لڑکے ہوئے۔ قاسم اور عبداللہ، چار لڑکیاں۔ زینب، رقیہ، فاطمہ اور ام کلثوم، ان سب میں ایک ایک سال کا فرق تھا اور سب نے اجرت پر دودھ پلانے والی عورتوں کا دودھ پیا تھا۔ خدیجہ لڑکے کے عقیقہ پر دو بکریاں اور لڑکی کے عقیقہ پر ایک بکری ذبح کیا کرتی تھیں[2]۔ رسول اللہؐ کے دونوں لڑکے کم سنی میں ہجرت سے پہلے فوت ہو گئے۔

خدیجہ نے رسول اللہؐ سے پوچھا: تم سے میری اولاد بعد انتقال کہاں جائے گی؟ رسول اللہؐ: جنت میں۔ خدیجہ: بغیر اچھے کام کئے ہوئے۔ رسول اللہؐ: ان کے عمل کا حال خدا کو معلوم ہے۔ خدیجہ: سابقہ (دو) شوہروں سے میرے متوفی کم سن بچے کہاں جائیں گے؟ رسول اللہؐ: دوزخ میں۔ خدیجہ: بغیر برے کام کئے ہوئے انھیں یہ سزا ملے گی؟ رسول اللہؐ: ان کے عمل کا حال خدا کو معلوم ہے[3]۔

رسول اللہؐ کی سب سے بڑی لڑکی زینب کی شادی اعلان نبوت سے چند سال پہلے اس کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیعہ (لقیط) سے ہوئی۔ ابوالعاص مکہ کا ایک دولتمند، نیک طینت اور خوش معاملہ آدمی تھا۔ اعلان نبوت کے بعد خدیجہ اور ان کی چاروں لڑکیاں مسلمان ہو گئیں تو بعض قرشی اکابر نے ابوالعاص سے کہا کہ محمدؐ کی لڑکی کو طلاق دیدو پھر تم جس قرشی لڑکی سے چاہو گے تمھاری شادی کرادی جائے گی۔ ابوالعاص طلاق دینے کے لئے تیار نہیں ہوا، اس نے کہا زینب کے اسلام سے ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی ناخوش گوار تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہے، وہ اپنے مذہب پر عامل ہے، میں اپنے مذہب پر قائم ہوں، اس کے یا اس کے والد کی طرف سے مجھے مذہب بدلنے

---

[1] ابن سعد ۸/۱۷، انساب الاشراف ۱/۹۸

[2] ابن سعد ۱/۱۳۴

[3] یعقوبی ۲/۳۵

پر نہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ طلاق دوں۔ ہجرت کے دوسرے سال اجتماعی دباؤ میں آکر ابوالعاص قریشی اکابر کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوا اور کئی درجن دوسرے قریشیوں کی طرح میدانِ جنگ میں گرفتار ہوا۔ رسول اللہؐ کو روپے کی ضرورت تھی اور سارے گرفتار قریشی ان کے رشتہ دار تھے اس لئے طے ہوا کہ زرِ مخلصی لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔ زرِ مخلصی کی رقم حسبِ حیثیت فی کس دو ہزار، ڈیڑھ ہزار اور ہزار روپے مقرر کی گئی۔ زینبؓ کو شوہر کی گرفتاری کا علم ہوا تو انھوں نے ایک ہار ابوالعاص کی رہائی کے لئے مکہ سے بھیجا، یہ ہار انھیں خدیجہ نے جہیز میں دیا تھا، اسے دیکھ کر رسول اللہؐ کا دل بھر آیا ـــــ (فرق لها رقة شديدة)[1] انھوں نے ساتھیوں سے کہا: یہ ہار خدیجہ کا دیا ہوا ہے، اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو اسے واپس اور ابوالعاص کو رہا کر دیا جائے۔ صحابہ تیار ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے ابوالعاص سے کہا کہ تمھیں اس شرط پر رہا کر سکتا ہوں کہ مکہ جا کر زینب کو میرے پاس بھیجنے کا وعدہ کرو۔ ابوالعاص نے وعدہ کر لیا۔ رسول اللہؐ نے اپنے لے پالک زید بن حارثہ کی قیادت میں ایک ٹولی مکہ کے پاس ایک مقام پر زینب کو اپنی حفاظت میں مدینہ لانے کے لئے بھیجی۔ ابوالعاص نے وعدہ پورا کیا اور زینب کو اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ اونٹ پر سوار کر کے بھیج دیا۔ مکہ سے باہر کچھ قریشیوں نے زینب کا اونٹ دیکھا، ان میں سے ایک شخص شرارۃً زینب کو ڈرانے کے لئے اُن کی طرف نیزہ لے کر لپکا، زینب ڈر گئیں، ان کے پیٹ میں بچہ تھا، کئی دن بعد انھیں اسقاط ہو گیا اور ایک خبر یہ ہے کہ اس شری کے نیزے سے اونٹ بدکا، زینب گر گئیں اور ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔[2]

ہجرت کے چھٹے سال ابوالعاص ایک تجارتی قافلہ لے کر شام سے مکہ آرہا تھا، جب وہ مدینہ کے نواح میں پہنچا تو رسول اللہؐ کے جاسوسوں نے انھیں قافلہ کی خبر دی، رسول اللہؐ

---

[1] انساب الاشراف ۱/۳۹۷، ابن ہشام ص۴۶۵

[2] انساب الاشراف ۱/۳۹۸

نے قافلہ کا سامان چھیننے کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجا، دستہ نے ابوالعاص کو گرفتار کرلیا اور سامان سے لدے ہوئے سارے اونٹ پکڑ لئے۔ ابوالعاص رات میں مدینہ پہنچا اور زینب سے پناہ مانگی، انھوں نے دے دی اور اگلی صبح نماز فجر کے بعد عورتوں کی صف سے اٹھکر زینب نے کہا: سب لوگوں کو معلوم ہوجانا چاہئے کہ میں نے ابوالعاص کو پناہ دے دی ہے۔ لوگوں نے رسول اللہؐ کا اشارا پاکر زینب کی امان قبول کرلی۔ رسول اللہؐ نے پکڑنے والے دستہ کے ارکان سے کہا جو قرآنی ضابطۂ غنیمت کے مطابق اس کے پانچ حصوں میں سے چار کے حقدار تھے: میرا ابوالعاص سے جو رشتہ ہے اس سے تم واقف ہو، میں چاہتا ہوں کہ اس کا مال واپس کردیا جائے۔ دستہ کے ارکان تیار ہوگئے۔ ابوالعاص مسلمان ہوگیا۔ رسول اللہؐ نے زینب کو بلا تجدید نکاح اس کے حوالہ کردیا[1]۔ ابوالعاص نے رسول اللہؐ کی کسی جنگ میں شرکت نہیں کی، پانچ چھ سال بعد ۱۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ابوالعاص سے زینب کے دو بچے تھے۔ علی اور اُمامہ۔ علی کا لڑکپن میں انتقال ہوگیا، اُمامہ سے علی حیدرؓ نے فاطمہ کی وفات کے بعد شادی کرلی۔ ابوالعاص کے پاس جانے کے تقریباً دو سال بعد ۸ھ میں زینب نے وفات پائی۔

رسول اللہ کی منجھلی اور چھوٹی لڑکی رُقیہ اور ام کلثوم رسول اللہؐ کے چچا ابولہب کے لڑکوں عُتبہ اور مُعتب کو بیاہی تھیں، اعلانِ نبوت کے پہلے سال سے رسول اللہ کے تعلقات ابولہب سے زیادہ کشیدہ ہوگئے تھے، ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل کی مذمت میں جب تَبَّت یدا أبی لَھَب والی سورت نازل ہوئی تو دونوں میاں بیوی سخت برہم ہوئے اور جوشِ انتقام میں آکر انھوں نے اپنے دونوں لڑکوں سے رُقیہ اور ام کلثوم کو طلاق دلوادی۔ کچھ عرصہ بعد رُقیہؓ کی شادی رسول اللہؐ نے عثمان غنی سے کردی جن کا تعلق ابوالعاص کی طرح عبدشمس کے ایک معزز گھرانے سے تھا

---

[1] انساب الاشراف ۱/۴۰۰، ابن ہشام ص ۴۷۶

اور جو ابوالعاص کی طرح خوب مالدار بھی تھے، صورت شکل بھی اچھی تھی اور صاف ستھری پُر آرام زندگی بسر کرتے تھے۔ اعلانِ نبوت کے پانچویں سال اکابر قریش کی مخالفت بڑھی اور عثمان غنی کے رشتہ دار انھیں ڈرانے اور ستانے لگے تو رسول اللہؐ کے ایما پر عثمان غنی رُقیہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے جہاں کے تاجروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ سات آٹھ سال بعد جب ہجرت ہوئی تو وہ مع رُقیہ مدینہ آگئے۔ ہجرت کے دوسرے سال ٹھیک اس وقت جب بدر میں رسول اللہؐ اور قریش کی فوجیں صف آرا ہونے والی تھیں رُقیہ چیچک میں مبتلا ہوئیں اور کچھ دن بعد دنیا سے کوچ کر گئیں۔ عثمان غنی کے رُقیہ سے ایک بچہ تھا عبداللہ جس کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔ رسول اللہؐ کا اشارا پاکر عثمان غنی نے رُقیہ کی بہن اُم کلثوم سے شادی کرلی۔ اُم کلثوم کو اعلانِ نبوت کے پہلے سال طلاق دی گئی تھی، اس وقت سے ۲ھ ہجری تک تقریباً تیرہ چودہ سال وہ بیوہ رہیں یا ان کی کسی سے شادی ہوئی، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ام کلثوم کا ۹ھ میں انتقال ہوا[1]

ہجرت کے بعد ابوبکر صدیق نے رسول اللہؐ کی تیسری لڑکی فاطمہ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے رشتہ مناسب نہ سمجھا، پھر عمر فاروق کا پیغام آیا، رسول اللہؐ نے اسے بھی نظرانداز کردیا[2] اور ۲ھ کے اوائل میں فاطمہ کی شادی اپنے چچازاد بھائی علی حیدر سے کردی جو آٹھ نو سال کی عمر سے رسول اللہؐ کی سرپرستی میں تھے۔ فاطمہ کا ۱۱ھ میں رسول اللہؐ کی وفات کے چند ماہ بعد ستائیس اٹھائیس سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ علی حیدر کے ان سے پانچ بچے تھے، تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ حسن، حسین، مُحسن، زینب اور ام کلثوم۔ مُحسن بچپن میں فوت ہو گئے۔

---

[1] انساب الاشراف ۱/۴۰۱

[2] ایضاً ۱/۴۰۲

خدیجہؓ نے رسول اللہؐ کے ساتھ تقریباً ستائیس سال گذارے، سترہ سال اعلانِ نبوت سے پہلے اور دس سال اعلان کے بعد۔ جب خدیجہؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہؐ نے ان سے کہا: جنت میں اپنی سوتوں سے میرا سلام کہدینا۔ خدیجہؓ: وہ کون ہیں؟ رسول اللہؐ: خدا نے جنت میں تم سے میری شادی کی اور تمھارے علاوہ مریم بنت عمران سے، آسیہ بنت مزاحم سے اور موسیٰ کی بہن کلثوم سے[1]۔

ہجرت سے تین سال قبل اور اعلان نبوت کے دسویں سال پہلے ابوطالب کا انتقال ہوا اور اس کے چند ہفتے بعد خدیجہ رحلت[2] کر گئیں۔ ان دونوں کی وفات رسول اللہؐ کے لئے ناقابلِ تلافی خسارہ تھی، ان کے لئے دونوں کا وجود بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ابوطالب ان کے حامی و پاسبان تھے، انھوں نے قریشی اکابر کے ہاتھوں رسول اللہؐ کو کبھی زک نہ پہنچنے دی اور ان کے قتل کے منصوبوں کو اپنے رسوخ اور تدبیر سے ہمیشہ ناکام بناتے رہے (کان ابوطالب یحفظه ویحوطه ولیعضده وینصره إلی أن مات[3]) خدیجہؓ کی دولتمندی نے رسول اللہؐ کو معاشی فکروں سے آزاد کر دیا تھا اور ان کے مشن میں پیش آنے والی آزمائشوں میں وہ اپنے پیسے، خاندانی اثر اور دل خوش کلمات سے ان کا حوصلہ بلند رکھتی تھیں[4]۔

وثوق کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ شادی کے بعد سے اعلان نبوت تک جو سترہ سال گذرے اُن میں رسول اللہؐ کے مشاغل اور سرگرمیاں کیا تھیں، ہماری معلوم کی حد تک ان کے مشاغل اور سرگرمیوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ قرائن کا سہارا لے کر کہا جا سکتا ہے کہ اس عرصہ میں

---

[1] یعقوبی ۲/ ۳۵

[2] ابن سعد ۱/ ۱۲۵

[3] ایضاً ۱/ ۱۲۱

[4] ابن ہشام ص۱۵۵

وہ اپنی دولتمند تاجر بیوی کے ساتھ کاروبار کی دیکھ بھال اور اعلان نبوت کے لئے زمین تیار کرنے میں مصروف رہے ہوں گے۔ اس طویل عرصہ میں رسول اللہؐ کی سرگرمیوں کی صرف ایک جھلک عربی کے قدیم ترین ماخذوں میں نظر آتی ہے جسے یہاں پیش کیا جاتا ہے: اس جھلک کا تعلق خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو سے ہے۔ مکہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا شہر ہے، جب زیادہ بارش ہوتی تو پہاڑیوں کے پانی کی باڑھ مکہ میں گھس آتی اور نشیبی علاقے غرق ہوجاتے، کبھی کبھی خانہ کعبہ میں بھی پانی بھر جاتا، بار بار اس عمل کے زیر اثر خانہ کعبہ کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں، چھت اور دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ قریشی اکابر نے از سرِ نو مضبوط بنیادوں پر کعبہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا، یہ بھی طے ہوا کہ اس کے لئے جو چندہ دیا جائے وہ کلیتہً حلال اور پاک کمائی کا پیسہ ہو۔ اس زمانہ میں ایک یونانی کشتی بحرِ قلزم میں جدہ کے پاس شُعَیبہ بندرگاہ کے قریب چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہوگئی تھی، اس کا کپتان جس کا نام باقوم تھا کشتی کو ساحل تک لانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ خبر قریش کو ہوئی تو انھوں نے اپنا ایک نمایندہ شُعَیبہ بھیجا، اس نے باقوم سے خانہ کعبہ کے کواڑ، چھت اور ستونوں کے لئے لکڑی خریدلی، عرب فن تعمیر سے ناواقف تھے اس لئے نمایندہ نے باقوم سے کہا کہ چند یونانی معماروں کا انتظام کردے۔ باقوم کو خود عمارت بنانے کا تجربہ تھا، اس نے اپنی خدمات پیش کیں اور مع لکڑی کے مکہ آگیا۔ خانہ کعبہ کی پرانی چہار دیواری گرادی گئی اور آس پاس سے پتھر جمع کئے گئے۔ برکت حاصل کرنے کے لئے قریشی اکابر کی طرح رسول اللہؐ بھی کچھ پتھر اٹھا کر لائے۔ نئی تعمیر کے وقت کعبہ کے کمرہ کا رقبہ کئی گز کم کردیا گیا، دیواریں اور بنیادیں پتھر سے چنی گئیں، چھت میں پندرہ کڑیاں ڈالی گئیں اور اس کے نیچے چھ لکڑی کے ستون نصب کئے گئے، دروازہ پہلے کی نسبت بہت اونچا رکھا گیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جاسکے اور صرف دربان کی اجازت سے دخول کی تمہیدیں پوری کرکے اندر جائے۔ مکہ کے سارے قریشی خاندانوں کو چار حصوں میں بانٹا گیا، ہر حصہ یا فریق نے ایک دیوار اور چوتھائی چھت کا خرچہ اپنے ذمہ لے لیا۔ ہر فریق سرخرو ہونے کے لئے چاہتا تھا کہ دروازے والی دیوار

اس کے پیسے سے بنے، اس لئے قرعہ ڈالا گیا، قرعہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے نام پر نکلا، اب ایک دوسرا قضیہ پیدا ہوا، ہر فریق کی خواہش تھی کہ حجر اسود کو خانہ کعبہ میں رکھنے کا شرف اُسے حاصل ہو، معلوم نہیں اس قضیہ کا حل بھی قرعہ ڈال کر کیوں نہیں کیا گیا، طے یہ ہوا کہ جو شخص سب سے پہلے کعبہ کے دروازہ سے داخل ہو اسے اپنے ہاتھ سے حجر اسود رکھنے کا کام سونپا جائے۔ اتفاق سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہؐ تھے۔ انھیں قضیہ کا علم ہوا تو انھوں نے ایک ایسا حل نکالا جس سے قریش کے ہر فریق کو حجر اسود اٹھانے کی فضیلت حاصل ہو گئی، انھوں نے اپنی سفید شامی چادر زمین پر پھیلا دی، اس کے بیچ میں حجرِ اسود رکھا اور چاروں فریقوں کے نمایندوں سے کہا کہ چادر کا ایک ایک کونا پکڑ لیں، پھر چاروں نے چادر میں رکھا ہوا حجر اسود اٹھایا اور خانہ کعبہ میں لے گئے۔ حجر اسود کا زیریں حصہ اونچا نیچا تھا، اسے سیدھا رکھنے کے لئے رسول اللہؐ کو مزید ایک پتھر کی ضرورت ہوئی۔ حاضرین میں سے ایک غیر قرشی عرب جو نجد کا باشندہ تھا پتھر لانے کے لئے اٹھا تو رسول اللہؐ نے یہ کہکر اسے پتھر لانے سے روکا: خانہ کعبہ کے تعمیری کاموں میں صرف قرشی حصہ لے سکتا ہے، دوسرا آدمی نہیں (انه ليس يبنى معنا فى البيت إلا منا) یہ بات نجدی کو بری لگی اور اس نے رسول اللہؐ کی تنقیص میں کچھ کلمے کہے[۱]۔ کعبہ کی اس تعمیرِ نو کے وقت رسول اللہؐ کی عمر پینتیس[۳۵] سال تھی اور اعلانِ نبوت میں ابھی پانچ سال باقی تھے۔

اس واقعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ پینتیس سال کی عمر تک رسول اللہؐ کے تعلقات قرشی اکابر سے خوشگوار تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو انھیں تعمیر کعبہ میں شرکت کا موقع نہ دیا جاتا، دوسری بات یہ کہ رسول اللہؐ نے اس وقت تک توحید اور مورتیوں کی مذمت کی تحریک شروع نہیں کی تھی یعنی تحریک کا منصوبہ ان کے دماغ سے عملی دنیا میں منتقل نہیں ہوا تھا کیونکہ

---

[۱] ابن سعد ۱/۱۴۵-۱۴۶، انساب الاشراف ۱/۱۰۰

انھوں نے اپنی تحریک کی اگر خفیہ اشاعت بھی کی ہوتی تو اکابر قریش کو اس کا ضرور علم ہو جاتا، وہ رسول اللہؐ سے منحرف ہو جاتے اور انھیں حجر اسود رکھنے کی خوشی خوشی اجازت نہ دیتے۔

اعلانِ نبوّت

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے رسول اللہؐ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نبی بنوں گا۔ سب سے پہلے ان کی والدہ نے انھیں بتایا تھا کہ جب تم پیٹ میں تھے تو کسی نے خواب میں مجھ سے کہا: تمھارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ اور نبی ہے، پھر جب تمھاری ولادت ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم سے ایک روشنی نکلی جس سے بُصریٰ (شام) کے محل جگمگا نے لگے[1] اس کے بعد دادا عبدالمطلب سے انھیں معلوم ہوا کہ یمن کے ایک عالم نے ان کے گھر میں نبی پیدا ہونے کی بشارت دی تھی اور تصریح کی تھی کہ اس کی ماں خاندانِ زُہرہ کی عورت ہوگی جیسا کہ ان کی ماں آمنہ تھیں، پھر بارہ سال کی عمر میں شام کے سفر کے دوران بُصریٰ کے راہب بَحیرا نے ان کا چہرہ اور پیٹھ پر کبوتر کے انڈے کے بقدر ابھار دیکھ کر ان کے نبی ہونے کی پیش گوئی کی تھی، متعدد دوسرے ذرائع سے بھی رسول اللہؐ کو اس بات کی شہادتیں ملی تھیں کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہوں گے۔ اس یقین کے ماتحت انھوں نے اپنی سیرت کو اچھے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا، وہ ایسے کاموں سے بچنے لگے جو نبی کے شایان شان نہ تھے، وہ جھوٹ نہ بولتے، گالی نہ دیتے، بد اخلاقی سے پیش نہ آتے۔ وہ پیغمبر ابراہیم کی اولاد میں تھے جنھوں نے کعبہ کو توحیدِ خالص کا مرکز بنایا تھا، اس مناسبت سے رسول اللہؐ نے توحید ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا، انھوں نے مورتیوں کی تعظیم چھوڑ دی۔ مورتیوں پر چڑھائی ہوئی قربانی کھانا ترک کر دیا۔ بائیس تیئیس سال کی عمر میں خدیجہ کا کا سامان بیچنے شام گئے تو وہاں کسی تاجر سے ان کا جھگڑا ہو گیا، تاجر نے کہا اگر تم لات اور عُزّیٰ کی قسم

---

[1] ابن سعد ۱/ ۹۸۔ ۱۰۲

کھالو تو میں تمھاری بات مان لوں، رسول اللہؐ نے کہا: میں نے ان کی کبھی قسم نہیں کھائی ہے، میں ان کے سامنے سے گذرتا ہوں تو منہ پھیر لیتا ہوں[۱]۔

اعلان نبوت سے کافی عرصہ پہلے رسول اللہؐ خواب دیکھنے لگے تھے، خواب میں انھیں توحید خالص کی تلقین کی جاتی، کبھی مورتیوں کی مذمت، کبھی توحید کی اشاعت کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ رسول اللہؐ کبھی توحیدی تحریک چلانے کے امکانات پر غور کرتے، کبھی اس بات پر کہ ان کا خاندان ان کا قبیلہ اور عرب قوم یہ دعوت قبول کرلے گی یا نہیں، مورتیوں کی تعظیم چھوڑ دے گی یا نہیں، کبھی اس بات پر غور کرتے کہ توحید کے تقاضے اور مطالبے کیا ہونے چاہئیں۔ جوں جوں توحیدِ خالص پھیلانے کی لگن ان کے دل میں بڑھتی گئی ان کی کاروباری دلچسپیاں سمٹتی گئیں، وہ تنہائی پسند کرنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ مکہ کے باہر حراء پہاڑی کے غار میں معتکف ہو گئے، ان کے دادا عبدالمطلب بھی یہاں آکر رمضان کا مہینہ عبادت و ریاضت میں گذارا کرتے تھے[۲]۔ غار میں رسول اللہؐ کو آسمان کی طرف سے آوازیں سنائی دیتیں اور کبھی روشنی نظر آتی، ایک دن جبریل فرشتے نے آکر کہا کہ خدا نے میری معرفت پیغام بھیجا ہے، یہ کہہ کر اس نے اِقرأ باسم ربك الذی خلق والی سورت پڑھی اور مالم یعلم تک رسول اللہؐ کی زبان سے ادا کرا کے واپس چلا گیا، کچھ عرصہ بعد یاأیھا المدثر والی سورت نازل ہوئی، پھر جلد جلد قرآنی آیتیں اترنے لگیں جن میں توحید، عبادت اور رسول اللہؐ کو نبی ماننے کی تلقین ہوتی تھی۔

نزول وحی کے بعد رسول اللہؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا اور توحیدِ خالص کی دعوت شروع کر دی لیکن یہ دعوت خفیہ تھی اور تقریباً تین سال تک دبی دبی چھپی چھپی رہی۔ دعوت کے اولین مخاطب لڑکے، جوان، غلام، بے سہارا، بے یار و مددگار اور نادار لوگ تھے۔

---

[۱] ابن سعد ۱/۱۳۰

[۲] انساب الاشراف ۱/۸۴

دعوت کے اجزائے ترکیبی تین تھے ۔ توحید خالص، نماز اور اقرار نبوت[1]۔ رسول اللہ اور ان کے ساتھی فرداً فرداً ایسے لوگوں سے ملتے ۔ سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں جن کے بارے میں انھیں حسن ظن ہوتا اور ان کے سامنے دعوت پیش کرتے، وہ مسلمان گھروں میں بھی جاتے اور وہاں دعوت کی تشریح اور قرآن کی تلاوت کرتے ۔ بہت جلد رسول اللہؐ کے ہاشمی و مطلبی اقارب اور اکابر قریش کو دعوت کا علم ہوگیا۔ اقارب مسلمان نہیں ہوئے لیکن انھوں نے رسول اللہؐ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کی اخلاقی تائید کرنے لگے ۔ قریشی اکابر نے رسول اللہ کی دعوت کے دو جزء توحید اور نماز برداشت کر لیے کیونکہ یہ دونوں ان کے معتقدات کے منافی نہیں تھے، اس وقت تک صرف چاشت اور عصر کی نماز فرض ہوئی تھی، اکابر قریش رسول اللہؐ کو چاشت کی نماز بھی صحن کعبہ میں ادا کر لینے دیتے تھے لیکن وہ رسول اللہؐ کے نبوت کے دعوے کا مذاق اڑا کر اسے جنون سے تعبیر کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنی تجارتی نقل وحرکت کے دوران حجاز، یمن اور شام کے عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں سے رسول اللہؐ کی نبوت کے بارے میں تحقیق کی تو کسی نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ وہ نبی ہیں، نہ اس بات کی شہادت دی کہ ان کی آسمانی کتابوں میں آنے والے نبی کی وہ جسمانی صفات بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہؐ میں موجود تھیں۔

جب رسول اللہؐ کی دعوت جڑ پکڑ گئی تو اس نے رخ بدلا، رسول اللہؐ مورتیوں کو برا کہنے لگے کہ وہ پتھر کے ڈھانچے ہیں جن میں فائدہ یا نقصان پہنچانے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔ اکابر قریش کو مورتیوں کی مذمت شاق گذری، انھیں یہ بات اور زیادہ ناگوار ہوئی کہ رسول اللہؐ مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں کو جن سے وہ اور ان کے آباو اجداد مراد تھے، گمراہ، کور باطن، کافر اور اسی طرح کے توہین آمیز الفاظ سے یاد کرتے تھے اور سب کا ٹھکانا جہنم بتاتے تھے، ان اکابر کو اپنی دولتمندی، تجارتی کارگذاری، صلۂ رحمی، داد و دہش اور رفاہی کاموں سے اپنے

---

[1] یعقوبی ۲/ ۲۴

خاندانوں اور قبیلے میں بڑی عزت حاصل تھی اور عزت کے احساس نے ان میں رعونت پیدا کردی تھی، اپنے ایک رشتہ دار کی زبانی جو عمر میں بھی ان سے کم تھا اپنے لڑکوں، غلاموں اور ماتحتوں کے روبرو اپنی عزت کو پامال ہوتا دیکھکر اکابر مشتعل ہوگئے اور رسول اللہؐ کی مخالفت پر کربستہ۔ فقیہ و محدث زہری: رسول اللہؐ نے اسلام کی خفیہ دعوت دی اور مورتیوں سے قطع تعلق کرلیا، ان کی دعوت نوعمروں اور بے سہارا لوگوں نے مانی، بعد میں ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھ گئی، اکابر قریش نے دعوت ناپسند نہیں کی۔ جب رسول اللہؐ ان کے اجتماع سے ہو کر گذرتے تو وہ طنزاً ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے: وہ آیا عبدالمطلب کا لڑکا جس سے خدا باتیں کرتا ہے۔ جب رسول اللہؐ نے ان کی مورتیوں کی مذمت شروع کی اور بتایا کہ اکابر قریش کے آباء و اجداد کفر و گمراہی کی حالت میں مرے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے تو اکابر قریش چڑھ گئے اور رسول اللہؐ کو ستانے اور ان کی مخالفت کرنے لگے۔ دعا رسول اللہ سراً و جہراً الاوثان فاستجاب لہ أحداث من الرجال وضعفاء من الناس حتی کثر من آمن بہ وکفار قریش من وجوھا غیر منکرین لما یقول وکان إذا مرّ علیھم فی مجالسھم یشیرون إلیہ ویقولون: غلام بنی عبد المطلب یکلّم من السماء، فلم یزالوا کذلک حتی أظھر عیب آلھتھم وأخبر أن آباءھم ماتوا علی کفر وضلال وانھم فی النار فشنفوا لہ وأبغضوہ وعادوہ وآذوہ۔[1]

اکابر قریش نے ایک طرف اپنے لڑکوں، غلاموں اور زیر اثر اشخاص کو ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کر کے دل کا غبار نکالا اور انھیں رسول اللہؐ سے منہ موڑنے پر مجبور کیا، دوسری طرف ابوطالب سے شکایت کی کہ اپنے بھتیجے کو ان کی مورتیوں کی مذمت، ان کے بزرگوں پر لعن طعن اور ان کے ماتحتوں، لڑکوں اور غلاموں کو اپنے مذہب کا پابند بنانے کی کوشش سے

---

[1] انساب الاشراف ۱/۱۱۵ - ۱۱۶، ابن سعد ۱/۱۹۹

باز رکھیں ورنہ وہ رسول اللہؐ کے خلاف تشدد آمیز کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ابوطالب نے دھیان سے اکابر کی شکایت سنی، ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور اطمینان دلایا کہ رسول اللہؐ کو سمجھا بجھا دیں گے۔ ابوطالب نے اکابر کی شکایت رسول اللہؐ تک پہنچادی لیکن انھیں نہ ملامت کی نہ ان پر دباؤ ڈالا کہ اپنی دعوت بند کر دیں۔ ابوطالب نے یہ پیش گوئی سن رکھی تھی کہ رسول اللہ عربوں کے بادشاہ اور نبی بنیں گے، وہ اپنے بھتیجے کے اس متوقع عروج کو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ ابوطالب مُرَدّد تھے لیکن مصلحتہً رسمی طور پر مسلمان ہونا نہیں چاہتے تھے، انھیں معاشرہ میں عبدالمطلب کی طرح امتیازی عزت حاصل تھی، وہ ذو عظیم منصبوں۔ رِفادہ اور سِقایہ پر بھی فائز تھے، انھیں اندلیشہ تھا کہ اگر اکابر قریش کو معلوم ہو گیا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی، ان کے غیر ہاشمی رشتہ دار اور دوسرے قرشی اکابر ان سے ترک موالات کر دیں گے، ان کی وجاہت نیز رِفادہ وسقایہ کے عہدے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ رسمی طور پر مسلمان نہ ہونے کے باوجود ابوطالب مع اپنے لڑکوں اور بیشتر بھائیوں کے آخر وقت تک رسول اللہؐ کا ساتھ دیتے رہے[1]۔

قرشی اکابر کی شکایت پر ابوطالب کے پُرحمایت رویہ سے حوصلہ پاکر رسول اللہؐ اپنی تحریک اور زیادہ جرأت سے چلانے لگے، ان کی تحریک میں گمنام، بے سہارا، معاشرہ کے غیر مطمئن اور شاکی عناصر کے علاوہ قریش کے دوسرے اور تیسرے درجہ کے متعدد معزز و مالدار لوگ بھی داخل ہو گئے مثلاً ابوبکر صدیق، عثمان غنی، ابوعبیدہ بن جراح، عبدالمطلب کے لڑکے جعفر، عبیدہ بن حارث بن مطلب، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبیداللہ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور رسول اللہؐ کے ہمعصر مشہور موحد زید بن عمرو بن نفیل

---

[1] ابن سعد ۱/ ۱۲۱

کے لڑکے سعید، ان کے مسلمان ہونے سے ایک طرف رسول اللہؐ کی تحریک کی شان اور ساکھ بڑھی تو دوسری طرف قریشی اکابر کے اشتعال میں اضافہ بھی ہوگیا۔

تین سال درپردہ دعوت دینے کے بعد رسول اللہؐ نے محسوس کیا کہ مکہ کے باہر بسنے والے عربوں میں اسلام اس وقت تک مقبول نہیں ہوسکتا جب تک قریش کے سارے خاندان ان کی دعوت نہ مان لیں۔ آس پاس کے اکثر عرب قبیلے قریش کے زیر اثر تھے اور قریشی اکابر کا اشارہ پائے بغیر ان کا اسلام قبول کرنا ناممکن نظر آتا تھا، اس لئے رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی برملا دعوت دینے لگے، برملا دعوت کی ابتدا اِس قرآنی آیت سے ہوئی۔ وأنذر عشيرتك الاقربين۔ محمدؐ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو برے انجام سے خبردار کر کے کہہ دو کہ اسلام لے آئیں۔ رسول اللہؐ نے اپنے ہاشمی و مطلبی اقارب کی دعوت کی، یہ چالیس پینتالیس مرد تھے کھانے کے بعد رسول اللہؐ کے چچا ابولہب نے جو ان کا سمدھی بھی تھا کہا: محمدؐ، تمھارے چچا اور چچازاد بھائی موجود ہیں، کیا کہنا چاہتے ہو، تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمھارا قبیلہ ساری عرب قوم کا مقابلہ نہیں کرسکتا، تمھاری موجودہ سرگرمیوں سے تمھارے خاندان والے ہی تمھیں روک سکتے ہیں، ان کے لئے یہ کام آسان ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ عربوں کی مدد سے قریشی خاندان تم پر حملہ آور ہوں تو اس سے عہدہ برآ ہوسکیں، تمھاری ذات سے جتنا نقصان تمھارے کنبہ کو پہنچا ہے کسی کی ذات سے آج تک نہیں پہنچا[1]۔ رسول اللہؐ خاموش رہے، نہ کوئی جواب دیا نہ وہ بات کہی جس کے لئے دعوت کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے پھر دعوت کی اور کھانے کے بعد کہا: میں آپ لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نبی ہوں، مجھے خاص طور پر آپ کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مرنے کے بعد آپ پھر زندہ کئے جائیں گے، آپ کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا،

---

[1] انساب الاشراف ۱/۱۱۸

جنت بھی برحق ہے دوزخ بھی۔ ابوطالب نے کہا: ہم بڑی خوشی سے تمھارے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں، تمھاری خیر خواہی کے قدر دان ہیں اور جو کچھ تم کہتے ہو اسے صحیح سمجھتے ہیں، تمھارے چچا اور بھائی موجود ہیں، میں اگرچہ انہی میں سے ایک ہوں تاہم ان سب سے زیادہ تمھاری خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمھارا جو مشن ہے اسے پورا کرنے میں لگے رہو، میں ہمیشہ تمھاری مدد کرتا رہوں گا اور ہر خطرہ سے تمھیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ دوسرے عزیزوں نے بھی رسول اللہ ؐ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور وقت ضرورت انھیں اپنی مدد کا اطمینان دلایا۔ ابولہب کے حسب سابق تیور بدلے ہوئے تھے، اس نے کہا: بھائیو، محمد کی دعوت بُری دعوت ہے، ان کا ہاتھ پکڑ لو قبل اس کے کہ عرب قوم ایسا کرے، اُس وقت اگر تم نے محمد کو عربوں کے حوالہ کر دیا تو یہ ذلت کی بات ہوگی اور اگر لڑائی میں ان کی مدد کی تو مارے جاؤ گے۔ ابوطالب بھائی کا یہ مشورہ سن کر جھلا گئے اور بولے: جب تک دم میں دم ہے ہم محمد کی پشت پناہی کرتے رہیں گے[1]۔

اپنے چچاؤں اور بھائیوں کے اسلام نہ لانے سے رسول اللہ ؐ کو ملال ہوا لیکن انھوں نے کسی سے تعلقات نہیں بگاڑے، وہ جانتے تھے کہ ابولہب کے سوا ان کے سارے چچا اور بھائی خاندانی، تجارتی اور سماجی مصلحتوں کے پیش نظر کھلم کھلا اسلام قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں، ان کا خیال تھا کہ اگر قریش کے دوسرے خاندان اسلام لے آئیں تو ان کا ہاشمی و مطلبی کنبہ بھی اسلام قبول کرلے گا۔ کچھ دن بعد رسول اللہ ؐ مکہ کے باہر صفا نامی پہاڑی پر گئے اور قریش کے سارے خاندانوں کو آواز دیکر بلایا، جب وہ آئے تو رسول اللہ ؐ نے کہا کہ میں نے آپ کو اس لئے جمع کیا ہے کہ آپ یہ اقرار کریں کہ لا إله إلا الله لاشريك له وأنّ رسول الله، اس اقرار کے صلہ میں آپ کو جنت دلانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مجمع میں ابولہب موجود تھا، اس نے ترش روئی سے کہا: تمھارا برا ہو، اس کام کے لئے تم نے ہمیں زحمت دی ہے! (تبّاً لك، ألهذا دعوتنا!) ابولہب

---

[1] انساب الاشراف ۱/ ۱۱۹

عبدالمطلب کا لڑکا تھا، رسول اللہؐ کا سگا چچا، نام عبدالعزیٰ تھا، دمکتے ہوئے چہرہ کے باعث اسے ابولہب کہا جاتا تھا۔ رسول اللہؐ کی دو لڑکیاں اس کے دو لڑکوں کو بیاہی تھیں، اس کے تعلقات رسول اللہؐ سے کشیدہ تھے، وہ نہ رسول اللہ کو نبی ماننے کے لئے تیار تھا، نہ مورتیوں کی تعظیم چھوڑنے کے لئے۔ اس کا خیال تھا کہ محمد اپنی نبوت کے دعوے اور مورتیوں کی مخالفت پر اڑے رہے تو ساری عرب قوم ان کی دشمن ہو جائے گی اور ان سے لڑے گی نیز یہ کہ اگر قریش نے رسول اللہؐ کا ساتھ دیا تو وہ بھی رسول اللہؐ کے ساتھ ہاریں گے اور ان کی خوشحالی، تجارت اور عظمت خاک میں مل جائے گی۔ ابولہب کی بہن صفیہ: بھیا کیا یہ بات مناسب ہے کہ تم اپنے بھتیجے کی مدد سے ہاتھ اٹھالو اور اسے دشمن کے حوالے کر دو؟ جاننے والے کہتے ہیں کہ عبدالمطلب کی نسل میں ایک نبی ہوگا اور وہ تمھارا ہی بھتیجہ تو ہے۔ ابولہب: بالکل غلط، یہ محض ایک خوش فہمی ہے، عورتوں کی لچر باتوں سے زیادہ اس کی کوئی اصلیت نہیں، قریش کے سارے خاندان عربوں کے تعاون سے ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے تو ہمارے لئے ان سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہو جائے گا۔[1]

صفا کے مجمع میں ابولہب کی خفگی تبًّالك، ألهذا دعوتنا، رسول اللہؐ کو بہت ناگوار ہوئی، چند دن بھی نہ گذرے تھے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں وحی نازل ہوگئی۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ مَا أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ، سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَّامْرَأَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِي جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔ تباہ ہوں ابولہب کے ہاتھ، اس کی دولت اور کمائی کچھ کام نہ آئے گی، لپٹیں نکلتی ہوئی آگ میں جلے گا وہ اور اس کی ایندھن ڈھونے والی بیوی جس کی گردن میں کھجور کے ریشوں کی رسی کا پھندا پڑا ہوگا۔ ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل اپنی بے عزتی سے سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے اپنے دونوں لڑکوں سے کہا کہ محمد

---

[1] انساب الاشراف ۱/۱۱۹

نے ہماری ہجو کی ہے، تم ان کی لڑکیوں کو طلاق دے دو۔ لڑکے حکم بجالائے۔

ابو طالب، اُن کے بھائیوں اور بھتیجوں کی طرف سے تعاون، مدد اور حمایت کی ضمانت پاکر رسول اللہؐ نے اپنی دعوت اور زیادہ وسیع، منظم اور تیز کردی، وہ اور ان کے ساتھی بالخصوص معزز قرشی مسلمان جیسے ابوبکر صدیق، عثمان غنی، حمزہ بن عبد المطلب، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ اور ابوعبیدہ بن جرّاح چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر محلوں، بازاروں، مجمعوں اور گھروں میں جاتے، دعوت دیتے، قرآن سناتے، مورتیوں اور ان کی تعظیم کرنے والوں پر لعن طعن کرتے، اُنھیں کافر کہتے، ان کا ٹھکانا جہنم بتاتے اور مسلمانوں کو جنت کی بشارت دیتے۔ خُفیہ دعوت کے زمانہ میں رسول اللہؐ کو اکابر قریش کی طرف سے صحن کعبہ میں صرف صبح کی نماز پڑھنے کی اجازت تھی لیکن اب وہ اور ان کے ساتھی اکابر کی نظروں کے سامنے عصر کی نماز بھی پڑھنے لگے، باآواز بلند قرآن کی تلاوت کرتے، کھلم کھلا دعوت دیتے جس کے اجزا، تھے۔ توحید، مورتیوں سے بیزاری، دو وقتی نماز اور اقرار نبوت۔ دعوت کے وسیع، منظم اور تیز ہونے، نیز معزز مسلمان قرشیوں کے اثر، ترغیب اور دباؤ سے قریش کے اچھے گھرانوں کی ایک جماعت مسلمان ہوگئی اور وہ بے سہارا لوگ۔ غلام، کنیزیں، موالی اور حلیف جو خفیہ دعوت کے زمانہ میں مسلمان ہونے کے بعد اکابر کی ڈانٹ ڈپٹ، زدوکوب اور مختلف قسم کی معاشی ومالی دھمکیوں سے اسلام چھوڑ گئے تھے یا اسلام چھپانے، رسول اللہؐ کی مذمت اور مورتیوں کی تعظیم کے بول زبان سے ادا کرنے پر مجبور کئے گئے تھے، اسلام لے آئے، بے سہارا لوگوں کو رسول اللہؐ اور خوشحال قرشی مسلمانوں نے مالی سہارا دیا، غلاموں اور کنیزوں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کردیا اور موالی کی اخلاقی ومادی مدد کی۔ ان سب باتوں سے قریشی اکابر کا اشتعال بڑھ گیا۔ ان کا ایک وفد ابوطالب سے ملا اور ان سے شکایت کی کہ محمد ہمارے لڑکوں، غلاموں، موالی اور حلیفوں کو بہلا پھسلا کر گمراہ کرتے ہیں، ہماری مورتیوں کو برا کہتے ہیں، ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو احمق، کور باطن، گمراہ اور کافر کہہ کر توہین کرتے ہیں، انھیں روکئے ورنہ ہم ان کے

خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ شکایت کے وقت رسول اللہؐ موجود تھے، انھوں نے کہا کہ میرا مقصد توحید کی اشاعت ہے، میں چاہتا ہوں کہ مورتیوں کا سہارا چھوڑکر صرف خدا کی طرف رجوع کیا جائے اور مجھے خدا کا رسول مانا جائے، اگر آپ لوگ یہ دو باتیں مان لیں تو میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو شکایت پیدا ہو بلکہ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ آخرت میں جنت کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے اور دنیا میں عرب وغیر عرب اقوام پر آپ کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ اکابر اس سودے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور منہ پھلائے چلے گئے۔ انھوں نے اپنے محلوں کے مسلمانوں پر مختلف قسم کا دباؤ ڈالنا شروع[1] کر دیا۔ عزیزوں کو دھمکی دیتے کہ اگر انھوں نے اسلام ترک نہیں کیا تو ان سے قطع تعلق کر لیا جائے گا، اگر وہ تاجر ہوتے تو ان سے خرید و فروخت اور ہر طرح کا لین دین بند کرنے کی دھمکی دیتے، اگر ہم محلہ ہوتے تو انھیں غیرت دلاتے کہ شریف آدمی ہو کر اپنے خاندان کو بدنام کرتے ہو، اپنے آبار واجداد کو کافر کہتے ہو اور ان کے دوزخی ہونے کا اقرار کرتے ہو[2]۔ حلیفوں کو دھمکی دیتے کہ ہم تمہارا حلف منسوخ کر دیں گے اور تم معاشرہ میں بے یار و مددگار ہو کر رہ جاؤ گے۔ یہ دھمکیاں جلد حقیقت بن گئیں اور ان کی گرفت بعض مسلمانوں پر اتنی سخت ہوئی کہ وہ گھبرا گئے۔ طے ہوا کہ حالات سازگار ہونے تک یہ لوگ حبشہ چلے جائیں جہاں ایک شریف، نیک طینت عیسائی بادشاہ حکمراں تھا اور جہاں کے تاجروں سے ان میں سے بعض کے اچھے تعلقات تھے[3]۔ قرارداد کے مطابق گیارہ مردوں اور چار عورتوں[3] کی ایک جماعت حبشہ چلی گئی اور وہاں آرام سے دو ماہ گذارے، یہ اعلان نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے

---

[1] انساب الاشراف ۱/۱۹۸

[2] طبری (تاریخ مصر) ۲/۲۲۱

[3] ابن سعد ۱/۲۰۴

اور حبشہ کی پہلی ہجرت کہلاتا ہے۔ اس ٹولی کے ممتاز اشخاص یہ تھے: عثمان غنی اور ان کی بیوی رقیہ، زبیر بن عوام، مصعب بن زبیر بن ہاشم، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن مسعود۔

قریش کی دباؤ ڈال کر ستانے کی مہم جاری رہی اور رسول اللہؐ کی تحریک آزمائشوں اور مشکلات کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اپنے اپنے ماتحتوں، رشتہ داروں، حلیفوں اور دست نگر مسلمانوں پر دباؤ ڈال کر دل کا غبار نکالنے میں اکابر ایسے مصروف ہوئے کہ ان کی توجہ رسول اللہؐ کی طرف کم ہوگئی۔ ایک دن صحن کعبہ میں رسول اللہؐ تنہا بیٹھے تھے۔ ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی۔ کاش کوئی ایسی وحی نہ آجائے کہ اکابر قریش مجھ سے اور زیادہ بھڑکیں اور منحرف ہوں۔ لیتہ لا ینزل علیّ شئی ینفرھم عنی۔ رسول اللہؐ ان کی تالیف قلب کرنے لگے، جواب میں اکابر قریش بھی نرم پڑ گئے اور رسول اللہؐ کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا۔

ایک دن رسول اللہؐ نے جبکہ صحن کعبہ میں اکابر موجود تھے سورۂ نجم کی تلاوت کی۔ والنجم اذا ھویٰ ــــ أفرأیتم اللات والعزّیٰ ومناۃ الثالثۃ الأخریٰ، تلك الغرانیق العُلیٰ وإن شفاعتھن لترتجیٰ ــ کیا تم نے لات، عُزّیٰ اور تیسری مورتی مناۃ کے متعلق غور کیا ہے؟ یہ بلند پایہ ہستیاں ہیں جن سے لوگوں کو توقع ہوتی ہے کہ وہ خدا سے ان کی سفارش کریں گی۔

اس کے بعد رسول اللہؐ نے سورت کا باقی حصہ تلاوت کرکے سجدہ کیا، سجدہ میں اکابر قریش بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے ــ تلك الغرانیق العُلیٰ والی آیت کا ان پر اچھا اثر ہوا، انھوں نے کہا: محمد، ہم جانتے ہیں کہ اللہ ہی جلاتا ہے، اللہ ہی مارتا ہے، اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی رزق دیتا ہے لیکن ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ مورتیاں خدا سے ہماری سفارش کرتی ہیں، اب چونکہ تم نے خدا کے دربار میں انھیں با اثر مان لیا ہے، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ رسول اللہؐ کو ان کی یہ بات کھٹکی، وہ گھر چلے گئے، انھوں نے محسوس کیا کہ

---

[1] ابن سعد ۱/ ۲۰۵

تلک غرانیق العُلیٰ والی آیت انھیں القا نہیں ہوئی تھی، جلد ہی وحی کے ذریعہ اس آیت کی تردید ہوگئی اور مورتیوں کے بارے میں رسول اللہ ؐ کا مؤقف وہی رہا جو پہلے تھا۔ اکابر قریش کو تردید پر طیش آیا اور پہلے کی طرح وہ پھر رسول اللہ سے بگڑ گئے۔

(باقی)

از سعید احمد اکبر آبادی

البتہ ڈاکٹر صاحب میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ جس کے وہ دوست ہوتے اور جس پر ان کی نظرِ لطف و کرم ہوتی اسے وہ خوب نوازتے تھے اور یہ امداد کا جذبہ ان میں اتنا شدید تھا کہ اگر اس شخص سے ذاتی طور پر ان کو کبھی تکلیف پہونچی ہے تو وہ اسے بھی نظر انداز کر دیتے تھے، ظاہر ہے دوست نوازی کا یہ جذبہ ذاتی اور شخصی معاملات میں نہایت محمود اور عالی حوصلگی و بلند نگاہی کی دلیل ہے لیکن جب اس کا ظہور قومی اور ملی امور میں ہو تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور اس سے قومی و ملی مفاد کا نقصان ہوتا ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی (اکتوبر ۱۹۵۶ء میں) وائس چانسلر مقرر ہوئے، موصوف جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں، نہایت شریف، با مروت اور وضعدار انسان ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اس کے بعد ریاست رامپور میں وزیر اعظم رہے ہیں۔ ریاست کے آخری دور میں انتظامی، تعلیمی

اور معاشی اصلاحات اور ترقیاں جو کچھ بھی ہوئیں وہ موصوف کے ہی حسنِ تدبر اور حسنِ انتظام کا نتیجہ تھیں، پھر عادات وخصائل اور طور طریق زندگی کے اعتبار سے بھی ان کی مشرقیت صاف ظاہر اور نمایاں تھی، اگرچہ ان کا شش سالہ عہدِ وائس چانسلری بیرونی اور اندرونی خلفشار کے اعتبار سے یونیورسٹی کا ایک پر آشوب اور صبر آزما دور تھا، لیکن وہ جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ اپنی کشتی اس منجدھار میں سے صحیح سلامت نکال کر لے گئے وہ ان کی بیدار مغزی، اخلاص اور عزم وہمت کی دلیل ہے۔

ایک معذرت قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ راقم الحروف کا علی گڑھ سے تعلق زیدی صاحب کے عہد میں ہی ہوا تھا اس بنا پر اب یہاں سے لے کر آخر تک جو کچھ لکھا جائے گا وہ راقم الحروف کے ذاتی مشاہدات وتجربات اور احساسات وتاثرات کے ماتحت اور ان کی روشنی میں ہوگا۔ اس لئے دو باتوں کی معذرت کر دینا ضروری ہے، ایک اس بات کی کہ آیندہ میں صیغۂ واحد متکلم استعمال کروں گا اور ایسے موقع پر ممکن ہے بعض جملوں اور فقروں سے خودستائی کا پہلو پیدا ہو تو قارئین مجھے معاف فرمائیں اور یقین رکھیں کہ ان کا مقصد اپنی بالاخوانی ہرگز نہیں ہے، بلکہ محض بیان واقعات ہے جس کی تصدیق علی گڑھ کا ہر واقف حال کر سکتا ہے، واللہ علی ما اقول شہید، اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے میرے بعض فقروں سے کسی کو کوئی ناگواری ہو تو ان کو بھی باور کرنا چاہیے کہ ان کا مقصد ہرگز شخصی طور پر کسی کی آزردہ دلی نہیں ہے، برہان کا پورا فائل اس کا گواہ ہے کہ میرا قلم ہمیشہ اس سے بڑی سختی کے ساتھ مجتنب اور محترز رہا ہے، بلکہ اس کا مقصد بھی اظہار واقعات ہی ہے جس کو موجودہ حالات میں یونیورسٹی کی اصل حیثیت اور پوزیشن واضح کرنے کے لئے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ میں میرے بلانے کی تحریک بھائی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع سے مجھ کو علی گڑھ لانے کے خواہاں اور اس کی فکر میں تھے، چنانچہ

میمن عبدالعزیز صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہاں عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو انھوں نے مجکو اس کے بارہ میں لکھا، میں نے جواب دیا کہ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مجکو کلکتہ بھیجا ہے اور میں یہاں صرف ان کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں اس لئے جب تک مولانا خود بطیب خاطر اجازت نہیں دیں گے میں کلکتہ چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ اس خط کے پندرہ بیس دن کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا جواب آیا کہ میں نے مولانا ابوالکلام سے گفتگو کرلی ہے وہ فرماتے ہیں کہ سعید کے کلکتہ بھیجنے سے میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا ہے، یعنی کلکتہ مدرسہ تقسیم کے وقت بالکل ختم ہوگیا تھا اب پھر وہ دوبارہ قائم ہوگیا ہے اور اپنی گذشتہ شان وشوکت کے ساتھ چل رہا ہے، اس لیے سعید اب اگر کہیں اور جانا چاہے تو جاسکتا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اب مدرسۂ عالیہ کلکتہ اس پوزلیشن میں ہے کہ کوئی بھی اس کا پرنسپل ہو اسے سنبھال سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد مجھے کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن مجکو علی گڑھ کی سیاست اور وہاں کے حالات کا جو علم تھا اس کی بنا پر میں نے بھائی مرحوم کو پھر لکھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ڈاکٹر عبدالعلیم کو عربی کا پروفیسر بنانے کی ٹھانے ہوئے ہیں اس لئے کوئی اور شخص اس جگہ پر آہی نہیں سکتا، بہتر یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں اور میرا کسی سے تذکرہ بھی نہ کریں، لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اس زمانہ میں وہ کورٹ کے بھی ممبر تھے اور اکزکٹو کونسل کے بھی، آخر انھوں نے ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے میرے متعلق کہہ ہی دیا، ڈاکٹر صاحب کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے تھوڑی تھے جو مولانا کی باتوں میں آجاتے، فوراً بولے: مولانا! اس میں شبہ نہیں کہ اکبرآبادی اس جگہ کے بہمہ وجوہ مستحق ہیں لیکن مدرسۂ عالیہ کلکتہ بھی تو علی گڑھ کی طرح ہمارا ایک وقیع اور نامور قومی وملی ادارہ ہے، ہمیں اس کا مفاد بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، یہاں عربی کی پروفیسر شپ کے لئے تو کچھ دوسرے لوگ بھی ہوسکتے ہیں لیکن کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے لئے اکبرآبادی جیسا کوئی دوسرا پرنسپل نہیں مل سکتا،

اس لئے قومی مفاد کے پیش نظر میری قطعی اور آخری رائے ہے کہ اکبر آبادی کو کلکتہ سے نہ ہٹایا جائے، مولانا ڈاکٹر صاحب کے تیور پہچان گئے اور چپ ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

عجیب بات ہے، ایک وقت تھا جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے علی گڑھ میں مجھکو لانے کی تحریک کی اور نا کام رہے اور جب کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر ہوئے تو اب انھوں نے خود مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھکو علی گڑھ آنے پر آمادہ کردیں، زیدی صاحب نے علی گڑھ آتے ہی یونیورسٹی میں اصلاحات کرنے اور اس کو ترقی دینے کا جو وسیع پروگرام بنایا تھا اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی (جو اس وقت کس مپرسی کے عالم میں تھی) کو بھی آگے بڑھانے کا پروگرام شامل تھا، اس فیکلٹی کے ماتحت دو شعبے ہیں ایک شعبۂ سنّی دینیات اور دوسرا شعبۂ شیعہ دینیات، اول الذکر کی صدارت کے لئے زیدی صاحب نے میرا انتخاب کیا اور موخر الذکر کی صدارت کے لئے مولانا سید علی نقی النقوی کا جو اپنے علم وفضل اور علمی وجاہت کے باعث ایران اور عراق کے علماء میں بھی معروف ومشہور تھے، زیدی صاحب ایک عملی آدمی ہیں۔ جب وہ ایک کام کا ارادہ کرتے ہیں تو دیر نہیں کرتے اور لگ لپٹ کر اسے جلد سے جلد کر گذرتے ہیں۔ انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے جب میرے متعلق بات چیت کی اور مولانا نے اس سلسلہ میں ان کی امداد کا وعدہ کر لیا تو انھوں نے مولانا سے کہا کہ خط وکتابت سے کام نہیں چلے گا۔ آپ خود کلکتہ جائیے اور پختہ وعدہ لے کر آئیے، چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کلکتہ آئے اور گفتگو کی، گفتگو میں مولانا نے یہ بھی کہا کہ سنی دینیات کی صدارت کے ساتھ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹر شپ بھی تم کو دینے کا ارادہ ہے، اس کے متعلق میں نے صاف لفظوں میں کہا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد العلیم ہیں اس لئے میں ہرگز اس کو پسند نہیں کروں گا کہ ان کا یہ عہدہ ان سے چھین کر مجھکو دیا جائے البتہ ڈاکٹر عبد العلیم خود اپنی خواہش سے کسی سبب سے مستعفی ہو جائیں تو مجھکو

اس کی ذمہ داری قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا[1]، اس لئے اب مجکو جو کچھ غور کرنا ہے وہ صرف شعبۂ دینیات کے معاملہ پر غور کرنا ہے اور اس کا جواب میں کچھ دلوں کے بعد دوں گا۔

مولانا واپس چلے گئے۔ میں نے یہاں غور کیا تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں کلکتہ میں ایک سرکاری ادارہ کا پرنسپل تھا اور اس حیثیت سے میں وہاں فرسٹ کلاس گورنمنٹ گزیٹڈ آفیسر تھا اور میری تنخواہ اس وقت وہی تھی جو آج کل علی گڑھ میں پروفیسر کی ہوتی ہے، پھر ایک نہایت شاندار کوٹھی مفت بغیر کرایہ کے سرکار کی طرف سے ملی ہوئی تھی، اور اس کے مقابلہ میں علی گڑھ میں جو پوسٹ تھی وہ صرف ریڈر کی تھی، پروفیسر کی پوسٹ ابھی تک دینیات کے لئے منظور نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود محض علی گڑھ یونیورسٹی کی عموماً اور اس کے شعبۂ دینیات کی خصوصاً خدمت کے جذبہ سے میں نے علی گڑھ جانے کا ارادہ کر لیا اور بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کو اس کی اطلاع دے دی، لیکن جب بنگال گورنمنٹ کو اس کا علم ہوا تو چیف منسٹر ڈاکٹر بی۔ سی رائے نے شخصی طور پر اس میں مداخلت کی اور مجکو بلا کر گفتگو کی، یہ گفتگو کئی روز تک چلتی رہی، اتفاق سے انھیں دلوں میں پروفیسر آل احمد سرور میرے ہاں مقیم تھے، جو کچھ ڈاکٹر بی۔ سی رائے سے گفتگو ہوتی تھی میں شام کو گھر آ کر پروفیسر سرور صاحب

---

[1] میری اس قدر صاف اور صریح گفتگو کے بعد بھی سخت افسوس ہے کہ جب میں علی گڑھ پہونچا تو ایک حلقہ میں میری نسبت پروپگنڈا بھی کیا گیا کہ میں انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر بننے کی خواہش میں آیا ہوں، حالانکہ زیدی صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جو اس زمانہ میں پرو وائس چانسلر تھے یا میرے دوست احباب گواہی دے سکتے ہیں کہ میں نے کسی کے سامنے اس قسم کی خواہش کا کبھی بھولے سے بھی تذکرہ کیا ہو! اس کے لئے درخواست کرنا یا پروپگنڈہ کرنا تو بہت بڑی بات ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں میری فطرت اور طبیعت سے بہت بعید ہیں۔

سے اسے نقل کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ میں کلکتہ نہ چھوڑوں۔ میں کلکتہ چھوڑنے کا جو سبب بیان کرتا تھا ڈاکٹر صاحب فوراً اس کا توڑ کر دیتے تھے، آخر جب میرے سب حربے بیکار ہو گئے تو میں نے کہا: "میں زیدی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور اب وعدہ خلافی کرتے ہوئے شرم آتی ہے اس لئے آپ اگر زیدی صاحب کو خط لکھ کر مجکو ان سے مانگ لیں اور وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو میری شرم رہ جائے گی اور میں کلکتہ نہیں چھوڑوں گا۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: "میں زیدی صاحب کو جانتا ضرور ہوں، لیکن معاملہ ایسا ہے کہ میں ان کو نہیں لکھ سکتا۔" بات اس پر ختم ہو گئی اور میں وہاں سے سبکدوش ہو کر ۵۹ء میں علی گڑھ چلا آیا۔[1]

یہاں علی گڑھ میں زیدی صاحب نے میرے ساتھ لطف و کرم اور تعظیم و تکریم کا جو خصوصی معاملہ کیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں دینیات کی کتنی اہمیت اور اس کو ترقی دینے کا کیسا جذبہ اور ولولہ تھا، میرے سب دوست احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لین دین کے معاملہ میں کبھی میری زبان کھلتی ہی نہیں ہے، چنانچہ یہاں بھی میں نے تنخواہ وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا اور نہ اس پر گفتگو کی، لیکن زیدی صاحب نے از خود میرے متعلق اکزکٹو کونسل سے تین باتیں ایسی منظور کرا لیں جو غالباً پوری یونیورسٹی میں کسی کے لئے بھی نہیں ہوں گی۔ حالانکہ مولانا سید علی نقی النقوی صاحب شیعوں میں مجتہد اعظم

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو میرے علی گڑھ جانے کی خبر ہوئی تو از راہ شفقت و محبت پٹنہ سے مجھے خط لکھا اور اس میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے متعلق اظہار تشویش کرنے کے بعد اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد یہ شعر تحریر کیا:

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کا مرتبہ رکھتے ہیں اور زیدی صاحب (جو خود بھی شیعہ ہیں) مولانا کے معتقدوں میں سے ہیں ، لیکن ان تین خصوصیات سے وہ بھی محروم تھے ، اور وہ یہ ہیں :

(۱) مجھکو ریڈر کی پوسٹ کی انتہائی تنخواہ دی گئی ۔

(۲) میرے لئے آزمائشی ایک سال کی مدت (PROBATION) اڑادی گئی اور پہلے ہی دن میں مستقل ہو گیا۔

(۳) ایک بڑی وسیع اور کشادہ کوٹھی مجھکو رہائش کے لئے مفت بغیر کرایہ کے دی گئی اور چونکہ میں سینیئر تھا اس لئے صدر شعبۂ سنی دینیات ہونے کے علاوہ فیکلٹی کا ڈین بھی میں ہی مقرر کیا گیا اور اس طرح سنی دینیات کے علاوہ شیعہ دینیات کا شعبہ بھی میری نگرانی اور انتظام میں آگیا۔ زیدی صاحب کے زمانہ میں اس فیکلٹی نے کیا ترقی کی اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔

میں جب علی گڑھ پہونچا ہوں تو اس وقت یہاں اساتذہ میں دو گروہ تھے اور دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار ۔ ایک گروہ اسلام پسند کہلاتا تھا اور دوسرا کمونسٹ یا ترقی پسند، پہلے گروہ میں دو قسم کے لوگ شامل تھے ایک وہ جو واقعی عملاً بھی مسلمان تھے اور دوسرے وہ جن کو عملاً اسلام سے تعلق محض برائے نام ہی تھا ۔ عید بقرعید کے سوا مسجد میں ان کی صورت نظر نہیں آتی تھی، یہی حال دوسرے طبقہ کا تھا، اس میں چند لوگ تو وہ تھے جو واقعی کمونسٹ تھے اور غالباً اس پارٹی کے باقاعدہ ممبر بھی تھے، ان کے علاوہ چند ایسے افراد بھی اس گروہ میں شامل تھے جو کمونسٹ برائے بیت ہی تھے ۔ ان دونوں گروہوں کی کشمکش کا اثر یونیورسٹی کے نظم ونسق پر اس طرح پڑتا تھا کہ کسی پوسٹ (خواہ تعلیمی ہو یا انتظامی) پر تقرر کا جب معاملہ پیش آتا تھا تو ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ڈھب کا آدمی ہو ۔ اس زمانہ میں بعض تقررات ایسے ہو گئے جن پر دونوں گروہوں میں سخت کشمکش اور کشیدگی برپا تھی اور یہ تقرر گویا اسلام اور کفر کی جنگ کا باعث ہو گئے تھے ، میری افتاد طبع شروع سے یہ رہی ہے کہ کالج یا دفتر اور وہاں سے سیدھا گھر ! دو ایک نہایت عزیز اور علمی مذاق کے

دوست کبھی کبھار ان کے مکان پر چلا گیا تو چلا گیا ورنہ کبھی کسی کے مکان پر بغرض ملاقات نہیں جاتا۔ پارٹی بازی اور گروہ بندی سے ہمیشہ دور رہا ہوں اور اسی وجہ سے کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا کبھی ممبر تک نہیں ہوا۔ اس بنا پر مذکورہ بالا دو طبقوں میں سے میرا تعلق کسی ایک طبقہ سے بھی نہیں تھا۔ اکاڈمک کونسل وغیرہ میں جب کوئی معاملہ آتا تھا تو جو بات میرے نزدیک خدا لگتی اور ایمانداری کی ہوتی تھی وہ کہتا تھا۔ اسلام پسند طبقہ میں مشہور تھا کہ ترقی پسند طبقہ کو زیدی صاحب کی سرپرستی حاصل ہے، لیکن درحقیقت یہ ان پر بالکل غلط الزام تھا، وہ جو فیصلہ کرتے تھے ایمانداری اور جرأت سے کرتے تھے، اس میں نہ گروہ بندی کا شائبہ ہوتا تھا اور نہ حکومت کے ساتھ تملق اور چاپلوسی کا، چنانچہ میرے سامنے کی بات ہے شعبۂ معاشیات میں لکچرر کی پوسٹ پر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کے تقرر کے سلسلہ میں سلکشن کمیٹی کی سفارشات اکزکٹو کونسل میں پیش ہوئیں تو ایک نہایت نامور اور مشہور غیر مسلم ممبر کونسل نے زیدی صاحب کو خطاب کر کے کہا: "جناب وائس چانسلر صاحب! ان صاحب کے متعلق آپ نے تحقیق بھی کرلی ہے، یہ جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن اور عہدہ دار ہیں" زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا: "جی ہاں! میرے علم میں ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے عہدہ دار ہیں، لیکن اپنے مضمون میں قابل بھی ایسے ہیں کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی کے جو پروفیسر معاشیات آئے تھے انھوں نے نجات اللہ صدیقی کے انتخاب پر مجکو مبارک باد پیش کی تھی" اس کے بعد زیدی صاحب ان صاحب کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوئے اور بولے: مجھے معلوم ہے کہ گورنمنٹ جماعت اسلامی کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن گورنمنٹ کا کوئی آرڈر یا سرکلر اس بارہ میں بالکل نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کے ممبر کو ملازمت میں نہ لیا جائے اس بنا پر محض جماعت کا ممبر ہونے کے باعث ایک لائق اور قابل شخص کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھانا یونیورسٹی کے ساتھ خیر خواہی نہیں بدخواہی ہے اور یہ بدخواہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس زمانہ میں اکزکٹو کونسل میں اسلام پسند طبقہ کے نمائندہ اور لیڈر جناب ایم۔ اے خواجہ تھے،

انھوں نے زیدی صاحب کا یہ جرأت مندانہ جواب سنا تو خوشی میں سامنے کی میز کو زور سے تھوپ تھوپ کر اس کی داد دی اور اس کے بالمقابل جو صاحب ترقی پسند طبقہ کے نمائندہ تھے، میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ ایک واقعہ میں نے بہ طور مثال لکھا ہے ورنہ مجھے اور بھی متعدد واقعات یاد ہیں جن میں زیدی صاحب نے اکاڈمک کونسل یا اکزکٹو کونسل میں ایسے ہی جرأت مندانہ اقدامات کئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے مفاد کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے۔

زیدی صاحب گھر کے رئیس اور نواب تھے اور ایک ریاست کے وزیراعظم رہ چکے تھے، اس بنا پر طبیعت میں فیاضی، سیرچشمی اور عالی ہمتی تھی۔ ان اوصاف و کمالات کے باعث وہ اساتذہ اور طلبار دونوں میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے کہ ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی کے بعض طلبار میں مارپیٹ کے باعث جب شہر میں بہت سنگین ہندو مسلم فساد ہوا ہے اور ہندو نوجوانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے شمشاد مارکیٹ میں آکر لوٹ مار کی اور آگ لگائی تو ایس۔ ایس ہال کے تمام طلبا رغصہ میں بھرے ہوئے سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور شمشاد مارکیٹ کی طرف بڑھنے لگے تو زیدی صاحب فوراً موقع پر پہونچ گئے اور بڑی ہمت کے ساتھ ان لڑکوں کا راستہ دونوں ہاتھ پھیلا کر روک کر کھڑے ہوگئے، میں اس وقت زیدی صاحب کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا، زیدی صاحب نے ایس ایس ہال کے تمام دروازے مقفل کرا دیئے تھے، شمالی دروازہ پر طلبار کا ہجوم تھا، وہ انتقام انتقام اور اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے اور زیدی صاحب ان سب کو روکے ہوئے کہہ رہے تھے کہ میں آپ لوگوں کو ہرگز نہیں جانے دوں گا، آپ لوگ اطمینان رکھیں میں نے پولیس کی ایک بھاری جمعیت کو بلوا کر غنڈوں اور بدمعاشوں کو شمشاد مارکیٹ سے بھگوا دیا ہے اور اب وہاں امن وامان ہے، ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں خبر آئی کہ غنڈوں نے زنانہ کالج میں لڑکیوں کے ہوسٹل پر حملہ کر دیا ہے، یہ سنتے ہی لڑکے آپے سے

باہر ہو گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے: لعنت ہے ہمارے اوپر، اگر ہم اپنی بہنوں کی حفاظت نہ کریں اور غنڈوں سے انتقام نہ لیں۔ زیدی صاحب نے ہر چند کہا اور سمجھایا کہ یہ خبر غلط اور بے بنیاد ہے، مگر لڑکے ماننے والے کہاں تھے، آخر زیدی صاحب نے کہا کہ اچھا چلو! میں خود تمھارے ساتھ چلتا ہوں، اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں تم کو اجازت دیدوں گا کہ غنڈوں کو ایسا سبق دو جو عمر بھر ان کو یاد رہے، چنانچہ زیدی صاحب آگے آگے اور سینکڑوں طلبار ان کے پیچھے، زنانہ کالج پہونچے تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ خبر غلط اور بے بنیاد تھی، لڑکوں کو اب اطمینان ہو گیا اور زیدی صاحب نے ان سب کو پرامن طریقہ پر واپس لاکر انھیں ان کے ہوسٹلوں میں بند کر دیا، یہ تمام واقعات میری نظر سے گزرے ہیں اور میرے دل پر زیدی صاحب کی پھرتی، مستعدی، بیدار مغزی اور ہمت و جرأت کا بڑا اثر ہے، اڈمنسٹریشن ہو تو ایسا ہو، میرے خیال میں بدر الدین طیب جی کو مستثنیٰ کر کے کسی اور وائس چانسلر کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مشتعل طلبار کے اس سیلِ رواں کے سامنے دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور حسنِ تدبیر سے اس طرح ان کو قابو میں لے آتا۔

زیدی صاحب کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی بڑا لحاظ اور پاس تھا، یونیورسٹی کے ہر فنکشن کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا تھا، مغرب کی نماز کے وقت میٹنگ ملتوی ہو جاتی تھی، رمضان کے شروع میں رجسٹرار آفس سے باقاعدہ ہدایت نکلتی تھی کہ اس ماہِ مقدس میں دن کے وقت مطبخ بند رہیں گے اور یونیورسٹی میں کہیں لنچ یا ٹی پارٹی نہیں ہوگی، خود بھی روزہ رکھتے تھے اور ایک روز اپنے ہاں بڑی شاندار افطار پارٹی کرتے تھے جس میں اساتذہ اور انتظامیہ کے حضرات کثرت سے مدعو ہوتے تھے، اسی قسم کی ایک پارٹی کا لطیفہ ہے کہ ایک بہت طویل میز پر انواع و اقسام کے پھل اور مخصوص قسم کی افطاریاں چنی ہوئی تھیں اور سب حضرات میز کے دونوں طرف کھڑے افطار کے وقت کا انتظار کر رہے تھے، میں زیدی صاحب کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مولانا سید علی نقی النقوی صاحب ہم دونوں کے سامنے میز کی دوسری جانب

کھڑے تھے، اتنے میں مسجد کا سائرن بجا اور میں نے افطار کے لئے ہاتھ بڑھایا تو زیدی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ مولانا ادبدا کے بولے : زیدی صاحب ! ابھی ہمارا وقت نہیں ہوا ہے۔ زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا : سنئے مولانا ! میں نماز پڑھتا ہوں شیعہ مذہب پر، لیکن روزہ افطار کرتا ہوں سنی مذہب کے مطابق۔

زیدی صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہو تاکہ جمعہ کی نماز کا خطبہ اور تلاوتِ قرآن ہر شخص تک پہونچے لیکن ناظم سنی دینیات مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مرحوم کے نزدیک یہ ناجائز تھا اس لئے وہ اس کے سخت مخالف تھے، جب میں علی گڑھ آیا تو زیدی صاحب نے مجھ سے بھی اس خواہش کا اظہار کیا، میں نے ان کی تائید کی اور دوسرے دن ناظم صاحب مرحوم کو دفتر میں بلاکر میں نے پوچھا کہ آپ لاؤڈ اسپیکر کو کیوں ناجائز سمجھتے ہیں ؟ انھوں نے اس کے دلائل پیش کئے، میں نے ان کے جوابات دیے، مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی، میں نے بہرحال مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگانے کا حکم دے دیا، زیدی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور مجھکو دعائیں دیں، زیدی صاحب کھلے دماغ سے ہر ایک معاملہ پر غور کرتے تھے اور اس طرح جب وہ ایک فیصلہ کر لیتے تھے، اب ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب ان کی محبوب اور نہایت لائق بیوی قدسیہ بیگم کا انتقال ہوا تو لوگوں میں بڑا چرچا تھا کہ نماز جنازہ سنی مذہب کے مطابق ہوتی ہے یا شیعہ مذہب کے مطابق، لیکن جب جنازہ کوٹھی سے روانہ ہونے لگا تو زیدی صاحب نے یہ اعلان کر کے تمام چہ می گوئیاں ختم کر دیں کہ "میری درخواست پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نماز جنازہ پڑھائیں گے[۱]"

زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپ یونیورسٹی کے آئین و ضوابط

---

[۱] واضح رہے کہ مرحومہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بہن اور سنی المذہب تھیں۔

کے اندر رہ کر کس طرح باہم دگر برسرپیکار رہتے اور زیدی صاحب حق و انصاف کی راہ اختیار کرتے تھے ؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شعبۂ فارسی کے لئے پروفیسر کا انتخاب ہونا تھا اور اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد جو یہاں پہلے سے ریڈر چلے آرہے تھے امیدوار تھے ۔ ڈاکٹر صاحب فارسی زبان و ادب کے نہایت بلند پایہ فاضل اور محقق ہیں اور ان کی تحقیقات و انکشافاتِ علمی کی دھوم ایران کی علمی مجلسوں میں بھی ہے، لیکن ساتھ ہی موصوف شکل و صورت، وضع قطع اور عمل و کردار کے اعتبار سے بالکل مولانا بھی ہیں، اس بنا پر ڈاکٹر صاحب ترقی پسند گروپ کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے اور وہ اس فکر میں تھا کہ سلکشن کمیٹی کے لئے بحیثیت اکسپرٹ کے ایسے حضرات کا انتخاب کرائے جن سے اس کا مدعا پورا ہو۔ میں ترقی پسند گروپ کی اس کوشش سے واقف تھا، اس لیے جب اکاڈمک کونسل میں فارسی کے پروفیسر کی پوسٹ کے لئے سلکشن کمیٹی بنانے کا آئیٹم پیش ہوا میں نے فوراً کھڑے ہو کر قاضی عبدالودود کا نام پیش کر دیا، جیسا کہ توقع تھی ترقی پسند گروپ کے سربراہ جو اس وقت غالباً ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس بھی تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر میری مخالفت کی اور کہا کہ قاضی صاحب اردو زبان و ادب کے بلند پایہ محقق ہیں۔ لیکن وہ فارسی کے آدمی نہیں ہیں، میں نے جواب میں کہا کہ قاضی صاحب اردو کی طرح فارسی زبان و ادب کے بھی بڑے فاضل نقاد اور بلند پایہ محقق ہیں اور استدلال میں فارسی زبان و ادب پر موصوف کے پانچ چھ بلند پایہ تحقیقاتی مقالات کا حوالہ دیا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے میری تائید کی اور یہ نام منظور ہو گیا۔ دوسرا نام ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم کا پیش ہوا اور وہ بھی منظور ہو گیا۔ جب سلکشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو وہ ہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم نے ایک اور صاحب کے نام کی سفارش کی اور قاضی عبدالودود صاحب نے ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں رائے دی، جب بحث زیادہ بڑھی تو قاضی صاحب کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا اور انھوں نے بہ طور چیلنج کے

ڈاکٹر ہادی حسن سے کہا کر آپ کے پسندیدہ امیدوار کی جو تحقیقی کتاب ہے اور جس پر ان کو بڑا ناز ہے اسے ذرا منگوائیے، میں نے اس میں چالیس غلطیاں نوٹ کی ہیں، آپ مجکو ان کا جواب دے دیجئے، اور اس کے بالمقابل ڈاکٹر نذیر احمد کے تحقیقاتی مضامین یہ ہیں، آپ ان میں کوئی غلطی ہو تو اس کی نشاندہی فرما دیجئے اس پر معاملہ ختم ہو گیا اور ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر نذیر احمد بن گئے، یہ سب کچھ زیدی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ انھوں نے اکاڈمک کونسل یا سلکشن کمیٹی میں کوئی ایسی بات نہیں کہی اور نہ کوئی ایسا کام کیا جس کو دھاندلی یا عصبیت (MENTAL RESERVATION) کہا جائے، مجھے معلوم ہے کہ اسلام پسند گروپ کے لوگوں کے دل میں ان کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جاتا تھا، لیکن میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ وہ گروپ بندی اور جماعتی عصبیت سے بلند و بالا تھے، ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ان میں بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن وہ انڈی پنڈنٹ طرز فکر کے آدمی تھے نہ کسی پارٹی کے آلۂ کار تھے اور نہ حکومت کے خوشامدی، انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ کے وقار اور مرتبہ کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں یونیورسٹی میں بڑی ترقی ہوئی، نئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کی وجہ سے ان کو علی گڑھ کا شاہجہاں کہا جاتا تھا، میڈیکل کالج کی تعمیر اور اس کا آغاز انھیں کے عہد میں ہوا۔ وہ سفر کم کرتے تھے، دفتر میں پابندی سے بیٹھنا، فائلوں کو دیکھنا اور میٹنگس میں شریک ہونا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ علی الصباح ٹہلنے کے بڑی سختی سے پابند تھے، لیکن یہ وقت بھی یونیورسٹی کے کام سے فارغ نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی میں جو عمارتیں زیر تعمیر ہوتی تھیں وہ ان کا معائنہ کرتے اور ضرورت ہوتی تو اس سلسلہ میں کوئی کارروائی کرتے تھے۔ سحرخیزی کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، بعض اوقات یونیورسٹی کے اہم معاملات پر غور و خوض وہ اسی وقت کرتے تھے اور رجسٹرار وغیرہ کو علی الصباح اپنی کوٹھی پر بلا کر ان امور پر گفتگو کرتے تھے، منہ اندھیرے میں بھی ٹہلنے اور ہوا خوری کا عادی ہوں،

میری اور ان کی مڈبھیڑ ہوجاتی تو بعض اوقات بڑی حسرت سے کہتے کہ "مولانا! دیکھئے کیا عجیب سہانا وقت ہے، اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے صرف ہم دو مسلمان ہیں جو اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، باقی یہ سب ہندو ہیں جو آپ کو ہواخوری کرتے نظر آرہے ہیں۔

ایک عظیم کارنامہ یہ سب کچھ تو ہے ہی لیکن دستوری اعتبار سے زیدی صاحب نے جو ایک اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور یونیورسٹی کی تاریخ جدید کا کوئی مورخ اسے نظرانداز نہیں کرسکے گا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے تقسیم کے بعد سے اس غریب یونیورسٹی کو کبھی چین نصیب نہیں ہوا، اس پر ہمیشہ اعتراضات اور خوردہ گیری کی بوچھار ہوتی رہی اور وقت کی چشم فسوں ساز کوئی نہ کوئی فتنہ جگاتی رہی ہے، غالب نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

یونیورسٹی کی نسبت پبلک میں کچھ نہ کچھ چہ می گوئیاں ہوتی رہتی تھیں، زیدی صاحب کے زمانہ میں (غالباً ۵۸ء میں) ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں یونیورسٹی پر بڑی لے دے ہوئی اور اس سلسلہ میں وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے زیدی صاحب سے کچھ سوالات بھی کئے جن کے مناسب جوابات بھیجدیے گئے۔ لیکن کہنے والوں کی زبانیں پھر بھی بند نہ ہوئیں تو آخر زیدی صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ایما پر یونیورسٹی کی اکزکٹو کونسل کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی، اس کمیٹی کے صدر مشہور ماہر تعلیم پروفیسر جی، سی چٹرجی تھے اور سکریٹری مسٹر آر۔ بی۔ نائک آئی، سی، ایس جوائنٹ سکرٹری وزارت تعلیم تھے، بقیہ ارکان کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب تھے:

(۱) پروفیسر واڈیا۔ (۲) شری کرتار سنگھ ملہوترا۔ (۳) مسٹر پی، این، سپرو۔ (۴) مسٹر ایم۔ اے شاہ میری، باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ یہ پوری کمیٹی ان حضرات پر مشتمل تھی جو

تعلیم کے نامور اور مشہور ماہر سمجھے جاتے ہیں اور اس بنا پر حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور کمیٹی نہیں ہوسکتی تھی، اب یہ بھی سن لیجئے کہ یونیورسٹی پر جو اعتراضات شدومد سے کئے جاتے تھے ان کے بیت الغزل حسب ذیل تین اعتراضات تھے:

(۱) یونیورسٹی فرقہ پرستی کا گڑھ ہے۔ اس کے طلبار اور اساتذہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دماغ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہیں، اور اس بنا پر یونیورسٹی کے داخلوں میں، امتحانات میں اور تقررات میں غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

(۲) یونیورسٹی میں اقربا نوازی (NEPOTISM) عام ہے، چند خاندان ہیں جو یونیورسٹی پر چھائے ہوئے اور اس کے دروبست کے مالک ہیں۔

(۳) یونیورسٹی کا مالیاتی انتظام نہایت خراب اور فاسد (CORRUPT) ہے اور اس میں لاکھوں روپیہ کا ایر پھیر ہے۔

ظاہر ہے ایک مرکزی یونیورسٹی کی عزت و شہرت کو خاک میں ملانے کے لئے ان تین باتوں سے زیادہ کوئی اور بات مہلک اور خطرناک نہیں ہوسکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اعتراضات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں زیدی صاحب نے رجسٹروں، فائلوں، حسابات کے رجسٹروں، دستاویزات اور حقائق و واقعات کی روشنی میں یونیورسٹی کی طرف سے جو جوابات فراہم کئے اور ان کے لئے جو مواد پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی، چستی اور لیاقت و قابلیت کا شاہکار ہے، کوئی امر خواہ کیسا ہی بے غل و غش ہو، لیکن اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بڑے سے بڑا نکتہ چین بھی قائل ہو جائے اس کے لئے بھی تو حسن سلیقہ اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیت درکار ہے۔

لیبیا میں سرقہ وحرابہ کے حدود

از مولانا حبیب ریحان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ ۔ البیضاء (لیبیا)

لیبیا شریعت کے احیا کے لئے ایک زرخیز سرزمین

لیبیا ایک ایسا عربی اسلامی ملک ہے جہاں اسلامی اقدار کا تحفظ بحمد اللہ بڑی حد تک محفوظ ہے، اور لوگوں میں اسلام سے محبت پائی جاتی ہے، اور مسموم نظریات اور آراء گو سامراجی سازشوں سے عالم اسلامی کے تمام نوجوانوں اور تعلیم یافتہ حضرات میں کسی نہ کسی شکل اور مقدار میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں ان کی مقدار بہت کم ہے، اور اسلامی شریعت کے تجربہ کے لئے یہ بڑی زرخیز زمین ثابت ہوسکتی ہے، یہاں کے معاشرہ میں فطری خوبیاں بہت ہیں، روزوں کا اہتمام یہاں کا خاص شعار ہے، لوگوں میں سادگی ہے، چوری کی وارداتیں بہت کم ہیں، قتل وغارت، فساد اور ہنگامے شاذ ونادر ہی واقع ہوتے ہیں، الغرض دلوں میں اسلامی وقار قائم ہے اور شریعت اسلامیہ کو ملک کا قانون بنانے کی مانگ یہاں کے صالح عوام کی فطری و دینی مانگ بھی تھی، جسے لیبیا کی انقلابی حکومت نے پورا کیا، اور پہلے دن سے شریعت اسلامیہ کے مطابق قانون بنانے کی جو خوشخبری دی تھی اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کردیں اور شریعت اسلامیہ کو تمام قوانین لیبیہ کا اصلی ماخذ بنانے کی تاریخی قرارداد نکالی، شراب بندی کا قانون نکالا، زکوٰۃ کے اجراء کا قانون نافذ کیا، صندوق الجہاد کھولا، جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کھولی، شریعت اسلامیہ کی کانفرنس بلائی، علمائے شریعت وقانون نے سرعت کے ساتھ مکمل شرعی قوانین بنانے میں

مصروف ہیں، اور اگر مکمل اسلامی قانون بلاکسی رکاوٹ اور تعویق کے انشاء اللہ نافذ ہوگیا تو یہ لیبیا کے لئے افتخار و اعزاز کی بات ہوگی خدائے پاک پر یا اسلام پر کوئی احسان نہیں ہوگا، کیونکہ یہ تو بہت بڑے شرف اور شکر کا مقام ہے کہ کسی فرد یا ملک کی قسمت میں یہ سعادت آئے کہ وہ اسلامی شریعت کا احیاء کرے اور اپنے فطری عمل کو شروع کرے۔

لیبین قیادت کا کارنامہ ۴ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۱ راکتوبر ۱۹۷۲ء کو لیبین انقلابی کونسل نے سرقہ اور حرابہ کی اسلامی حدود کا قانون نکالا ہے جو شریعت اسلامیہ سے ماخوذ ہے، اس وقت اسلامی قانون کی تطبیق کی جو کوششیں لیبیا میں ہو رہی ہیں ان میں سب سے زیادہ مومنانہ اور جرأت مندانہ اقدام کہا جاسکتا ہے، اس پر عالم اسلامی لیبیا کو مبارکباد دینے میں جس قدر بھی فیاضی اور مبالغہ سے کام لے صحیح ہے۔

سرقہ اور حرابہ دو اسلامی حدیں ہیں، سرقہ چوری کو کہتے ہیں، اور حرابہ سینہ زوری کو، یعنی حرابہ کے اندر ڈکیتی، قافلہ لوٹنا، راستہ روکنا اور قتل و غارت سب آجاتا ہے، فقہی اصطلاح میں حرابہ کو قطع طریق اور سرقہ کبری بھی کہتے ہیں، ان دونوں حدود کی تعریف، شرعی کیفیت اور تفصیل انشاء اللہ راقم بعد کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے گا، راقم ایک تفصیلی مضمون لکھ رہا ہے جس کا عنوان ہے "سرقہ اور حرابہ کی حد اسلامی شریعت کی روشنی میں" جس میں حدود الٰہیہ کی حکمت، حدود کا مفہوم، تعریفات، پھر سرقہ اور حرابہ کی مکمل تفصیل قرآن و سنت، مذاہب فقہ اور علمائے امت کے اقوال کی روشنی میں کرے گا۔

یہ کام تفصیل طلب ہے اور اس کے لئے کچھ وقت بھی ابھی درکار ہے، اس لئے وقت کی ضرورت اور تقاضہ کے پیش نظر تاخیر کے بغیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لیبیا میں سرقہ اور حرابہ کا جو قانون نکلا ہے اس کا ترجمہ قارئین کے لئے پیش کروں، قانونی الفاظ اور فقہی عبارتوں میں ترجمہ کے لئے انتہائی تفصیل درکار ہوتی ہے، راقم نے علمی امانت کی وجہ سے ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا ہے لیکن جہاں مختصر تشریح کی ضرورت پڑی ہے اسے قوسین (بریکٹ) میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ متقنن کے الفاظ نہیں بلکہ میرے الفاظ ہیں، بعض جگہ حاشیہ میں تفصیل بیان کی گئی ہے، لیکن یہ سب تفصیلات وتشریحات انتہائی مختصر اور لابدی ہیں، یہ قانون علماء ومفکرین قانون کی کوششوں کا نتیجہ ہے، امام مالک کے اقوال کو اصولی طور پر اپنایا گیا ہے کہ شمال افریقہ میں مالکی ہی رہتے ہیں لیکن کلی طور پر فقہ کے مذاہب اربعہ کی پوری مدد لی گئی ہے، معدودے چند احکام دوسرے فقہاء اور علماء سے بھی اخذ کئے گئے ہیں جو مذاہب اربعہ میں سے نہیں ہیں، ان کی مکمل تفصیل اور ان پر مکمل تبصرہ بعد کو کروں گا، یہ تفصیلی مقالہ اس طرح ہوگا۔

۱۔ سب سے پہلے قانون سرقہ وحرابہ کا ترجمہ۔

۲۔ پھر آیندہ مذکرہ توضیحیہ (یعنی حکومت کی نکالی ہوئی قانون سے متعلق توضیحی یادداشت یا رپورٹ) کا ترجمہ، اس یادداشت میں قانون سے متعلق بہت سی تفصیلات وتوضیحات بیان کی گئی ہیں، اور بعض احکام جن میں فقہی مذاہب کے سوا کسی دوسرے عالم کی رائے لی گئی ہے ان کے ماخذ اور تاویلات بتائی گئی ہیں۔

۳۔ توضیحی یادداشت کے بعد جو مسائل توضیح طلب رہ گئے ہیں ان کی توضیح اور فقہی اختلافات وغیرہ کی تفصیل، اس کا عنوان یوں رکھا جاسکے گا "سرقہ وحرابہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں۔"

اب آئیے قانون کا ترجمہ پڑھئے:

قانون سرقہ وحرابہ کا ترجمہ

"عوام کے نام سے، انقلابی کونسل کی طرف سے"[1]

---

(۱) قانون کے شروع میں "عوام کے نام سے" کی عبارت دیکھ کر یہ شبہ نہ ہو کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "اللہ کے نام سے نہیں" جیسا کہ عام طور پر لادینی اور وضعی قوانین کا شعار ہے کہ وہ انسانوں کی سیادت اور تقسیم پر قائم ہوتے ہیں، بلکہ صرف اس امر کا اظہار ہے کہ "عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے" (بقیہ ص۲۴۳ پر)

شریعت اسلامیہ کے احکام کی تابعداری میں، اور جمہوریہ عربیہ لیبیا کے مسلمان عرب عوام کی رغبات وخواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے،

اور اس بات کی تاکید کرنے کے لئے جو جمہوریات عربیہ (لیبیا، مصر اور سوریا) کے دستور کا فیصلہ ہے،

اور انقلابی کونسل کے دستوری اعلان نمبر مجریہ ۲ر شوال ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۹ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور "عوام کی مرضی کے مطابق جو شریعت پر چلنے کے لئے بے چین ہیں" یہ قانون نکالا جاتا ہے، کیونکہ لیبیا عوامی جمہوری حکومت ہے، شخصی بادشاہت نہیں، اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ مقنن نے ایک سطر بعد لکھا ہے کہ "شریعت مطہرہ کے احکام کی تابعداری میں" اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ شریعت اسلامیہ کی تابعداری خدا کی مرضی اور نام کے بغیر ممکن نہیں کہ خدا ہی شریعت کو نازل کرنے والے ہیں، اور لیبیا ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں سارے قوانین کتاب وسنت اور اقدار اسلامی کی روشنی میں بنائے جارہے ہیں، اس لئے ایک فیصد بھی لادینی قوانین کی اتباع کا شبہ اس جملہ میں نہیں ہوسکتا۔ دراصل یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں حاکم یا حکومت جس طرح خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسی طرح مخلوقِ خدا اور عوام کے سامنے بھی اپنے ہر استنباطی اور اجتہادی عمل میں جواب دہ ہے، اس لئے عوام کی طرف سے انتخاب، ان کی نمائندگی، ان کی مرضی اور مشورہ شرعاً واجب ہے اور انھیں کی رعایت سے یہ جملہ لکھا گیا ہے، یعنی کسی فرد واحد، مطلق العنان بادشاہ یا ظالم وجابر حاکم کی اپنی ذاتی خواہش، من مانی اپج اور شخصی تکبر پر اس قانون کی بنیاد نہیں ڈالی جارہی بلکہ شریعت کے احکام کی رو سے اور لیبیا کے مسلم عوام کی خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے ان کے نمائندوں کی طرف سے یہ احکام صادر کیے جارہے ہیں۔ اس لئے مقنن کے ضمیر میں اور قانون کے ہر ہر جملہ میں، شریعت کی اتباع اور حدود جیسے قوانین کے نفاذ میں اللہ کا نام اور عظمت اور قانونِ الٰہی کا احیاء موجود ہے جو اس بات کی مکمل ضمانت ہے کہ لیبی مقنن نے قلب ونظر سے تحت الشعور اور تحت السطور میں بسم اللہ کا اقرار واعتراف ضرور کیا ہے اور اس کا اظہار قانون کی دوسری سطر میں موجود ہے۔

کے موافق،

اور انقلابی کونسل کی اس قرارداد کے ماتحت جو ۹ر رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو صادر ہوئی، جس میں ان کمیٹیوں کی تشکیل کا اعلان تھا جو موجودہ قوانین کی مراجعت کریں اور اسلامی شریعت کے اساسی (بنیادی) اصولوں کے مطابق اس کی تعدیل (ترمیم اور تبدیلی) کریں،

اور عقوبات وجنائی اجرائات (PENAL CODE — CRIMINAL LAW.) کے دونوں قانونوں سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد جو ۱۱ر ربیع الاول ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۸ر نومبر ۱۹۵۲ء میں صادر ہوئے،

اور اس اعلیٰ کمیٹی کے اعمال نہائیہ (آخری کاموں اور رپورٹوں) کی روشنی میں جو قوانین کے مراجعہ کے لئے انقلابی کونسل کی طرف سے ۹ر رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو بنائی گئی تھی،

اور وزیر عدل (انصاف) کے پیش کرنے اور مجلس وزراء کے پاس کرنے کے بعد،

.....یہ قانون صادر کیا جاتا ہے۔

باب اول

حد سرقہ سے متعلق احکام

دفعہ ۱

وہ ضروری شرطیں جن کا پورا ہونا اس سرقہ کے لئے ضروری ہے جس پر حد نافذ ہو گی۔

مادہ نمبر ۳ کے احکام کی مراعات کے ساتھ، یہ شرطیں اس سرقہ کے لئے ضروری ہیں جس پر حد نافذ ہوگی،

۱۔ یہ کہ مجرم عاقل ہو، کامل ۱۸ سال ہجری اس کی عمر ہو، مختار ہو، محتاج یا مضطر[1] نہ ہو

---

(۱) مضطر و محتاج فقہی لفظ ہیں جو ضرورت و حاجت کے فرق کو واضح کرتے ہیں، اضطرار اس مجبوری اور بھوک کی حالت کو کہتے ہیں جس میں سور اور حرام اشیاء تک کھانی جائز ہو جاتی ہیں۔ الیسی (باقی اگلے صفحہ پر)

۲۔ مجرم مال حاصل کرے چھپ کر، اپنی ملکیت بنانے کے قصد سے۔
۳۔ یہ کہ مسروقہ مال منقول ہو، متقول[1] ہو (مالیت رکھتا ہو)، محترم[2] ہو، کسی دوسرے کی ملک ہو، حرز[3] (محفوظ جگہ یا حفاظت) میں ہو، اس کی قیمت چوری کے وقت دس دینار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صورت میں حد کا قیام اجماع سے نہیں ہوگا، حاجت ضرورت اور اضطرار سے کم ہے لیکن سخت حاجت کی صورت میں بھی قطع نہ ہوگا کہ حدود شبہات سے ختم ہو جاتی ہیں، اس سلسلے میں متقن نے آسان قول لیا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ اسلام میں کسی بھی محتاج شخص کی حاجت پوری کرنا حکومت پر، پھر اقربا پر، پھر پڑوسیوں پر اور پھر ساری سوسائٹی کے افراد پر واجب ہے، اس موضوع کی مزید تفصیل بعد کو کی جائے گی۔

(۱ و ۲) امام مالک کے مذہب میں مال مسروقہ میں نصاب کے بعد تین بنیادی شرطیں اور ہیں، قرطبی نے لکھا ہے (۶۔ ۱۶۸) "مما یتمول ویتملك ویحل بیعه" حاشیہ العدوی میں ہے (۲۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶) "مما ینتفع به محترما" متقول سے مراد یہ ہے کہ مالیت رکھتا ہو بعض چیزیں شرعاً مالیت نہیں رکھتیں، اور بعض کی مالیت کے بارے میں اختلاف ہے، جیسے سور، شراب، اس کے برتن، گانے بجانے کے آلے وغیرہ۔ بعض چیزیں مالیت رکھتی ہیں لیکن نفع نہیں پہنچا سکتیں جیسے وہ گدھا جو عالم نزع میں ہو، یا وہ حقیر وتافہ چیزیں جو دارالاسلام میں سب کے لئے حلال ہوں، یتملک سے مراد یہ ہے کہ اس کو اپنی ملکیت بنانا مسلمان کے لئے جائز ہو، محترم کے معنی ہیں کہ مسلمان کے لئے اس کا فروخت کرنا جائز ہو۔ بعض چیزیں وہ ہیں کہ مالیت بھی رکھتی ہیں، ملکیت بھی جائز ہے، حلال ہیں لیکن فروخت کرنا جائز نہیں جیسے قربانی کا گوشت، اس سلسلے کے جزوی فقہی مسائل تفصیلی مضمون میں بیان کروں گا۔

(۳) حرز کے معنی ہیں محفوظ ہونا یا محفوظ جگہ میں ہونا، کیونکہ حرز کی دو قسمیں ہیں ۱۔ حرز بالمکان یا حرز بنفسہ ۲۔ حرز بالحافظ، ان کی تعریفات، اور ائمہ فقہ کے نزدیک حدیں اور باریکیاں فقہی طور پر، بہت ہیں جو سرقہ وحرابہ سے متعلق تفصیلی مضمون ہی میں پیش کی جائیں گی۔

لیبی سے کم نہ ہو[۴۳]

دفعہ ۲

سرقہ کی حد

اگر وہ ساری شرطیں جو دفعہ نمبر ۱ میں بیان ہوئی ہیں پوری ہوں تو سارق پر حد نافذ ہوگی اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔

دفعہ ۳

وہ صورتیں جن میں حد سرقہ نافذ نہ ہوگی۔

حد سرقہ کی تطبیق ان صورتوں میں نہ ہوگی جن میں مجرم کے لیے کوئی شبہ موجود ہو، جیسے حسب ذیل اشیاء:

۱۔ اگر چوری عام جگہوں (دفتروں، کارخانوں، دکانوں وغیرہ) میں سے کام کے دوران ہوئی ہے، یا کسی بھی ایسی جگہ سے جہاں مجرم کو داخل ہونے کی اجازت ہے اور مال مسروقہ محرز محفوظ جگہ یا حفاظت میں نہیں ہے۔

۲۔ اگر چوری اصول (باپ دادا) یا فروع (بیٹا پوتا) کے درمیان یا میاں بیوی یا محارم کے درمیان ہوئی ہے[۴۴] قریبی رشتہ دار جیسے چچا، خالہ وغیرہ، یہ بھی امام ابوحنیفہ رح کا قول ہے۔

۳۔ اگر مسروقہ مال کا مالک مجہول (غیر معلوم) ہے

۴۔ اگر مسروقہ مال کا مالک مجرم کا مقروض ہو، اور ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو یا انکار کرتا ہو اور ادائیگی قرض کا وقت نکل چکا ہو، سرقہ سے قبل، اور مجرم نے جس مال پر قبضہ

---

[۴۳] یہ ابراہیم نخعی رح کا قول ہے، توضیحی یادداشت میں اس کا ماخذ، وضاحت اور تاویل پیش کی گئی ہے، اور مزید اس کی تشریح و توضیح راقم تبصرہ والے مضمون میں پیش کرے گا، کیونکہ یہ ائمہ اربعہ کے قول سے معارض ہے اور نصاب سرقہ سے متعلق دوسرے ائمہ فقہ و علمائے امت کے اقوال بھی تفصیل کے ساتھ پیش کرے گا۔

کیا ہو وہ اس کے حق کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو لیکن یہ زائد مال اس کے گمان میں نصاب تک نہ پہنچتا ہو[1]۔

۵۔ اگر مسروقہ چیز درخت پر موجود پھل ہوں یا اس کے مشابہ زرعی چیزیں جو کٹی ہوئی نہ ہوں، اور ان میں سے مجرم نے کھالیا ہو، لیکن ساتھ لے کر نہ گیا ہو۔

۶۔ اگر مجرم سرقہ کے جرم میں شریک ہو دوسروں سے اتفاق، ابھارنے اور مساعدت کی حد تک، جب تک کہ اس کی مساعدت اور مدد اس حد تک نہ پہنچے کہ وہ براہ راست مجرم کے دائرہ میں آجائے۔

۷۔ اگر مجرم مال مسروقہ کا مالک بن جائے سرقہ کے بعد[2]، اور دعوے میں آخری فیصلہ صادر ہونے سے قبل۔

۸۔ اگر مجرم کئی ہوں کسی ایسے سرقہ میں جو ان سب کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہو، اور ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں (مال مسروقہ میں سے) نصاب سے کم رقم آئی ہو۔

۹۔ اگر کسی ایسی جگہ سے سرقہ ہوا جہاں سارق کی ملکیت کا شبہ ہوتا ہے، جیسے کسی مشترکہ کمپنی سے یا کسی وقف میں سے اپنے مستحق حق کا، یا جیسے بیت المال یا مالِ غنیمت میں سے[3]۔

---

(۱) راقم قانون کی اہم اور مخصوص دفعات پر حاشیہ لگا رہا ہے، ورنہ ہر موضوع پر فقہی اقوال موجود ہیں، اس مسئلہ اور اس جیسے تمام جزوی اختلافات والے مسائل کو ترتیب وار تبصرہ والے آخری مضمون میں بیان کیا جائے گا

(۲) کسی بھی طریقہ سے مال مسروقہ اس کی ملکیت بن جائے جیسے یہ مال اس کو ہدیہ کردیا جائے یا ہبہ کردیا جائے یا فروخت کردیا جائے یہ قول صرف امام ابوحنیفہ کا ہے، اور اکثر اقوال کی طرح یہی مقنن نے یہ قول بھی امام صاحب کے قول سے اخذ کیا ہے۔

(۳) یہ قول بھی حنفی فقہ سے اخذ کیا گیا ہے، مالکی مذہب میں بیت المال کی چوری پر (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ تمام احوال جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، (یعنی) قانون عقوبات یا کسی قانونی چارہ جوئی کو معطل نہیں کرسکتے اور نہ خلل ڈال سکتے یعنی قطع نہ ہونے کی صورت میں موجودہ کریمنل لا کے مطابق تعزیری سزائیں باقی رہیں گی، شبہ کی صورت میں بالکل معافی نہیں ہو جائے گی، اور قانون عقوبات نافذ رہے گا۔

باب دوم
حد حرابہ سے متعلق احکام

دفعہ ۴

حرابہ کا جرم اور وہ واجب شرطیں جن کی موجودگی میں حد نافذ ہوگی۔

۱۔ حرابہ کا جرم حسب ذیل دو صورتوں میں پیدا ہوگا:

(الف) کسی دوسرے کے مال پر مغالبتہ (زبردستی، غلبہ اور قوت کے ساتھ) قبضہ کرنا[1]

(ب) عام لوگوں پر قطع طریق کرنا (قافلہ لوٹنا) اور لوگوں کو چلنے سے روکنا ڈرانے اور دھمکانے کے قصد سے۔

۲۔ ان دونوں صورتوں میں یہ شرط ہے کہ ہتیار استعمال کئے گئے ہوں یا کوئی ایسی چیز جو جسمانی اذیت اور ڈرانے دھمکانے کے قابل ہو۔

۳۔ اگر حرابہ آبادی میں ہو تو غوث (مدد) پہنچ سکنے کا امکان بھی ایک شرط ہوگی۔

۴۔ یہ ضروری ہے کہ مجرم عاقل ہو، اٹھارہ سال ہجری پورے کر لیے ہوں، مختار ہو مضطر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالاتفاق قطع ہوگا، مال غنیمت میں سے ابن قاسم کے قول کے مطابق ہر صہ ہوگا، عبدالملک کے نزدیک اپنے حق سے تین درہم زیادہ لینے کی صورت میں، لیکن اگر ہی نہیں ہے تو پھر مالکی مذہب میں بالاتفاق قطع ہوگا۔

(۱) حرابہ کی فقہی تعریفات اور تفصیلات مفصل مضمون میں پیش کی جائے گی

نہ ہو۔

دفعہ ۵

حد حرابہ

محارب پر حد حسب ذیل طریقے سے نافذ ہوگی۔

(الف) قتل کیا جائے گا اگر اس نے قتل کیا، مال پر قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

(ب) دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا اگر صرف مال پر قبضہ کیا ہے اور قتل نہیں کیا ہے۔

(ج) جیل دی جائے گی اگر اس نے راستے میں ڈرایا اور دھمکایا ہے۔[1]

دفعہ ۶

(۱) حد حرابہ توبہ سے ساقط ہو جائے گی، اگر مجرم اس پر قبضہ حاصل ہونے (پکڑے جانے) سے پہلے توبہ کر لے، اور یہ ان دونوں حسب ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

(الف) اگر مجرم اپنا جرم مسئولین (حکومت اور پولیس وغیرہ) کے علم میں آنے سے قبل ہی چھوڑ دے اور اپنے اس فعل کی اطلاع توبہ کے اعلان کے ساتھ کسی طرح بھی نیابۃ عامہ (PUBLIC PROSCUTOR) تک پہنچا دے۔

---

(۱) آیت حرابہ میں لفظ "او" کی تفسیر و تشریح میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا اس میں امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ بیان کردہ سزاؤں میں جو چاہے دے یا اس لفظ میں جرم کی تنویع مقصود ہے، یعنی جرم کی مختلف صورتیں ہیں اور ان میں مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں اور یہی احناف کا قول ہے، مقنن نے تینوں شکلیں تحدید کے ساتھ اسی طرح لی ہیں، اور "نفی" بھی احناف کے قول سے اخذ کی گئی ہے جس کے معنی شہر بدر یا جلا وطن کرنے کے لغوی معنی کے بجائے مجازی اور اصطلاح شرع میں حبس اور قید کے معنی لیے گئے ہیں، چوتھی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ چوری بھی کی اور قتل بھی کیا مقنن نے اسے (الف) میں بیان کیا ہے، اس کی اور اس موضوع کی تفصیل بعد کو بیان کی جائے گی۔

(ب) اگر وہ خود اختیاری طور پر اطاعت کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس یا نیابہ عامہ کے حوالے کردے، اس پر قابو پائے جانے (گرفتاری) سے پہلے۔

(۲) توبہ کے ذریعہ حد حرابہ ساقط ہو جانے سے جن پر زیادتیاں ہوئی ہیں ان کے حقوق معاف نہیں ہو سکتے، جیسے قصاص، دیت وغیرہ، اسی طرح وہ سزائیں اور تعزیرات بھی جو قانون عقوبات (لیبیہ) میں موجود ہیں ان جرائم سے متعلق جن کی سزا موجود ہے۔

دفعہ ۷

توبہ جو حد حرابہ کو ساقط کرے گی اس کی تحقیق کے طریقے

۱۔ اگر مجرم نے دفعہ بالا کی رو سے اپنی توبہ کا اعلان کیا تو نیابۃ عامہ اس واقعہ کی تحقیق کرے گی، اور ان شرطوں کی چھان بین بھی جو ساقط کرتی ہیں۔

۲۔ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ مجرم ایسے جرموں کا مرتکب ہے جن پر قانونی طور سے وہ سزا کا مستحق ہے، یا اس پر ایسے حقوق واجب ہوتے ہیں جو جن پر زیادتی ہوئی ان کا حق ہیں جیسے قصاص، دیت یا مال کا ضمان، یا ان میں سے کسی چیز کے بارے میں شک پیدا ہوا تو نیابہ عامہ ان اوراق کو ان معاملت سے متعلق عدالت میں پیش کرے گی تاکہ ان پر فیصلہ صادر ہو۔

۳۔ لیکن اگر تحقیق کے بعد ان مذکورہ بالا چیزوں میں سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی تو پھر نیابہ عامہ یہ فیصلہ کرے گی کہ وہ مجرم جس نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی ہے اس کے خلاف دعویٰ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

باب سوم

مشترک احکام (یعنی سرقہ اور حرابہ سے متعلق مشترک احکام جو اس قانون میں بیان ہو رہے ہیں)

دفعہ ۸

اس مجرم کی سزا جس کی عمر اٹھارہ سال سے

کم ہو۔[1]

وہ استثنار جو دفعہ نمبر ا و ۴ میں وارد ہے جس کی رو سے مجرم پر دونوں جرموں میں اگر اٹھارہ سال ہجری سے کم عمر ہے تو اس پر حد نافذ نہیں ہوگی اور اس کی تعزیر حسب ذیل طریقہ سے ہوگی

---

(۱) سرقہ اور حرابہ دونوں حدود میں مقنن نے حد نافذ ہونے کی عمر کامل اٹھارہ سال ہجری رکھی ہے، ان دونوں موقعوں پر راقم نے حاشیہ نہیں لگایا تھا کیونکہ اس جگہ یہ مناسب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تکالیف شرعیہ کا مکلف بالغ ہونے کے بعد ہوتا ہے، یعنی اوامر الٰہیہ کی اتباع پر ثواب، نواہی کے ارتکاب پر گناہ، اسی طرح حدود و قصاص وغیرہ جیسی قانونی چارہ جوئیاں بھی اسی وقت ہوتی ہیں لیکن بلوغ سے قبل بھی تعزیر و تادیب کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس طرح بچپن ہی سے شعور اور لاشعور دونوں میں اوامر الٰہیہ کی اتباع کا جذبہ اور شریعت مطہرہ پر عمل پیرا ہونے کی عادت پیدا ہو جائے، نماز جوان ہونے کے بعد فرض ہے لیکن سات برس کی عمر میں اس کا حکم دینا اور دس سال کی عمر میں تنبیہ و تادیب کرنا اسی لئے ضروری ہے کہ نماز اس کی عادت ثانیہ بن جائے، اسی طرح بلوغ سے پہلے کیے گئے جرم جیسے چوری، ڈاکہ اور قتل وغیرہ پر حدود و قصاص تو نافذ نہیں ہوگا کیونکہ شرعی وعقلی طور پر مجرم ابھی مکلف نہیں ہوا ہے لیکن اس کی تادیب و تنبیہ و تعزیر از حد ضروری ہے کیونکہ مکلف ہو جانے کے بعد خدانخواستہ یہ جرائم اس کی فطرت و عادت ثانیہ نہ بن جائیں۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ تکالیف شرعیہ بالغ ہونے کے بعد شروع ہوتی ہیں اور بلوغ کی اصلی علامت مرد کے لئے انزال و احتلام اور عورت کے لئے حیض ہے، لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ایک طرف تو ان کا علم دوسروں کو ممکن نہیں، مجرم اس سے انکار کر سکتا ہے، دوسری بات یہ کہ جس کے بلوغ کا علم نہ ہو یا مقررہ متعدد فقہی علامتوں میں سے کوئی اس میں نہ پائی جائے تو کیا وہ کسی عمر میں بھی تکالیف شرعیہ کا مکلف نہ ہوگا؟ اس سلسلے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۔ اگر اس نے سات سال پورے کر لئے ہیں لیکن پندرہ سال مکمل نہیں ہوئے ہیں تو تعزیر، توجیہ، نصیحت اور سخت کلامی کے ذریعہ کی جائے گی، اور اگر وہ دس سال سے زیادہ ہے تو اس کی تعزیر ضرب سے بھی کی جا سکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہاں اختصار کے ساتھ اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی صورت میں امام ابو یوسف ومحمد، امام شافعی واحمد وغیرہ نے مرد وعورت دونوں کے لئے مکمل پندرہ سال کی عمر رکھی ہے، ایک روایت میں امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول نقل ہوا ہے، مفسر قرطبی مالکی نے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سترہ سال کی عمر ہے، اس سلسلے میں جو حنفی مراجع راقم نے دیکھے ان میں مجھے یہ قول نہیں ملا لیکن میں نے استقصار نہیں کیا ہے اس لئے نفی کی پوزیشن میں نہیں ہوں، ہاں امام اعظم کا قول ایسی لڑکی کے سلسلے میں جس کے بلوغ کی دوسری علامتیں ظاہر نہ ہوئی ہوں سترہ سال ہے، لیکن لڑکے کے سلسلے میں یہ قول راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ قرطبی نے امام مالک کا سترہ سال والا قول اور یہ قول کہ جب اس کی آواز بھاری ہو جائے نقل کیا ہے اور اٹھارہ سال والے قول کی طرف اشارہ نہیں کیا، لیکن امام ابوحنیفہ کے دو قول اور نقل کیے ہیں، انیس سال اور اسے مشہور بتایا ہے، دوسرا اٹھارہ سال، فقہ حنفی کے عظیم مرجع شمس الائمہ ابوبکر السرخسی نے بھی لڑکے کے سلسلے میں دو قول نقل کیے ہیں اور انیس سال والی روایت کو اصح لکھا ہے، لیکن فقہ حنفی کے دوسرے مراجع اور ابحاث کی رو سے امام صاحب کا مشہور قول اٹھارہ سال ہی ہے، اس کی تاویل بعض حضرات نے یہ کی کہ انیسواں سال شروع ہو جائے لیکن فی الحقیقت یہ تاویل صحیح نہیں، بلکہ یہ دو مختلف روایتیں امام صاحب سے منقول ہیں، کیونکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ بھی موجود ہے کہ تا آنکہ انیس سال پورے ہو جائیں۔ قرطبی نے امام مالک کا اٹھارہ سال والا قول نقل نہیں کیا لیکن فقہ مالکی میں بھی یہی قول مشہور و معتبر ہے۔ بلغۃ السالک لاقرب المسالک الی مذاہب الامام مالک میں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ اگر اس نے پندرہ سال پورے کر لیے ہیں تو سرقہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب (مار پیٹ) کے ذریعہ ہوگی اور حرابہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب سے بھی ہو سکتی ہے، اور قانونی اصلاحیہ (تربیت و اصلاح کے لئے بنائی گئی سرکاری تربیت گاہ یا جیل) میں رکھ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

۳۔ جو دو صورتیں مذکورہ بالا دو بندوں میں پیش کی گئی ہیں۔ ان سے متعلق اگر (اٹھارہ سال سے کم عمر والے مجرم سے) جرم دوبارہ صادر ہو تو مجرم پر ایسی ضرب کا حکم لگایا جائے گا جو اس کی عمر کے مناسب ہو، اور اگر وہ دس سال سے اوپر ہے تو اس کو اصلاحی جیل میں رکھے جانے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

۴۔ اور دونوں مخصوص حدیں (سرقہ و حرابہ) تکرار کی صورت میں اس قانون میں ایک ہی حکم رکھتی ہیں۔

۵۔ اس دفعہ میں جو تعزیرات (سزائیں) بیان کی گئی ہیں وہ محض تادیبی کارروائیاں ہیں۔

دفعہ ۹

سرقہ اور حرابہ کے جرم کی نوعیت

سرقہ اور حرابہ کے دونوں جرم جن پر حد نافذ ہوگی وہ اس قانون کے احکام کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلوغ کی پانچ علامتیں باب الحجر کے آخر میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے "عمر کا اٹھارہ سال ہونا"۔ مزید اس موضوع کی تفصیل، اقوال اور دلائل انشاء اللہ تفصیلی مضمون میں بیان ہوں گے۔ لیبی مقنن نے امام مالک و امام ابوحنیفہ کے مشہور قول کے مطابق اور احتیاط کی خاطر اٹھارہ سال مقرر کیے ہیں، اور تکلیف قانونی کی عمر اکثر قوانین جدیدہ میں بھی یہی رکھی جاتی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی شریعت قمری سال سے حساب لگاتی ہے اور وضعی قوانین شمسی سال سے۔

مطابق ثابت ہوں گے۔

دفعہ ۱۰

ثبوت

۱۔ اس قانون کی دفعہ نمبر ۱ و ۳ میں بیان کئے ہوئے دونوں جرم عدالت کے سامنے ایک دفعہ اعتراف سے ثابت ہو جائیں گے یا دو شخصوں[1] کی گواہی سے، لیکن مجنیٰ علیہ (جس پر زیادتی کی گئی) کا شمار گواہوں میں نہیں کیا جائے گا، حرابہ میں وہ گواہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے کے حق میں گواہ ہو۔

۲۔ مجرم اپنے اعتراف سے انکار کر سکتا ہے، آخری فیصلے کے صادر ہونے سے قبل، اس صورت میں حد ساقط ہو جائے گی اگر اس کا ثبوت صرف مجرم کے اقرار سے ہوا ہے[2]۔

---

(۱) دو شخصوں سے مراد دو مرد ہیں، کیونکہ ائمہ اربعہ کے اتفاق سے عورت کی گواہی حدود میں مقبول نہیں ہے، لیبی مقنن نے اس کی طرف اشارہ توضیحی یادداشت میں کیا ہے، اور اس کی فقہی و عقلی حکمت اور گواہوں کی شروط تفصیلی مقالے میں بیان کروں گا۔

(۲) کیونکہ اقرار و اعتراف کی صورت میں کوئی گواہی سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور مجرم کے انکار کے بعد جرم کے اثبات کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے، فقہ کا یہ واضح مسئلہ ہے کہ انکار اور اعتراف سے رجوع حدود کے بارے میں صحیح اور مقبول ہوگا مال کے بارے میں نہیں، یعنی مال کا ضمان دینا پڑے گا، لیکن حد کیونکہ چھوٹے سے شبہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہے اس لیے ایسے بڑے شبہ سے یعنی جرم کے ثبوت ہی نہ نکلنے کی صورت میں کیسے ساقط نہ ہوگی؟ یا کس طرح شبہ کی موجودگی میں نافذ ہو سکتی ہے؟ کیا اس کے بعد بھی کوئی ..... یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے مجرم پر ظلم و تشدد کیا ہے اور اسے قانونی سہولتیں پوری مہیا نہیں کی ہیں کیونکہ اعترافِ ظلم و ستم کے ذریعے یا جھوٹ بھی پولیس کی طرف سے گھڑا جا سکتا ہے۔

اور حد کے ساقط ہونے سے وہ تعزیرات ساقط نہ ہوں گی جو اس دفعہ کے بند نمبر ۲ میں آ گے آرہی ہیں۔

۳۔ اور ان قانونی تعزیرات (سزاؤں) کی تطبیق ہوگی جو عقوبات کے قانون میں منصوص ہیں[1]، ایسے شخص کے لئے جس کے بارے میں اس دفعہ میں بیان کی گئی شرعی دلیل ثابت نہ ہو، یا اس مجرم کے حق میں جس نے اپنے اعتراف سے انکار کیا ہو، اور یہ اس صورت میں جبکہ جج جرم کے ثبوت پر کسی بھی دوسری دلیل یا قرینے سے قانع ہو۔

دفعہ ۱۱

ابتدا (جرم کی ابتدا اور اس کو شروع کرنے کی سزا، یعنی جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں)

۱۔ (لیبی) قانون عقوبات کے احکام اس جرم کے شروع کرنے کے بارے میں ساری المفعول ہوں گے جن میں حد نافذ ہوگی[2]۔

۲۔ ابتدا کرنے کی سزا دونوں جرموں میں اس قانون کے مطابق طے کی جائے گی جو قانون عقوبات (لیبیہ) کی دفعہ نمبر ۶۰ و ۶۱ میں وارد ہے اور یہ اس طرح کہ اس جرم پر جو سزا

---

(۱) لیبی مقنن نے جج کو یہ آزادی دی ہے کہ اس پر جرم کی حقیقت مجرم کے اعتراف کے بعد کیے گئے انکار کے بعد اگر کسی طرح بھی واضح ہوجائے تو وہ اس کو دوسری سزائیں قانونی طور پر دے سکتا ہے، یہ اسی قاعدہ کے ماتحت کہ حدود تو ساقط ہوجائیں گی لیکن ضمان مالی یا دوسری تعزیرات ثبوت کے کسی قرینے کی رو سے بھی باقی رہ سکتی ہیں، قانون عقوبات لیبیہ میں ایسی صورتوں میں بیان کی ہوئی جن سزاؤں کی طرف مقنن نے اشارہ کیا ہے، راقم تفصیلی مضمون میں ان کو قانونِ عقوبات سے نقل کرے گا۔

(۲) راقم قانون عقوبات لیبیہ کی دفعہ ۶۰ و ۶۱ کا ترجمہ بھی انشاء اللہ تفصیلی تبصرہ میں کرے گا۔

قانون مشار الیہ میں مقرر ہے وہی نافذ ہوگی۔[1]

دفعہ ۱۲

جرائم اور سزائیں متعدد ہونے کی صورت میں

۱۔ اگر مجرم کے جرم ایک دوسرے سے مربوط ہوں یا کئی ہوں ایسے جن پر حد نافذ ہوتی ہو تو اس طرح سزا دی جائے گی۔

(الف) اگر سزائیں ایک ہی جنس کی ہیں اور مقدار میں بھی برابر ہیں تو ایک ہی سزا دی جائے گی۔

(ب) اگر سزائیں تو متحد الجنس ہیں لیکن مقدار میں تفاوت ہے تو ان میں سے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

(ج) اگر سزائیں مختلف الجنس ہیں تو سب کی سب دی جائیں گی۔

۲۔ اگر مجرم کی طرف منسوب جرموں میں بعض ایسے دوسرے جرائم بھی ہیں جن کی سزا قانون عقوبات (لیبیہ) میں یا کسی اور قانون کے ماتحت موجود ہے تو حدود سابقہ بند کے ماتحت نافذ ہوں گی، لیکن دوسرے جرائم پر دی گئی سزائیں بھی معاف نہیں ہوں گی۔

۳۔ قتل کی سزا (موت کی سزا) چاہے وہ حد کی وجہ سے ہو یا قصاص کی صورت میں یا تعزیر کی شکل میں ساری دوسری سزاؤں کو ختم کر دے گی۔[2]

---

(۱) یعنی حد اس وقت نافذ ہوگی جب اس کے نفاذ کی تمام شرطیں پوری ہوں لیکن شروع کرنے اور جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں شرعاً حد نافذ نہ ہوگی، کیوں؟ اس کی فقہی تفصیل تفصیلی مضمون میں "حرز" سے متعلق بحث میں کروں گا۔ ایسی صورت میں مجرم کو بالکل معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ قانون عقوبات لیبیہ کے ماتحت سزا دی جائے گی۔

(۲) سزا کی ان بیان کردہ قانونی شکلوں میں سے بعض اکثر فقہاء میں متفق ہیں اور بعض میں معمولی اختلاف ہے جن کی تفصیل اس مختصر مقالہ میں چنداں ضروری نہیں، تفصیلی مضمون ہی اس کا متحمل ہو سکے گا۔

دفعہ ۱۳

دوبارہ جرم کی صورت میں

۱۔ اگر مجرم نے ایسا جرم دوبارہ کیا جس پر اسے ایک بار حد ہو چکی ہے، سرقہ یا حرابہ کی شکل میں تو قتل کے جرم کے سوا، اس کو سزا جیل کی دی جائے گی[1]، اور عقوبت کی مدت ختم ہونے سے پہلے اسے رہا بھی کیا جا سکتا ہے اگر اس کی توبہ ظاہر ہو، آگے آنے والی دفعہ (نمبر ۱۴) کے احکام کی روشنی میں۔

۲۔ پھر اگر (تیسری بار) جرم کا اعادہ ہو تو اس کی سزا مؤبد (تاحیات)

---

(۱) حرابہ کے سلسلے میں تکرارِ جرم کی صورت میں تو فقہائے کرام کے نزدیک دوبارہ قطع نہ کیے جانے پر اتفاق ہے، لیکن دوبارہ چوری کرنے کی صورت میں مذاہبِ اربعہ میں دوبارہ بھی قطع ہے، لیبی مقنن نے مالکی عالم و فقیہ ابن عربی کے بیان کردہ اور تفسیر قرطبی میں بھی ابن عربی ہی کے حوالہ سے منقول، تابعی حضرت عطار کا قول یہ نقل کیا ہے اور اسی کو آسانی کی خاطر قبول کیا ہے، مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ آسان قول مذاہب اربعہ میں احناف و حنابلہ کا ہے، یعنی دوسری بار بایاں پیر کاٹا جائے گا لیکن تیسری بار قطع نہ ہوگا، اس کی شرعی دلیل مضمون میں دی جائے گی، استنباط و قیاس کے طور پر حرابہ میں ایک پیر اور ایک ہاتھ کٹنے کے بعد پھر قطع نہ ہونا بھی ایک نظیر یا عقلی دلیل کا کام دے سکتا ہے، دوسرے مذاہب میں تیسری بار چور کا بایاں ہاتھ اور چوتھی بار دایاں پیر کاٹا جائے گا، اور بھی اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں، اس مسئلہ کی مکمل تفصیل اور ائمہ فقہ کے دلائل کتاب و سنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں تبصرہ میں پیش کروں گا، کیونکہ یہ مسئلہ بھی مسئلہ نصاب کی طرح مذاہب اربعہ سے اخذ نہیں کیا گیا ہے۔

جیل ہوگی۔(۱)

(باقی)

---

(۱) احناف کے نزدیک جب تیسری دفعہ قطع نہیں ہے توسجن موبّد ہے، لیکن اس کے ساتھ بھی توبہ کی شرط موجود ہے، شرح فتح القدیر میں ہے: "فان سرق ثالثا لا یقطع بل یعزر و یخلد فی السجن حتی یتوب او یموت" (۴-۲۴۸) یعنی مقنن نے توبہ کی یہ شرائط فقہ حنفی کی رو سے دوسری بار کے جرم میں لی ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اور تیسری بار کی صورت میں سجن موبّد کی شکل اختیار کی ہے، اور توبہ یعنی دنیاوی معافی اور جیل سے رہائی کی شرط ساقط کر دی ہے تاکہ چور کے لئے دوسری بار چوری کرنے میں عدم قطع کی جو آسانی فراہم کی گئی تھی اس کا وہ ناجائز فائدہ نہ اٹھائے خدا کے دربار میں معافی توہر وقت ممکن ہے، مقنن نے اس طرح مزید چوری کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔

خلافت

از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب

زیرِ نظر مقالے میں مسئلہ خلافت پر جدید انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ نگار مشہور سائنٹسٹ ہیں اور تاریخی حالات اور واقعات کو سائنسی تجربے پر ہی پرکھتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے مسئلہ کا جس ڈھنگ سے تجزیہ کیا ہے اُس کی تفصیلات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ تاہم مضمون مختصر ہونے کے باوجود جامع بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ توقع ہے قارئینِ برہان مضمون کی اصل روح کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

(ع)

خلیفہ کے لغوی معنی پیچھے رہ جانے والا جانشین، وارث اور اولاد کے ہیں۔ اصطلاحی معنی جانشین اور نائب کے لئے جاتے ہیں۔ خدا نے جب فرشتوں سے فرمایا:
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (میں زمین پر خلیفہ بنانیوالا ہوں) تو فرشتوں نے یقینی طور سے دونوں معنی سمجھے کیونکہ اُن سے پہلے جو خلیفہ تھے۔ انھوں نے زمین پر اپنی پوری ذمہ داری ادا نہیں کی تھی اور ناحق خون بہایا تھا۔ فرشتوں نے اس نئے خلیفہ کے بارے میں بھی یہی سمجھا۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ خلیفہ زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ (فلمّا انبأهم باسمائهم) تو ان کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس واضح ثبوت کے باوجود زیادہ تر لوگ خلیفہ کے معنی محض نائب کے لیتے ہیں۔ صرف چند لوگ آدم علیہ السلام کو

جن کا جانشین مانتے ہیں جو اسرائیلی علوم کے نفوذ کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں اس کا کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس خلیفہ کے معنی جانشین کے آتے ہیں۔ اس میں ایک زوال پذیر قوم کی جگہ ایک ترقی پسند قوم کو خلافت دیئے جانے کا تذکرہ آتا ہے۔

(۱)۔ ثم جعلناکم خلآئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون
(۱۴ک یونس سورہ ۱۰)

(۲)۔ وجعلناھم خلآئف واغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا (۷۳ک یونس سورہ ۱۰)

(۳)۔ واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح (۶۵ک الاعراف سورہ ۷)

انسانی وجود سے پہلے زمین کی آب وہوا یعنی موسم سرما وگرما وغیرہ میں بہت کم اختلاف تھا۔ اور اس کے نتیجہ میں زندگی کے مسائل بھی پیچیدہ نہیں تھے۔ لہٰذا انسان سے کمتر مخلوق زمین پر خلافت کر سکتی تھی۔ مثال کے طور پر کسی ترقی یافتہ ملک کا ایک کم صلاحیت کا آدمی ایک غیر ترقی یافتہ ملک میں سفیر کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اور وہاں پر اپنے ملک کی نیابت بہت اطمینان سے انجام دے سکتا ہے۔ مگر ایک ترقی یافتہ ملک میں زیادہ صلاحیت کا ہی آدمی سفیر ہو سکتا ہے۔ تاکہ وہاں پر اطمینان سے اپنے ملک کی نیابت کر سکے۔ لیکن ایک ایسا ملک جو ترقی کی راہ پر گامزن ہو وہاں پر کسی سفیر کو زیادہ دنوں تک رکھنا اچھا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ سفارت کے جانشین کو بدلنا پڑیگا۔ تاکہ جس ملک کا سفیر ہے اس کی صحیح نیابت ہو سکے۔ اس سے پہلے (برہان اگست ۱۹۷۱ء) یہ تذکرہ آچکا ہے۔ کہ جب حضرت انسان Homo Sapiens نے تمام دوسری انواع Species کو مات دیدی۔ تو اس وقت بھی ان کا میدان عمل محدود نہ ہوا۔ بلکہ آپس میں ہی سبقت لے جانے کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ ان میں وہ گروہ یا قوم خلافت کی مستحق ہوئی۔ جس نے زمانہ سے بلند ہو کر، علمی،

فوجی اور تہذیبی میدان میں نئی نئی ایجادات کیں۔ انہوں نے ان پر حکومت کی جو اپنے قدیم سنہرے دور پر فخر کرتے رہے اور اس کی ہر چیز سے چمٹے رہے۔

علمی، فوجی اور تہذیبی میدان میں انقلاب برپا کرنے کا ایک فطری تدریجی اصول ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ ہر انقلاب کے برپا ہونے سے پہلے اختیار کیا جاتا رہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب کوئی تہذیب عروج پر ہوتی ہے۔ تو اس کی تمام خرابیاں اجاگر ہوجاتی ہیں۔ اور اس وقت اسکی اصلاح کے لئے ایک نیا فلسفہ یا نظریہ ابھرنا شروع ہوجاتا ہے۔ دھیرے دھیرے نیا فلسفہ اپنا مقام حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور زیادہ لوگ اس کو قبول کرنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے نئے فلسفہ کی مقبولیت بڑھتی ہے حکومتِ وقت اُسے کچلنے کی کوشش کرتی ہے اگر نیا فلسفہ زیادہ جاندار ہوتا ہے اور اسے اس دور کے بہترین طرزِ بیان میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کو زیادہ اچھے کردار کے لوگ قبول کرتے ہیں [illegible] وقت اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اُسے دبا نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جو نئے فلسفہ کے پیرو ہوتے ہیں۔ حکومت کی پوری مشنری نئے فلسفہ کی روشنی میں مرتب ہوتی ہے۔ اور ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔

اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو مذکورہ بالا اصول کی حقانیت واضح ہوجاتی ہے یوروپ میں جب جاگیرداری اور شہنشاہیت پر مبنی تہذیب اپنے عروج پر پہنچی تو اس کی اصلاح کے لئے روسو وغیرہ نے جمہوریت کا فلسفہ پیش کیا۔ یہ کچھ ہی دنوں میں اس قدر طاقت ور ہوگیا کہ اس نے سب سے پہلے فرانس میں نظامِ کہن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا۔ جمہوریت، آزادی اور مساوات پر مبنی اس نظریہ نے یوروپ اور شمالی امریکہ پر اپنے گہرے اثرات ڈالے۔ اور وہاں کے نظامِ حکومت کو یکسر

ہی بدل دیا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایشیا و افریقہ بھی بالآخر اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نوآبادیاتی نظام کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔
ٹھیک اسی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جمہوریت پر مبنی بورژوا نظام جب تیز رفتار صنعتی ترقی کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور اس نے معاشی و سماجی عدم مساوات کو انتہا پر پہنچا دیا تو اینجلز، مارکس وغیرہ نے ایک اور فلسفہ کو جنم دیا جسے ہم آج سوشلزم یا کمیونزم کے نام سے جانتے ہیں۔ اس فلسفہ نے تاریخِ عالم کا رُخ کس طرح موڑا اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج اشتراکی ملکوں میں ایک نئی تہذیب کا دور دورہ ہے جس کی بنیادی اقدار سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی اقدار سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ نہ ہی یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔ اور اشتراکی ممالک میں اس سے انحراف کا رجحان اب ڈھکا چھپا نہیں ہے۔
اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انقلاب لانے کے لئے پہلے قابلِ قبول نظریہ ہونا چاہیئے۔ دوسرے اُسے زمانہ کے مقبول ترین طرز میں پیش کیا جانا چاہیئے یہی نہیں بلکہ خلافت بدلنے کے لیے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور دونوں میں سے کسی ایک پر زور دینا اور دوسرے کو قطعی طور پر نظر انداز کرنا ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جو احیائی تحریکوں کی عام خصوصیت ہے۔
قدیم زمانہ میں جب تبلیغ و اشاعت کے ذرائع بہت محدود ہونے کے ساتھ ساتھ نئے فلسفہ کی اشاعت پر کڑی پابندی ہوتی تھی تو نئے فلسفہ کا قدیم فلسفہ پر غلبہ میدانِ جنگ کے فیصلہ پر مبنی ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلسفہ کی مقبولیت سکندرِ اعظم کی فتوحات کے بعد ہوئی اور اسلام کا پھیلاؤ مسلم سپہ سالاروں کی جنگی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہوا۔ ماضی قریب میں کمیونزم کی توسیع بھی سُرخ فوج

کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ ہوئی۔
مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم نظریاتی حیثیت سے زیادہ مضبوط نہ ہو لیکن فوجی حیثیت سے زیادہ طاقتور تو وہ زیادہ دِنوں تک اپنی فوجی برتری کی بنا پر اپنا نظریہ نہیں منوا سکتی ہے۔ نازی ازم اور فاشزم کا حشر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے فوجی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے مضبوط نظریہ کو اپنانا پڑتا ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ منگول یا مغل جنہیں عام طور سے تاتاری کہا جاتا ہے وہ ایک آندھی کی طرح وسطی اور مغربی ایشیا پر چھا گئے۔ انہوں نے بغداد کی اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تاتاریوں نے مسلمان کو شکست ضرور دیدی لیکن انہیں جلد ہی اس کا احساس ہوگیا کہ اپنی فوجی برتری کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ و علاقہ کے بہترین نظریہ کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسلام کو لبیک کہا۔
موجودہ زمانے میں جانشینی کی لڑائی جسمانی کے بجائے زیادہ تر ذہنی ہوگئی ہے اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ اب بڑی حد تک میدانِ جنگ کے بجائے جمہوری ایوانوں میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں حقیقی جنگ الیکشن میں لڑی جاتی ہے۔ اور اسمیں کامیابی پر حکومت کی باگ دوڑ کسی نظریاتی گروہ کے ہاتھ میں آسکتی ہے۔ لیکن جس طرح تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں فتحیابی اور کامیابی اُسی کو نصیب ہوئی جو جدید آلاتِ حرب سے مسلح تھا۔ اسی طرح الیکشن میں کامیابی جدید تکنک کے اختیار کرنے پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ پھر حکومت کی پوری مشنری بدلی جاسکتی ہے۔ اور اس تبدیلی سے ایک نیا طریقِ عمل وجود میں آسکتا ہے۔ اور نئی تہذیب جنم پا سکتی ہے۔ اِس کے پھلنے پھولنے کے مواقع نئے جانشین فراہم کر سکتے ہیں۔

تبصرے

صوت الجامعہ (اردو) تقطیع کلاں ۔ ضخامت ۸۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر سالانہ چندہ ۔ ‎-/6 ، پتہ : دارالترجمہ والتالیف مرکزی دارالعلوم بنارس ۔

مرکزی دارالعلوم بنارس ابھی بالکل ایک نو عمر مدرسہ ہے ۔ لیکن اس نہایت مختصر مدت میں بھی اس نے ہندوستان اور اس سے باہر عربی ممالک میں بھی خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے اور اس کا باعث مدرسہ کے اساتذہ کی اعلیٰ لیاقت و قابلیت ، تحقیق و جستجو کا ذوق ، محنت اور خلوص ہے ۔ چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ مدرسہ میں ایک دارالترجمہ والتالیف بھی قائم ہے جو محض برائے نام نہیں بلکہ ایک فعال ادارہ ہے اور مفید اور بلند کتابیں شائع کررہا ہے ، زیرِ تبصرہ مجلہ اس ادارہ کا ہی ترجمان ہے اس مجلہ کے عربی اڈیشن کا تذکرہ برہان کی کسی اشاعت میں (غالباً) ہوچکا ہے یہ اس کا اردو اڈیشن ہے اور اب تک ہمیں اس کے دو نمبر وصول ہوتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ مجلہ اپنی اسی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا تو کوئی شبہ نہیں انڈو پاک کے بلند پایہ اسلامی و تحقیقی مجلات و رسائل کی برادری میں اس سے ایک بڑا وقیع اور قابلِ قدر اضافہ ہوگا ۔ مضامین سب کے سب سنجیدہ ۔ متین اور بلند پایہ علمی و تحقیقی ہیں ۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ سب لائق اساتذہ کے قلم سے ہیں ۔ البتہ نمبر ۲ کا مضمون " تقلید کی فسوں کاریاں " عصر حاضر کا ایک علمی اور تحقیقی مجلہ کے مرتبہ و مقام سے فروتر ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مقالہ ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن یہ کیا

ضروری ہے کہ ہر مضمون کو شائستہ اعتنا سمجھا ہی جائے ۔ آخر قرآنِ مجید کے حکم "واذا مروا باللغو مرّوا کراما" کے کیا معنی ہیں ۔!! بہرحال ارباب ذوق کو عموماً اور مدارس عربیہ کے طلبار اور اساتذہ کو خصوصاً اس مجلہ کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔

(۱) ۔ اسلام اور عصر جدید (انگریزی) تقطیع متوسط ، ضخامت ایک سو آٹھ صفحات کاغذ اور ٹائپ اعلیٰ ۔ سالانہ قیمت 30/-

(۲) ۔ اسلام اور عصر جدید (اردو) تقطیع متوسط ۔ ضخامت ایک سو آٹھ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ ۔ سالانہ قیمت 15/-

اسلام اور ماڈرن ایج سوسائٹی نئی دہلی کی طرف سے ملک کے مشہور اور بلند پایہ مصنّف اور اہل قلم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی ادارت میں یہ دونوں سہ ماہی رسلے بڑی کامیابی سے کئی برس سے نکل رہے ہیں ۔ جیسا کہ سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد اسلام کے ان مسائل و مباحث سے متعلق بحث و گفتگو کرنا ہے جن کو زمانۂ حاضر نے پیدا کر دیا ہے ۔ یہ مسائل و مباحث قانونی اور فقہی بھی ہیں ۔ کلامی بھی ہیں اور اقتصادی و سماجی بھی ، اگرچہ یہ مسائل سیاسی بھی ہیں لیکن یہ سوسائٹی کے مقاصد سے خارج ہیں ۔ اور حقیقت یہ بھی ہے کہ جن کو ہم سیاسی مسائل بھی کہتے ہیں ۔ ایک بڑی حد تک ان کا تعلق اسلام کے قانونی ، سماجی اور اقتصادی نظام سے ہی ہے ۔ بہرحال یہ مسائل عالم اسلام کے عام مسائل ہیں اور ان پر عربی ، انگریزی اور دوسری زبانوں میں کثرت سے کتابیں اور مقالات شائع ہو رہے ہیں ۔ ظاہر ہے ان مسائل پر غور و خوض کا انداز اور طریق فکر ایک نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ علم الکلام اور فقہ کی تاریخ سے ظاہر ہے ۔ اس بنار پر ان مسائل نے عالم اسلام میں مختلف تحریکوں اور متعدد مکاتب فکر کو جنم دیا ہے ۔ اسلام اور عصر جدید کے اردو اور انگریزی دونوں ایڈیشنوں میں کوشش کی جاتی ہے ۔ کہ قارئین کو اسلام کے مسائل اور ان پر بحث کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے واقف کیا جائے

مضامین کا لب و لہجہ سنجیدہ اور متین اور علمی ہوتا ہے۔ خود فاضل مدیر کے مقالات اور اداریے خاصہ کی چیز ہوتے ہیں۔ جن میں روشن خیالی اور بیدار مغزی کے ساتھ اعتدال پسندی کی جھلک ہوتی ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے سال دو سال میں بڑے پیمانہ پر مذہب اور اس کے متعلقات کے کسی موضوع پر آل انڈیا سیمینار بھی ہوتا ہے اور سیمینار کے منتخب مقالات بھی ان رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ غرض کہ یہ رسالے اپنے مقصد میں بڑے کامیاب ہیں۔ اربابِ ذوق ان کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

تحریر تقطیع خورد ضخامت صفحات ۱۰۸۔ کتابت و طباعت بہتر۔ سالانہ قیمت ‎15/-‎ پتہ:- علمی مجلس ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی ۶۔

یہ رسالہ جناب مالک رام صاحب کی ادارت میں کئی برس سے نکل رہا ہے۔ اس کے سب مضامین اردو زبان و ادب سے متعلق بڑے بلند پایہ تحقیقی اور علمی مضامین ہوتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تنقید نگاری کی اس گرم بازاری کے دور میں یہ مجلہ تحقیق کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ اور نوجوانوں میں ادب کے مسائل پر سنجیدہ غور و فکر اور تلاش و تفحص کا ذوق پیدا کر رہا ہے۔ مضامین کے علاوہ خود لائق مدیر کے وفیات بڑے کام کے اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ جن سے موجودہ تاریخ ادب کے مصنف کو اب اور جب بڑی مدد ملے گی۔

شاعر کا سالنامہ مرتبہ جناب اعجاز صدیقی تقطیع کلاں۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پانچ روپیہ۔ سالانہ چندہ ‎-/10‎ پتہ: شاعر قصر الادب بمبئی ۔ ۸ بی ۔ سی

شاعر اردو زبان و ادب کا غالباً سب سے زیادہ معمر، وقیع اور بلند پایہ ماہنامہ ہے۔ اس کا خاص نمبر چند در چند خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نمبر بھی اپنی دیرینہ روایات اور خصوصیات کا آئینہ بردار ہے۔ اس میں نظموں، کہانیوں، غزلوں، طنز و مزاح

اور ڈراموں اور باقیات کے ابواب کے ماتحت جو کچھ ہے مجموعی اعتبار سے ادب العالیہ کی فہرست میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ علاوہ ازیں بڑی بات یہ ہے کہ مقالات کا حصہ بھی بہت وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ اس حصہ کے سب ہی مقالات اردو زبان کے نامور اہلِ قلم اور محققین کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور فکر انگیز و معلومات افزا ہیں تاہم جو مقالات ہمیں سب سے زیادہ پسند آئے وہ یہ ہیں۔ (۱)۔ جمالیات۔ فن کار اور قاری سید احتشام حسین۔ (۲)۔ اردو شاعری میں ہولی کا رنگ، گیان چند، (۳)۔ مفروضہ ادبی اسکول، علی جواد زیدی (۴)۔ ہندوستانی موسیقی میں خیال کی اہمیت، عظمت حسین خاں میکش۔ (۵)۔ اصغر گونڈوی کی شاعری، سلام سندیلوی (۶)۔ جدید شاعری میں وزن و آہنگ کے مسائل، کرامت حسین کرامت، اردو زبان کے اس دورِ ابتلا میں شاعر کی یہ وضع داری اور آندھیوں میں اپنے چراغ کی لو کم نہ ہونے دینے کی ہمت اور حوصلہ بہت زیادہ لائقِ تحسین و آفرین ہے۔ درآنحالیکہ یہ مجلہ کسی انجمن یا ادارہ کا نہیں بلکہ تنہا ایک مشتِ استخوان کی سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کا مرہونِ احسان ہے۔

ندائے ملّت کا خاص نمبر اخباری سائز، ضخامت ۷۶ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت 1/75، پتہ: دفتر ندائے ملّت، لکھنؤ۔

ندائے ملّت مسلمانوں کا ایک مقبول اور پسندیدہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ یہ اس کا خاص نمبر ہے۔ جو بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف مضامین میں ہندوستان میں کانگریس گورنمنٹ کے حالیہ عہد کا جائزہ زیادہ تر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اور بعض مضامین میں ملک و قوم کے تمام نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے سنجیدگی سے اور اعداد و شمار کی روشنی میں لکھا ہے۔ اسلئے وہ ٹھوس بھی ہے اور موثر بھی، نظموں کا حصہ بھی خاصا طویل ہے۔ بعض مقالات بڑے فکر انگیز ہیں۔ مثلاً پروفیسر تیواری کا مضمون "سوویت خارجہ پالیسی کا مطمع نظر" کانگریسی قیادت کی پسپائی"، از مسز سہگل، "یا شٹپنوں کا جہاں" از اندر ملہوترہ۔ امید ہے کہ قارئین اس کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

برہان

جلد ۷۱ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے گذشتہ ماہ کی ۲۵ تاریخ کو پروفیسر عبدالمعید خاں کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرحوم برصغیر کے اساتذۂ عربی و اسلامیات میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، انھوں نے پہلے قاہرہ میں کئی برس مقیم رہ کر وہاں سے ڈی لٹ کی ڈگری لی اور پھر کیمبرج سے پی ایچ ڈی کیا۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئے تو ایسے کہ ساری زندگی یہیں بیت دی، ابھی دو تین برس ہوئے وہ صدر شعبۂ عربی کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے، ۳۵ برس سے اسلامیات کے مشہور اور بلند پایہ سہ ماہی رسالہ "اسلامک کلچر" کے اڈیٹر اور بارہ برس سے دائرۃ المعارف کے ناظم تھے، اس درمیان میں امریکہ اور یورپ کے جامعات میں وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، بیرونی ممالک کے بعض سفروں میں راقم الحروف اور وہ دونوں ہم سفر تھے، اخلاق و عادات کے اعتبار سے بہت سادہ اور منکسر المزاج تھے، اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی خرابیِ صحت کا شکار رہے اور اسی سبب سے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق عمر بھر مجرد رہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے، عمر ۶۶ برس کے لگ بھگ ہوگی، عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

کسی ایک ملک میں امن و امان اور حسن انتظام اور خصوصاً ہندوستان ایسے عظیم الشان ملک میں محض طاقت و قوت اور پولس یا فوج کے بل بوتہ پر قائم نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ باشندگان ملک کے دلوں میں حکومت کا وقار، عزت و احترام اور اس پر پورا بھروسہ اور اعتماد ہو اور جس طرح نفرت اور محبت انسان کی نفسی کیفیات ہیں جو کسی خارجی دباؤ کے زیر اثر نہیں، بلکہ ایک شخص کے ذاتی اور اندرونی احساسات و تاثرات کا ایک طبعی ثمرہ اور نتیجہ

ہوتی ہیں، ٹھیک اسی طرح لوگوں کے دل میں حکومت کا وقار اور اس پر بھروسہ اور اعتماد خود بخود پیدا ہوتا ہے اس کو جبر و تشدد، طاقت و قوت کی نمائش، اور بار بار کے آزمائے ہوئے چکنے چوپڑے وعدوں کے ذریعہ دل میں تہ نشین نہیں بنایا جاسکتا!

ایک حکومت کو وقار اور لوگوں کا اعتماد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ اس میں مندرجۂ ذیل اوصاف کا فقدان نہ ہو:

(۱) مخلص ہو، ایماندار ہو اور اس کا کیرکٹر اخلاقی عیوب و نقائص سے پاک ہو۔

(۲) عزم پختہ اور ارادہ مضبوط ہو۔ جو ایک مرتبہ کہہ دیا اس سے پیچھے ہٹنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ جو وعدہ کرلیا اس کا پورا ہونا لازمی اور یقینی ہو۔

(۳) جس کسی معاملہ پر غور کرے، کھلے دماغ سے کسی اپنے نفع اور نقصان کے اندیشہ کے بغیر کرے، مگر جب ایک بات کا فیصلہ کرے تو اب اس کے لئے اس سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو۔

بد قسمتی سے موجودہ گورنمنٹ اڈمنسٹریشن کے ان اوصاف و لوازم سے محروم ہے، اس بنا پر اندرونی خلفشار، ہیجان و اضطراب اور زبون حالی و ابتری کے باعث ملک کی جو حالت آج ہے، وہ کبھی نہیں ہوئی، ہر وہ شخص جو ناجائز ذرائع آمدنی نہیں رکھتا وہ محسوس کرتا ہے کہ اب زندگی اس کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، اور اگر اسے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے تو اس کی صورت بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ بھی وہی کچھ کرے جو حکومت کے عمال و کارکنان، ساہوکار، دکاندار، تاجر، صنعت کار، بنیئے بقال اور باقی سب کر رہے ہیں۔ یہ احساس اگر عام ہو جائے تو پھر امن و امان کی حفاظت اور قانون و ضابطہ کی پابندی نہ پولس کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور نہ فوج کے ذریعہ۔ نہ حکومت کی دھمکیاں کارگر ہوسکتی ہیں اور نہ بعض خاص افراد کے حق میں جبر و تشدد کی نمائش! یہی وہ حالات ہیں جو ملک میں انارکی اور طوائف الملوکی کے پیدا ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

لیکن ایک جمہوریہ میں یہ حالات پیدا ہو جائیں تو اصلاً اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟

حکومت پر یا عوام پر؟ جمہوریت میں عوام جس طرح حکومت بناتے ہیں، اسی طرح وہ حکومت کو الگ بھی کر سکتے ہیں، گویا اصل طاقت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن وہ اپنی طاقت کا بروقت اور صحیح استعمال اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں، انھیں معلوم ہو کہ دنیا میں دوسری قومیں کس طرح رہتی اور زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کی حکومتیں ان کی فلاح وبہبود کے لئے کیا کچھ نہیں کرتیں! برطانوی حکومت کے دو وزیروں سے جنسی بے راہ روی کا فعل صادر ہوا اور پبلک میں ان کا راز فاش ہوا تو دونوں کو وزارت سے استعفا دینا پڑا۔ اسی طرح فرانس میں آئے دن حکومتیں بدلتی رہی ہیں۔ امریکہ میں واٹرگیٹ کا معاملہ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کی حکومتیں برابر قائم ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں علامت ہیں اس بات کی کہ ان ملکوں کے عوام تعلیم یافتہ ہیں، بیدار مغز اور روشن خیال ہیں، وہ اپنے مسائل کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ حکومت کو دیبی یا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا نہیں کرتے، بلکہ اس کی حیثیت ان کی نگاہ میں ایک نمائندہ کی ہوتی ہے، اس لئے وہ حکومت کے رحم وکرم کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ خود حکومت کی نگاہ ان کی جنبش چشم ولب پر ہوتی ہے، آج کل ہمارے ملک میں جو حالات ہیں مثلاً اشیاء کی ہوش ربا گرانی، ضروریات زندگی کی نایابی، اشیاء اور ادویہ میں ملاوٹ، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے حوادث، انجینروں کی اسٹرائک، رشوت کی وہ گرم بازاری کہ اب اس کے بغیر قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں، امن وامان کا فقدان، دن دھاڑے لوٹ مار اور قتل، افسران حکومت میں جنسی بے راہروی کے عام واقعات، طلباء میں ایک عام اور شدید قسم کی بے چینی! یہ سب حالات اس درجہ سنگین ہیں کہ اگر ان میں سے ایک واقعہ بھی دنیا کے کسی جمہوری ملک میں رونما ہوتا تو دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یا حکومت صورت حال کی اصلاح کرتی اور یا اسے مستعفی ہونا پڑتا مگر داد دیجئے یہاں کے عوام کو اور مبارک باد پیش کیجئے گورنمنٹ کو کہ ملک زخموں سے چور اور سر تا پا داغ بنا ہوا ہے لیکن نہ حکومت استعفا دیتی ہے اور نہ حالات کی اصلاح ہوتی ہے، یہ صورت حال اس ملک کی توہین ہے، یہاں کے عوام کی توہین ہے اور پوری قوم کی پیشانی پر ایک سخت بدنما دھبہ ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

رسول اللہؐ کی ولادت

(اعلان نبوت)

۴

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

حبشہ کے مہاجر مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ اکابرِ قریش رسول اللہؐ سے مصالحت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں نیز یہ کہ قرآن میں مورتیوں کو خدا کا مقرب اور اس کے دربار میں سفارشی مان لیا گیا ہے، وہ دو[2] ماہ قیام کے بعد خوش خوش اپنے وطن مکہ روانہ ہو گئے، راستہ میں انھیں معلوم ہوا کہ اکابر کی رسول اللہؐ سے مصالحت ختم ہو گئی ہے، رسول اللہؐ نے پھر مورتیوں کی مذمت شروع کر دی ہے اور قرآن میں مورتیوں کے دربارِ خداوندی میں مقرب ہونے کی تردید کر دی گئی ہے، وہ حبشہ واپس نہیں ہوئے اور تحقیقِ حال کے لئے مکہ کا سفر جاری رکھا۔ مکہ پہنچکر یہ لوگ اکابر قریش کے خاندانی، سماجی اور کاروباری شکنجہ میں کس گئے اور پہلے سے زیادہ سخت، انھیں حبشہ کی زندگی یاد آنے لگی، انھوں نے دوسرے مسلمانوں سے وہاں کی پُر آرام، بے آزار اور بے خطر زندگی کا ذکر کیا تو وہ بھی حبشہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس بار ہجرت کرنے والوں کی تعداد بچوں کو چھوڑ کر سو سے زیادہ تھی، تراسی ۸۳ مرد، ۱۱ مکہ کی قریشی اور سات باہر کی عورتیں[1]، ان میں قریش کے ماتحت اور دست نگر لوگوں جیسے موالی اور حلیفوں کا

---

[1] ابن سعد ۱/ ۲۰۷

تناسب کافی تھا۔ اکابر قریش پہلی ہجرت حبشہ کے بعد چوکنا ہو گئے تھے اور جب دوسری ہجرت ہوئی تو انھوں نے بعض مہاجرین کو روکا، مارا پیٹا اور ان کا تعاقب کیا، پھر بھی وہ نکل ہی گئے۔ ان میں سے لگ بھگ نصف مہاجر چھ سات برس حبشہ میں رہے اور رسول اللہؐ کی مدینے ہجرت کے بعد لوٹ آئے اور باقی نصف تقریباً پندرہ سولہ سال حبشہ میں مقیم رہے اور ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر واپس ہوئے، حبشہ میں تجارت اور کاروبار ان کا خاص ذریعہ معاش تھا۔ اکابر قریش کو یہ بات ناگوار ہوئی تھی کہ نجاشی کی حکومت نے مہاجرین کی پہلی جماعت کو اپنے ملک میں پناہ دے کر ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا دوسری ہجرت کے بعد انھوں نے دو کارگزار قریشیوں عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کی قیادت میں نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا، یہ دونوں قرشی بارہا حبشہ کا سفر کر چکے تھے اور وہاں کے تاجروں سے ان کے مراسم تھے، وہ جب حبشہ جاتے تو نجاشی اور اس کے وزیروں کے لئے تحفے تحائف لے جایا کرتے تھے۔ اکابر قریش نے نجاشی اور اس کے وزیروں کے لئے ایک گرانقدر تحفہ بھیجا جس میں حجاز کے اعلیٰ چمڑے کا ایسا سامان بھی داخل تھا جس کی حبشہ میں بڑی مانگ اور قدر تھی۔ دوسری طرف ابوطالب نے قریش کے زعیم اعلیٰ کی حیثیت سے نجاشی کو ایک منظوم خط ارسال کیا جس میں اس کی مدح سرائی کر کے مسلمانوں کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آنے کی درخواست کی تھی۔ عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی نے نجاشی کے وزیروں کی معرفت بادشاہ سے کہلایا کہ آپ کے ملک میں ہماری قوم کے بہت سے سرپھرے آ گئے جنھوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب اختیار کر لیا ہے جو آپ کے مذہب سے بھی مختلف ہے، یہ لوگ ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ بتاتے ہیں اور ہماری مورتیوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اگر انھیں ان کے عقائد سے نہ روکا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ آپ کا مذہب بدلنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری قوم کے اکابر چاہتے ہیں کہ آپ انھیں اپنے ملک سے نکال کر ان کے حوالہ کر دیں۔ نجاشی نے تحقیق حال کے لئے مہاجر مسلمانوں کے نمائندوں سے گفتگو کی، انھوں نے اس خوش اسلوبی سے رسول اللہؐ اور اسلام

کی حمایت و وکالت کی کہ نجاشی کے دل میں دونوں کا احترام پیدا ہوگیا، اس نے قریشی وفد کے لیڈر عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو سخت و سست کہہ کر مسلمانوں کو ملک بدر کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

حبشہ میں اپنی ناکامی، مہاجر مسلمانوں کی سرخروئی اور نجاشی کے پُر حمایت موقف، اور مکہ میں رسول اللہؐ نیز ان کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی سے اکابر قریش کا اشتعال بڑھ گیا، ایک اور واقعہ نے اس اشتعال کو ہوا دی، یہ تھا عمر فاروق کا قبولِ اسلام، ان کا تعلق قریش کے ایک باعزت خاندان سے تھا، اس وقت ان کی عمر چھبیس سال کی تھی، دبنگ اور جوشیلے آدمی تھے، ان کے لمبے چوڑے جسم، لال آنکھوں اور لمبی گھنی مونچھوں نے انھیں بڑا رعب دار بنا دیا تھا، وہ اب تک رسول اللہؐ اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے تھے، مسلمان ہوکر ان کی طبیعت کے جوش و خروش نے سمت بدل دی، پہلے وہ مسلمانوں اور مسلمان ہونے کا ارادہ کرنے والوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے تھے، ستاتے اور دھمکیاں دیتے تھے۔ اب وہ ان لوگوں سے الجھتے، لڑتے اور جھگڑتے جو مسلمانوں کو صحن کعبہ یا اپنے گھروں کے باہر نماز پڑھنے یا باآواز قرآن کی تلاوت کرنے یا کھلم کھلا دعوت دینے سے روکتے تھے۔ عمر فاروقؓ کے اسلام سے رسول اللہ اور ان کی دعوت کو بڑی تقویت پہنچی۔

اکابر قریش ابوطالب سے پھر ملے اور کہا کہ ہم آخری بار آپ کے بھتیجے کے خلاف احتجاج کرنے آئے ہیں، ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے، ہم پہلے بھی کئی بار آپ سے شکایت کرچکے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے آباؤ اجداد کی مذمت، ہماری مورتیوں پر لعن طعن، ہمارے بچوں، جوانوں، غلاموں اور موالی کو گمراہ کرنے سے روکیے لیکن آپ نے اب تک ہماری درخواست درخور اعتناء نہیں سمجھی، اب ہم آخری بار آپ سے شکایت کرنے آئے ہیں، اگر آپ نے محمدؐ

---

[1] ابن ہشام ص ۲۱۸، یعقوبی ۲/۲۹

کو ان کی سخت نامناسب سرگرمیوں سے باز نہیں رکھا تو ہم انھیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ ابو طالب نے اکابر کی شکایت کا رسول اللہؐ سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا: اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیا جائے تب بھی میں اپنی دعوت نہیں چھوڑ سکتا اور اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہوں۔ ابو طالب نے ان کا عزم دیکھ کر کہا: اطمینان رکھو میں تمھیں کبھی مخالفوں کے حوالہ نہیں کروں گا[1]

قریش نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنی دعوت میں پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہیں تو انھیں یقین ہو گیا کہ ابو طالب نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی، وہ ابو طالب اور ان کے سارے خاندان سے سخت آزردہ ہو گئے، ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور عہد کیا کہ جب بھی موقع ملے گا رسول اللہؐ کو قتل کر دیں گے۔ ابو طالب، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے دیکھا کہ قریش کے تیور بہت بدلے ہوئے ہیں اور وہ انھیں چین سے مکہ میں نہیں رہنے دیں گے تو وہ اپنے سارے کنبہ کو لے کر شہر سے باہر شعب ابی طالب نامی گھاٹی میں منتقل ہو گئے، ایک اطلاع یہ ہے کہ اکابر قریش نے انھیں شہر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ انھوں نے ایک تحریر لکھوائی کہ ہاشمی جب تک محمد کو ہمارے حوالے نہیں کر دیں گے ہم ان سے بات چیت، میل جول، لین دین، شادی بیاہ سب بند رکھیں گے[2]۔ انھوں نے ہاشمیوں کے پاس خورد و نوش کا سامان لے جانے پر پابندی لگا دی۔ اعلان نبوت کے ساتویں سال سے دسویں سال تک تقریباً تین سال اور بقول بعض دو سال رسول اللہؐ نے شعب ابی طالب میں گذارے، اس اثناء میں ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، مکہ کے غیر ہاشمی ممتاز مسلمانوں سے اُن کا رابطہ قائم رہا، مکہ کے مسلمان چھپا چوری اسلامی دعوت دیتے اور اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے۔ زبیر بن عبدالمطلب

---

[1] انساب الاشراف ۱/ ۲۲۹ - ۲۳۰

[2] انساب الاشراف ۱/۲۳۴، ابن سعد ۲/۲۰۸ - ۲۰۹، ابن ہشام ص۲۲۹

کے بعد ابو طالب رفادہ وسقایہ کے اداروں کے نگران اعلیٰ ہو گئے تھے، وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان تین سالوں میں انھوں نے یہ فرائض انجام دئے یا نہیں، اس اثناء میں وہ، اُن کے بھائی اور بیٹے صرف حج کے موقع پر مکہ میں نظر آتے ہیں۔ حج کے ایام میں رسول اللہ کی تبلیغی سرگرمیاں بڑھ جاتیں، وہ مقربوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان قبیلوں کے سرداروں سے ملتے جو حج کرنے آتے، انھیں اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن سناتے۔ ان سرداروں کو جب معلوم ہوتا کہ خود رسول اللہؐ کے قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا ہے تو وہ بھی اسلام لانے سے انکار کر دیتے۔

ہاشمی ومطلبی خاندان خوب مالدار تھے، وہ اپنا رأس المال اور خورو نوش کا بہت سا ذخیرہ گھاٹی میں لے آئے تھے، آس پاس سے غلہ، دودھ، پھل، پانی اور دوسری ضروری اشیاء انھیں مل جاتی تھیں، ان کے بعض رشتہ دار بھی مکہ سے چھپا چوری ضرورت کی چیزیں بھیجتے رہتے تھے، خدیجہ رض کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خُوَیلِد گاہے گاہے اونٹ پر آٹا لاد کر گھاٹی کی طرف چھوڑ دیتے تھے[1]، اس کے باوجود تین سال کے آخری ایام میں گھاٹی میں روپے پیسہ اور غلہ کا ایسا توڑ پڑ گیا کہ فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔ ہاشمیوں کی متعدد لڑکیاں غیر ہاشمی اکابر کے ہاں بیاہی تھیں، انھیں اپنے ہاشمی عزیزوں کی تکلیف اور وسائل خورو نوش کی تنگی کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے شوہروں، لڑکوں اور رشتہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ ہاشمیوں کو گھاٹی سے باہر نکال لائیں، کچھ ہمدرد اور باہمت لوگ اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے۔ وہ مسلح ہو کر گھاٹی میں گئے اور ہاشمیوں ومطلبیوں کو نکال لائے پھر صحن کعبہ میں جو اکابر قریش کا اڈا تھا جا کر انھیں خبردار کر دیا کہ اگر انھوں نے ہاشمیوں کو شہر میں رہنے سے روکا تو وہ مع اپنے سارے کنبہ کے اعلان جنگ کر دیں گے۔ اپنے کیمپ میں پھوٹ پڑنے سے اکابر قریش کے ہاتھ کمزور ہو گئے اور انھیں بادل ناخواستہ ہاشمیوں کی

---

[1] انساب الاشراف ۱/۲۳۵

برداشت کرنی پڑی[1]۔ گھاٹی سے نکلنے کے کچھ عرصہ بعد پہلے ابوطالب اور پھر خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا، ان دونوں سے رسول اللہؐ کو بڑی تقویت تھی، ابوطالب ہر خطرہ میں رسول اللہؐ کی مضبوط ڈھال تھے اور خدیجہ آرام اور معاشی بے فکری کا سرچشمہ تھیں۔

اکابر قریش کی ختم نہ ہونے والی مخالفت اور قتل کے منصوبہ کے پیش نظر رسول اللہؐ کئی برس سے کسی طاقتور قبیلہ کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ وہ حج کے لئے آنے والے قبائلی سرداروں سے ملتے اور اسلام پیش کرکے ان کی حمایت طلب کرتے لیکن یہ سردار نہ اسلام قبول کرتے، نہ ان کی حمایت کے لئے تیار ہوتے۔ ابوطالب کے انتقال پر انھیں ایک طاقتور قبیلہ کی پشت پناہی اور زیادہ ضروری نظر آنے لگی[2]۔ قریش کے بعد حجاز میں ثقیف سب سے زیادہ مالدار اور متمدن قبیلہ تھا، اس کی بود و باش طائف کے پہاڑی شہر میں تھی۔ قریش کی طرح ثقیف کا پیشہ بھی تجارت تھا، طائف میں چمڑا صاف کرنے کے کارخانے اور انگور کے باغ تھے، ثقیف کے تاجر اعلیٰ قسم کا چرمی سامان بناتے تھے اور بڑے پیمانے پر کشمش برآمد کرتے تھے۔ ابوطالب کی وفات کے چند دن بعد رسول اللہؐ طائف جاکر ثقیف کے اکابر سے ملے، انھیں بتایا کہ میں نبی ہوں، میرا مقصد اسلام پھیلانا ہے، آپ لوگ مجھے اپنی حمایت میں لے لیجئے تاکہ میں سب عربوں تک اپنی دعوت پہنچادوں؛ اس بات کا آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں مذہب بدلنے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ اکابر بڑے روکھے پن سے پیش آئے اور بولے جب تمھارے قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا اور تمھیں پناہ نہیں دی تو تمھیں ہم سے اس کی توقع کیوں ہے[3]۔ اکابر

---

[1] ابن سعد ۱/۲۱۰، انساب الاشراف ۱/۲۳۶

[2] طبری ۲/۲۲۹

[3] انساب الاشراف ۱/۲۳۷

کا اشارہ پاکر شہر کے کچھ جاہلوں نے رسول اللہؐ سے بیہودہ باتیں کیں اور ان پر پتھر پھینکے۔ رسول اللہ شہر سے باہر افسردہ و آزردہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور کہا: مالک، اپنی بے بسی، بے چارگی اور لوگوں میں اپنی ناقدری کا تجھ سے شاکی ہوں، اے سب سے بڑے رحیم، بے سہاروں کے مددگار تو مجھے کس کی حفاظت میں دے گا[1]! طائف کا سفر رسول اللہؐ نے مخفی رکھا تھا تاکہ درپئے آزار اکابر قریش کو علم نہ ہو اور اپنے لے پالک زید بن حارثہ کے سوا کسی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ واپسی پر جب مکہ کے قریب پہنچے تو انھیں قریش کے خوف سے شہر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی، وہ رک گئے اور زید کو ایک بااثر غیر ہاشمی چچا مُطعِم بن عَدِی بن نَوفَل کے پاس بھیجا کہ اپنی امان میں لے کر انھیں گھر پہنچا دیں، مُطعِم نے ہاشمیوں کو گھاٹی سے نکالنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مُطعِم، ان کے بھائی اور لڑکے مسلح ہو کر آ گئے اور رسول اللہ کو اپنی حفاظت میں گھر پہنچا دیا۔

طائف کا سفر اعلان نبوت کے دسویں سال ماہ ذی قعدہ میں واقع ہوا، حج کا موسم شروع ہو چکا تھا، ہر طرف سے حاجی آ رہے تھے، مجنہ، عکاظ اور ذو مجاز میں ہاٹ لگے ہوئے تھے رسول اللہ مقربوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان ہاٹوں اور حاجیوں کے خیموں میں جاتے، مقرب ان کا تعارف کراتے کہ یہ محمد بن عبداللہ ہیں، قریش کے اس اعلیٰ خاندان سے جو حاجیوں کو کھانا اور پانی دیتا ہے، ان پر وحی آتی ہے۔ خدا نے انھیں پیغمبر منتخب کیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ دعوتِ اسلام دیتے، قرآن کی تلاوت کرتے اور کہتے کہ اگر توحید خالص نیز میری نبوت مان لوگے تو عرب اور عجم پر تمھاری سیادت قائم ہو جائے گی اور آخرت میں جنت سے بہرہ ور ہو گے[2]۔ پھر طاقتور قبیلوں کے اکابر سے ملتے اور کہتے کہ مجھے اپنی امان

---

[1] انساب الاشراف ۱/۲۳۷

[2] ابن سعد ۱/۲۱۶

میں لے لو تاکہ میں خدا کا پیغام پہنچا دوں، اس کے بدلہ میں جنت اور دنیوی سربلندی کا وعدہ کرتا ہوں[1]، یہ اکابر نہ اسلام قبول کرتے نہ رسول اللہؐ کو اپنی حفاظت میں لینے کی حامی بھرتے، کوئی معذرت کے لہجے میں دونوں مطالبے رد کر دیتا، کوئی روکھے پن سے (فقیہ و محدث زہری) ان (نودس) سالوں میں رسول اللہؐ حج کے لئے آنے والے عرب قبیلوں میں گشت کیا کرتے قبائلی شرفاء اور اکابر سے گفتگو کرتے اور کہتے مجھے اپنی پناہ میں لے لو اور میری حفاظت کرو، میں تمھیں ترک مذہب کے لئے مجبور نہیں کرتا، جو چاہے خوشی سے اسلام قبول کرلے، جو نہ چاہے میں اسے مجبور نہیں کروں گا، میں چاہتا ہوں کہ (اکابر قریش کی طرف سے) مجھے قتل کی جو دھمکی دی گئی ہے اس سے مجھے اپنی امان میں لے کر میری حفاظت کرو حتی کہ میں خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ فکان رسول اللہ فی تلک السنین یعرض نفسہ علی قبائل العرب فی کل موسم ویکلم کل شریف قوم لا یسألھم مع ذلک إلا أن یؤووہ ویمنعوہ ویقول: لا اکرہ أحدا منکم علی شیء، من رضی منکم بالذی أدعوہ الیہ فذلک ومن کرہ لم اکرھہ، انما أرید ان تحوزونی فیما یراد لی من القتل حتی أبلغ رسالۃ ربی[2]۔

اعلان نبوت کے گیارھویں سال ایام حج میں رسول اللہؐ کی ملاقات مدینہ کے چھ سات زعیموں سے ہوئی۔ مدینہ میں ایک دادا کی اولاد میں یمن کے دو قبیلے آباد تھے۔ اوس اور خَزْرَج، ان میں کبھی کبھی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، پچھلے سال اوس کا ایک وفد مکہ آیا تھا، اس کا مقصد خزرج کے خلاف قریش سے معاہدہ کرنا تھا، رسول اللہ کو معلوم ہوا تو وہ وفد سے ملنے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ وفد نے کہا ہم قریش سے معاہدہ کرنے آئے ہیں مذہب بدلنے نہیں آئے[3]۔ رسول اللہؐ ناکام واپس چلے گئے۔ وفد کا قریش سے معاہدہ

---

[1] ابن سعد ۱/۲۲۲ [2] ابن کثیر (البدایہ والنہایہ، مصر) ۳/۱۴۰

[3] ابن کثیر (البدایہ والنہایہ، مصر) ۳/۱۴۸، انساب الاشراف ۱/۲۳۸

نہ ہو سکا۔ وفد کی مدینہ واپسی پر اوس کی خزرج سے وہ جنگ ہوئی جو بُعاث کے نام سے مشہور ہے جس میں طرفین کے متعدد بڑے لیڈر مارے گئے، اوس کو شکست ہوئی اور دونوں قبیلوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ اوس و خزرج کے پڑوس میں کئی یہودی قبیلے آباد تھے۔ قینقاع، نضیر اور قریظہ جن سے ان کے ازدواجی و اقتصادی روابط نیز باہمی مدد کے معاہدے تھے۔ خزرج کا جب ان سے لڑائی جھگڑا ہوتا تو یہودی غصہ میں آکر کہتے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، اس کی قیادت میں ہم تمہاری اچھی طرح خبر لیں گے اور عاد و ارم کی طرح تمہیں نیست و نابود کر دیں گے[1]۔ رسول اللہؐ نے خزرجی اکابر کو اسلام کی دعوت دی، قرآن پڑھکر سنایا، پناہ طلب کی اور اس کے عوض جنت کا وعدہ کیا۔ خزرجی اکابر نے اسلام سے دلچسپی ظاہر کی، ان میں دو حنفی موحد بھی تھے۔ اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم بن تیہان۔ اکابر کو یہودیوں کی پیش گوئی یاد تھی کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمیں محمد کو نبی مان لینا چاہئے ورنہ یہودی سبقت کر کے ان کی قیادت میں ہمارا صفایا کر دیں گے، وہ مسلمان ہو گئے، ان کا خیال تھا کہ اگر خزرج اور اوس دونوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی خانہ جنگیاں ختم ہو جائیں گی اور وہ رسول اللہؐ کی زیر قیادت متحد ہو جائیں گے، انھوں نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ہم آپ کو بخوشی اپنی امان میں لینے کو تیار ہیں لیکن اس وقت ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، پچھلے سال ہماری اوس سے لڑائی ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں ہمارے تعلقات بری طرح خراب ہو گئے ہیں۔ اگر اس وقت ہم آپ کو مدینہ لے جاتے ہیں تو امکان ہے کہ اوس کے اکابر مسلمان نہ ہوں اور آپ کو دونوں قبیلوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکے، اس لئے ہم آپ سے معاہدہ کئے بغیر مدینہ جاتے ہیں، وہاں اوس و خزرج میں آپ کی نبوت کا چرچا کریں گے اور اسلام کی دعوت دیں گے، امید ہے کہ دونوں قبیلے مسلمان ہو کر آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیں گے، اگلے سال حج کے موقع

---

[1] ابن ہشام صفحہ ۲۸۶، ابن کثیر ۳/۱۴۸

پر آکر ہم آپ سے حمایت و حفاظت کا معاہدہ کرلیں گے[1] اکابر نے قبول اسلام کے بعد ان الفاظ میں بیعت کی ؛ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، ایک دوسرے پر جھوٹا الزام نہیں لگائیں گے، بھلے کاموں میں رسول اللہؐ کے حکم سے سرتابی نہیں کریں گے۔ ان شرائط کی پابندی کرنے والوں کے لئے رسول اللہؐ نے جنت کا ذمہ لیا[2]۔ اسلام کی اشاعت اور قرآن کی تلاوت کے لئے رسول اللہ نے اپنے رشتہ کے ایک چچازاد بھائی مصعب بن عُمیر عبدری کو خزرجی اکابر کے ساتھ کردیا۔

مدینہ پہنچکر خزرجی اعیان نے یہ چرچا شروع کردیا کہ مکہ کے سب سے شریف خاندان میں ایک نبی مبعوث ہوا ہے اور یہ وہی نبی ہے جس کی پیش گوئی پڑوس کے یہودی کیا کرتے تھے، انھوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بتایا کہ ہم نے اس قریشی نبی پر ایمان لاکر اسلام قبول کرلیا ہے، ہماری خواہش ہے کہ اوس و خزرج کے دونوں برادر قبیلے بھی اسے نبی تسلیم کرلیں تاکہ اس کی قیادت میں ہمارے لڑائی جھگڑے ختم ہوجائیں اور ہم اتفاق و اتحاد کی زندگی سے ہم کنار ہوسکیں۔ بہت سے اوسی و خزرجی اربابِ خرد ایک عربی نبی کے مبعوث ہونے اور اس کی رہنمائی میں اپنی قبائلی عداوتیں، جھگڑے اور خون خرابے بند ہونے کے تصور سے خوش ہوئے اور اسلام لانے کو تیار ہوگئے۔ رسول اللہ کے فرستادہ مُصعب بن عُمیر مکہ میں رسول اللہ کی بیعت کرنے والے خزرجی اعیان کے ساتھ گھروں، مجمعوں اور گلی کوچوں میں گشت کرکے لوگوں میں اسلام سے دلچسپی پیدا کرتے رہے، اگلا موسم حج آتے آتے مدینہ کے بہت سے اوسی و خزرجی عرب مسلمان ہوچکے تھے، کوئی گھر ایسا نہیں بچا جس کے ایک دو آدمی اسلام نہ لے آئے ہوں، البتہ چند قبائلی شاخیں ابھی متذبذب تھیں اور اپنے مصلحت اندیش لیڈروں کے اذن کی منتظر

---

[1] ابن سعد ۱/ ۲۱۸ ـ ۲۱۹

[2] انساب الاشراف ۱/ ۲۳۹، ابن سعد ۲/ ۲۲۰

ان کے علاوہ بوڑھوں کی ایک جماعت جس نے عیسائی یا یہودی مذاہب کا مطالعہ کیا تھا یا ان سے متاثر تھی اپنے مذہب پر جمی رہی۔ حج کا وقت قریب آیا تو اوس و خزرج کے ستر ذمہ دار مسلمان مکہ روانہ ہوئے، ان کے علاوہ دونوں قبیلوں کے پانچ سو غیر مسلم حاجی بھی تھے۔ مکہ کے باہر ان کے خیمے ڈیرے لگ گئے۔ رسول اللہؐ ان ستر آدمیوں سے ملے اور انھیں ہدایت کی کہ کسی ممتاز قریشی سے ملاقات نہ کریں اور مناسک حج سے فارغ ہو کر رات کو عَقَبَہ کی گھاٹی کے پاس بیعت کے لئے جمع ہو جائیں۔ قرارداد کے مطابق رسول اللہؐ عَقَبَہ پہنچ گئے، ان کے ساتھ صرف ان کے چچا عباس بن عبدالمطلب تھے جو خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے لیکن مصلحۃً اپنے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ گفتگو کی ابتداء عباس نے کی، مدینہ کے ستر قبائلی اعیان کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا: آپ لوگوں نے محمد کو اپنی حفاظت میں لینے کی پیشکش کی ہے، مکہ میں محمد کا سارا (ہاشمی و مطلبی) خاندان ان کا محافظ اور نگہبان ہے، خاندان کے وہ لوگ بھی ان کے محافظ ہیں جنھوں نے ان کا مسلک اختیار نہیں کیا ہے اور وہ لوگ بھی خونی رشتے اور بمقتضائے شرافت ان کی حمایت کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر نہیں ہیں، محمد نے سوائے آپ کے اور کسی کی حفاظت میں رہنا پسند نہیں کیا ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ میں اتنی طاقت ہے، شجاعت ہے، جنگی بصیرت اور سارے عربوں کے مقابلہ میں محمد کی حفاظت کا بل بوتا ہے تو آپس میں مشورہ کر کے متفقہ فیصلہ کیجئے[1]۔ اوسی و خزرجی اعیان نے جن میں سے اٹھاون خزرج کے تھے اور گیارہ اوس[2] کے عہد کیا کہ ہم مدینہ میں رسول اللہؐ کی ان کے دشمن سے اسی طرح حفاظت و حمایت کریں گے اور ان کے لئے اسی طرح خون بہائیں گے جس طرح اپنے بال بچوں کے لئے۔ بیعت ہو گئی۔ رسول اللہؐ نے ستر اعیان سے بارہ نقیب (لیڈر) منتخب کئے، نو خزرج سے اور تین اوس سے، ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو

---

[1] ابن سعد ۱/۲۲۱-۲۲۲، انساب الاشراف ۱/۲۵۴

[2] ابن ہشام صـ۳۰٦

سب سے پہلے رسول اللہؐ پر ایمان لائے تھے، ہر نقیب اپنے زیر اثر خاندانوں کو رسول اللہؐ کا وفادار رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ نقیبوں کے انتخاب کے بعد بیعت کرنے والے اپنے اپنے خیموں ڈیروں کو لوٹ گئے اور رسول اللہؐ اپنے گھر چلے آئے۔

بیعت سے متعلق ساری کارروائی اسے صیغۂ راز میں رکھنے کے لئے پوری احتیاط کے ساتھ حاجیوں کے پڑاؤ سے دور عقبہ میں ایک تہائی رات گذرنے کے بعد کی گئی تھی، اس کے باوجود قریش کو اس کی خبر ہو گئی، صبح کو ان کے کئی نمایندے بیعت کرنے والوں سے ان کے خیموں ڈیروں میں جاکر ملے اور احتجاج کیا کہ تم نے محمدؐ کو پناہ دی ہے اور ہم سے لڑائی کے لئے ان کی بیعت لی ہے جبکہ ہم کسی حالت میں تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔[1] بیعت کرنے والے خاموش رہے، ان کے کچھ دوسرے غیر مسلم ہم قوموں نے جو حج کے لئے آئے تھے اور عقبہ میں بیعت کی کارروائی سے ناواقف تھے بیعت کی تردید کی، قریشی اکابر عبداللہ بن اُبَی بن سلول سے ملے، یہ وہ شخص ہے جو ہجرت کے بعد رأس المنافقین کہلایا، عبداللہ خزرجی لیڈر تھا، سن رسیدہ، پختہ کار، بُردبار اور صلح جو، وہ اپنی قوم کو بھلے مشورے دیتا تھا اور جنگ وقتال نیز بدعہدی وغداری سے روکتا تھا[2]، اس کی قوم کا جوان، جوشیلا اور ابھرنے کا آرزومند طبقہ اپنے عارضی مفاد اور شخصی مصالح کی خاطر جب چاہتا اس کا مشورہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا، دو سال پہلے اس طبقہ کی ضد اور شخصی مفاد پرستی کے باعث جنگ بعاث روکنے کے لئے عبداللہ کی ساری کوششیں ناکام ہوئی تھیں، اس کے باوجود عبداللہ مدینہ کا ایک بارسوخ لیڈر تھا جس کی عزت اس کی قوم کے لوگ ہی نہیں پڑوس کے یہودی بھی کرتے تھے، اس کے متبعین کا دائرہ کافی وسیع تھا، غالباً مدینہ کے ایک تہائی باشندے بے چون وچرا اس کا حکم مانتے تھے، وہ اور اس کے پیرو نہ اس بات کے حق میں

---

[1] ابن سعد ۱/ ۲۲۳

[2] صالحانی (رنات الثالث والثانی، بیروت) ۲/ ۴۱

تھے کہ رسول اللہؐ مدینہ آکر رہیں اور نہ اس بات کے کہ اوس و خزرج انھیں اپنی پناہ میں لے کر ان کے دشمنوں سے لڑائی کا معاہدہ کریں ۔ وہ اور اس کے تبعین کی خاصی بڑی جماعت حج میں شریک ہوئی تھی لیکن ان میں سے کسی کو اوسی و خزرجی اکابر نے ہونے والی بیعت یا اس کے مضمون سے مطلع نہیں کیا تھا ۔ قرشی اکابر نے عبداللہ سے پوچھا : کیا بیعت ہم سے لڑنے کے لئے کی گئی ہے تو اس نے جواب دیا : یہ بڑا سنگین معاملہ ہے ، ایسے معاملہ میں میری قوم ضرور مجھ سے مشورہ کرتی ، میرے علم میں اس طرح کی کوئی بیعت نہیں ہوئی ہے ۔ إن هذا الأمر جسيم وما كان قومي ليفتاتوا عليّ بمثل هذا وما علمته[1] ۔ ابن سعد ۱/۲۲۳ ــــ هذا اباطل وما كان هذا وما كان قومي ليفتاتوا عليّ بمثل هذا ، ولو كنت بيثرب ما صنع هذا قومي حتى يؤامروني ۔

رسول اللہؐ کو عقبہ کی بیعت سے بڑا اطمینان ہوا ، کیونکہ انھیں اپنی پشت پناہی کے لئے ایک بہادر ، لڑائی میں مشاق اور مسلم قبیلہ مل گیا ۔

عقبہ میں بیعت کرنے والے اوس و خزرج کے ستر زعیموں نے مدینہ واپس آکر اپنی قوم کو بیعت اور اس کے مضمون سے مطلع کیا اور بڑے پیمانہ پر مسلمان بنانے کی مہم چلا دی ، مہم پھلنے پھولنے لگی ، چند ہفتوں میں سینکڑوں اوسی و خزرجی مسلمان ہو گئے ۔ اس زمانہ میں عبداللہ بن اُبی اور اس کے متبعین بھی اسلام لے آئے ، خوشی سے نہیں عقبہ میں بیعت کرنے والوں کے دباؤ میں اور اس خوف سے کہ اگر انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو مدینہ کی مسلمان اکثریت ان کا سماجی بائکاٹ کر دے گی اور اور ان کے لئے چین سے جینا مشکل ہو جائے گا ۔ عبداللہ کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر وہ مسلمان نہیں ہوا تو دونوں قبیلوں کے ابھرتے کے آرزومند دوسرے اور تیسرے درجے کے لیڈر مخالفانہ رویہ اختیار کریں گے اور اس کے قبائلی رسوخ کو کاری ضرب لگے گی ۔

(باقی)

---

[1] طبری ۲/۲۴۰

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۳)

از سعید احمد اکبر آبادی

چٹرجی کمیٹی کی رپورٹ یہ رپورٹ جو باریک ٹائپ کے ایک سو چوالیس مطبوعہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے بہت مفصل اور مبسوط ہے اور اس میں یونیورسٹی کے ہر شعبہ اور اس کے ہر کام کا جائزہ بڑی تحقیق وتدقیق اور جزئیاتی استیعاب و استقصار کے ساتھ لیا گیا ہے اور اعتراضات کو بے کم وکاست بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کی روشنی میں ایک ایک اعتراض سے متعلق اپنی رائے پیش کی گئی ہے، اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو اہم فیصلے کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مالیات بڑے شدومد کے ساتھ اعتراض کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی میں لاکھوں روپیہ کا غبن اور خیانت ہے۔ انجینئرنگ کالج کی لاکھوں روپیہ کی مشنری پاکستان منتقل کردی گئی ہے، معمولی جائدادیں بھاری قیمت دے کر خرید کی گئی ہیں، کمیٹی نے بتایا ہے کہ حسابات کی جانچ پڑتال اور رجسٹروں اور رووچرں کی حفاظت ان کے باقاعدہ اور اپ ٹوڈیٹ رکھنے اور آڈٹ کے اعتراضات کا بروقت جواب دینے میں غفلت ضرور ہوئی ہے جس کا ایک سبب تقسیم بھی ہے جس نے یونیورسٹی کا پورا نظام زندگی ہی درہم برہم کردیا اور ایک افراتفری کی کیفیت پیدا کردی تھی، لیکن آخر میں کمیٹی کہتی ہے:

"ہم یہ ضرور کہیں گے کہ شروع میں ہم یونیورسٹی کے حساب کتاب کے معاملہ میں حد درجہ غیر مطمئن اور مشکوک تھے، لیکن جب آڈٹ کے اعتراضات ہم نے یونیورسٹی کے ذمہ دار اصحاب کے سامنے پیش کئے اور ان سے جواب طلب کیا تو انھوں نے بڑی جد و جہد اور تلاش کے بعد وہ مطلوبہ رکارڈ فراہم کر لئے جن کے متعلق خیال یہ تھا کہ گم ہوگئے ہیں اور چند ہفتوں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اتر پردیش کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے جو اعتراضات ۱۹۶۰ء کے ماہ ستمبر تک تھے تقریباً ان سب کا تشفی بخش جواب مل گیا ہے اور ہم نے دیکھا کہ رکارڈ صحیح اور جوں کے توں ہیں۔" (ص ۴۸)

اقربا نوازی اور فرقہ پرستی اقربا نوازی اور فرقہ پرستی کے اعتراضات جن کو پارلیمنٹ میں اور فرقہ پرست اخباروں میں بڑے زور شور سے اچھالا گیا تھا۔ کمیٹی نے ان کی بھی تردید کی ہے اور وہاں غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کے ساتھ یونیورسٹی برادری کا جو معاملہ ہوتا ہے اس کی بڑی تعریف کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ "طلبا کا داخلہ" کے زیر عنوان باب ہشتم میں کمیٹی نے یونیورسٹی کی تاریخ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے طریق کار پر بڑی سیر حاصل اور جامع گفتگو کی ہے اور جو کچھ کہا ہے بڑی صفائی سے اور کھلے دل سے کہا ہے، چونکہ یہ باب بہت اہم ہے اور یونیورسٹی کے دستور کے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہم جستہ جستہ اس کے بعض حصوں کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کرتے ہیں:

تاریخ "اب ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کا جو اصل مقصد تھا اس سے بحث کرتے ہیں، کیونکہ طلباء کے داخلہ کا براہ راست تعلق اسی مقصد سے ہی ہے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جب کبھی طلباء کے داخلہ کا سوال پیدا ہوگا اس پر غور کرتے وقت یونیورسٹی کی تاریخ اور اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر دینا ممکن نہ ہوگا۔ یہ یونیورسٹی عالم وجود میں کیسے آئی؟ یہ سب کو معلوم ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت

ہوگئی تھی، عظیم مصلح اور مفکر سرسید نے ان حالات کا جائزہ لینے اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمان مغربی تعلیم کے بغیر اس قعر مذلت و پستی سے باہر نہیں آسکیں گے جس میں حالات نے انھیں گرادیا ہے، ساتھ ہی سرسید کے عقیدہ میں اسلام ایک عظیم ترقی پسند طاقت تھا، اس بناپر سرسید نے منصوبہ بنالیا کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں کے مسلمان طلبار کو اسلامی مذہب اور اس کی روایات کی بھی تعلیم دی جائے، اس مقصد کے لئے (مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد) انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جس کے افتتاح کی رسم ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو منائی گئی۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں ورود کیا اور کالج کا سنگ بنیاد رکھا، یہ وہی کالج ہے جس کے مقدر میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا مرکز ہونا لکھا تھا، ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال سے پیشتر ہی ہندوستان کے تعلیمی نظام میں اس کالج نے اپنا ایک مقام حاصل کرلیا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک شروع ہوئی، اس سلسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا اور سکرٹری آف اسٹیٹ کے درمیان خط وکتابت ہوتی رہی، اور آخر ۱۹۲۰ء میں مرکزی حکومت کی مجلس قانون ساز نے ایک ایکٹ پاس کرکے اس کالج کا یونیورسٹی ہونا منظور کرلیا، یہ کالج جو اب یونیورسٹی بن گیا تھا تمام تر پبلک کے چندوں اور ان کے عطیات سے چلتا رہا تھا اور ان عطیات کے دینے والوں میں غیر مسلم بھی شریک تھے۔

آپ نے دیکھا! کمیٹی نے کس صفائی اور جرأت سے اصل حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ (۱) یہ کالج مسلمانوں کے لئے قائم کیا گیا تھا (۲) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ مذہب اسلام اور اسلامی روایات کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا تھا (۳) یہ کالج مسلمانوں کے روپیہ سے بنا تھا گو بعض غیر مسلم بھی ان کے ساتھ شریک تھے (۴) پھر جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنی تو وہ کوئی نئی چیز نہ تھی، بلکہ یہی کالج تھا جس کو اب اس کی اپنی روایات اور خصوصیات کے ساتھ یونیورسٹی کا مرتبہ ومقام دے دیا گیا تھا (۵) چنانچہ جس ایکٹ کی رو سے یہ کالج یونیورسٹی بنا یعنی ۱۹۲۰ء کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ اس میں اغراض ومقاصد کے زیر عنوان ان سب

حقائق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایکٹ کا منظور کرنا یا اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کرنا پارلیمنٹ کے واسطہ سے حکومت کے اختیار میں ہے، لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اس بناپر ایکٹ میں کوئی رد و بدل ان کی رضامندی کے بغیر اخلاقاً تو درست ہوگا ہی نہیں، دستور میں اقلیتوں کے تحفظات کی جو دفعہ ہے اس کی رو سے قانوناً بھی معتبر نہیں ہوگا۔

۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بعد جو ملک کے حالات بدلے تو ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بنا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ایکٹ مسلمانوں کی مرضی سے بنا۔ کیونکہ مولانا ابو الکلام آزاد اس وقت وزیر تعلیم تھے اور اس ایکٹ کو جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ اور دوسرے مسلم اداروں نے تسلیم کر لیا، اس کے خلاف نہ کوئی تحریک چلی، نہ احتجاج ہوا، اور نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوا۔ اکا دکا کسی اخبار نے کچھ لکھا ہو، یا کسی نے کچھ کہا ہو تو اس کی حیثیت شخصی اور ذاتی رائے کی ہے، اس کو مسلمانوں کی رائے عامہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

ایکٹ ۱۹۵۱ء کی نسبت کمیٹی کی رائے

لیکن سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بدلا یا نہیں؟ اس کے جواب میں کمیٹی نے صاف کہا ہے کہ نہیں بدلا، چنانچہ کمیٹی کہتی ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ان چند اہم ترمیمات کے باوجود جو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں کی گئی ہیں ۱۹۵۱ء کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار قانوناً نہیں بدلا۔ اور حکومت کی روز افزوں مالی امداد سے بھی اس کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیرالا ایجوکیشن بل کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ کیا تھا اس نے قطعی طور پر اس معاملہ کو طے کر دیا ہے، فاضل ججوں نے کہا ہے: کوئی تعلیمی ادارہ عملی طور پر گورنمنٹ کی مالی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا، اور اگر امداد کی شرط یہ قرار دی جائے کہ اس تعلیمی ادارہ کو اپنے حقوق سے دست بردار

ہونا پڑے گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دفعہ (۱) 30 کے ماتحت دستور نے اس ادارہ کے لوگوں کو جو حقوق دئے ہیں وہ سلب کئے جا رہے ہیں" اس کے بعد فاضل ججوں نے اس پر بحث کی ہے کہ اگر کسی خاص فرقہ کی تعلیم گاہ میں کسی دوسرے فرقہ کے طلبار کا داخلہ ممنوع نہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اب یہ تعلیم گاہ خاص اس فرقہ کی نہیں رہی طلباء کے داخلہ کے معاملہ میں ایک یونیورسٹی کس درجہ مختار ہے؟ اس سلسلہ میں فاضل ججوں نے مسٹر جسٹس فرینکفرٹر (Mr. Justice Frankfurtar) نے امریکہ کے ایک اسی قسم کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا تھا اس کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ: "یونیورسٹی کے لئے چار چیزوں کی مکمل آزادی ضروری ہے (۱) ایک یہ کہ کون پڑھائے گا (۲) دوسرے یہ کہ کیا پڑھایا جائے گا (۳) تیسرے یہ کہ کس طرح پڑھایا جائے گا (۴) چوتھے یہ کہ کس کو پڑھایا جائے گا۔ یہ چار قسم کی آزادی ہر یونیورسٹی کا بنیادی اور ضروری حق ہے اور ریاست کا فرض ہے کہ ان کا احترام کرے" یہ عبارت نقل کرنے کے بعد جسٹس گجیندر گڈکر جی کمیٹی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی رائج الوقت داخلہ کی پالیسی پر بحث کی ہے اور پھر اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بیشک یونیورسٹی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ہاں کے فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ ڈویژن جن کے نمبر 55٪ ہوں ان کو دوسری جگہوں کے امیدواروں کے مقابلہ میں داخلہ کے معاملہ میں ترجیح دے، علاوہ ازیں جب ایک طالب علم ایک یونیورسٹی میں داخل ہو جائے گا تو اب وہ یونیورسٹی کے گروہ کا ایک مستقل ممبر ہو جائے گا اور اس بنا پر اب اعلیٰ کلاسوں میں داخلہ کے لئے اس کو از سر نو جدوجہد نہ کرنی ہوگی۔ جس وقت یہ رپورٹ لکھی جارہی تھی۔ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلبار کی تعداد 35٪ تھی اور اس کو کمیٹی نے بہت معقول تعداد قرار دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی میں مستقل طور پر مسلم اور غیر مسلم طلبار کی تعداد کا تناسب بھی مقرر کر دیا جائے تو کسی شخص کو سکولرزم اور جمہوریت کی آڑ لے کر اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہونا چاہئے، لیکن ساتھ ہی جیسا کہ کمیٹی نے کہا ہے۔ اگر یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز

نہیں ہوسکتا کہ اس میں ایرے غیرے نتھو خیرے ہر مسلمان کو داخلہ مل سکتا ہے، بلکہ یونیورسٹی کی عظمت اور اس کے بلند مقاصد کا تقاضا ہے کہ اس میں داخلہ کی شرط کو سخت کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اس میں داخلہ کے لئے فرسٹ ڈویژن یا سکنڈ ڈویژن پچپن فیصدی نمبروں کے ساتھ کی شرط رکھی گئی ہے۔

کمیٹی نے بہرحال یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس یونیورسٹی میں مسلمان طلبا رکثرت سے داخلہ لیں گے۔ کیونکہ یہاں مسلمان طالب علموں کے لئے تعلیم، رہائش اور اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق تربیت کی جو سہولتیں اور آسانیاں میسر ہیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں، کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ: ہمارے سامنے جن حضرات نے اپنے بیانات دئے ہیں ان میں متعدد لوگوں کی زبان سے یہ معلوم ہوا کہ دوسری یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبار کو داخلہ بہت کم ملتا ہے۔ کیٹی نے اس پر اپنے دلی دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے اور گورنمنٹ سے سفارش کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں فوری ضروری اقدام کرے۔

اساتذہ کا تقرر اساتذہ کے تقرر کے ذیل میں کمیٹی نے یونیورسٹی کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ مضمون کی لیاقت وقابلیت اور درس کی صلاحیت میں برابر ہونے کے باوجود یونیورسٹی ایک ایسے شخص کا انتخاب کرے جو علی گڈھ کے ماحول، کلچر اور اس کی روایات سے مانوس ہو۔

کمیٹی نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ فرقہ پرست اخبارات مسلم یونیورسٹی پر بے بنیاد الزامات عائد کرکے اکثریت کے ذہن کو اس کی طرف سے مسموم کر رہے ہیں۔

غرض کہ چھاگلہ کمیٹی کی یہ رپورٹ آزادی اور تقسیم کے بعد مسلم یونیورسٹی کی قانونی حیثیت کو متعین کرنے کی راہ میں ایک مینارۂ روشنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا مقام تاریخی دستاویز کا ہے، وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی جس ڈھب کے آدمی تھے اس کی وجہ سے اسے منظور کرنے کے حق میں نہیں تھے، لیکن گورنمنٹ نے اسے منظور کر لیا۔ یہ اہم دستاویز چونکہ زیدی صاحب

کے عہد میں تیار ہوئی ہے اور یونیورسٹی پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے یونیورسٹی کی طرف سے ان کے معقول اور حقیقت افروز جوابات کے بہم پہنچانے کا کام انہیں کی ان تھک مساعی، بیدار مغزی اور حسنِ انتظام وتدبر کا رہینِ احسان ہے۔ اس بنا پر اس کا کریڈٹ زیدی صاحب کو ملنا چاہئے۔

فیکلٹی آف تھیالوجی کی ترقی سرسید نے کالج کے مقصد تعلیمی اعتبار سے دو بتائے تھے (۱) انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم (۲) اسلامی دینیات کی تعلیم، اور درحقیقت دینیات کی تعلیم ہی اس کالج کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت تھی، کیونکہ انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم تو ہر کالج میں ہوتی ہی ہے اور وہ اسی مقصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، اسی طرح عربی فارسی کی تعلیم بھی ہر کالج میں ہوتی، لیکن دینیات کی تعلیم کسی بھی کالج میں نہیں ہوتی، لیکن مسلمانوں کے ذہنی انحطاط اور مذہب کے متعلق ان کے محدود اور تنگ نظریہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مقصدِ اول میں کالج خوب پھلا پھولا یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کی ایک نئی اور عظیم نسل پیدا کی، لیکن مقصدِ ثانی کے متعلق سرسید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ سرسید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا حالی، مولوی طفیل احمد منگلوری اور محمد اکرام ندوی، سب اس پر افسوس کرتے رہے ہیں کہ کالج اور پھر یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کبھی خاطر خواہ اور یونیورسٹی کے شایانِ شان نہیں ہوا۔ یہاں اس مضمون کو نظرِ بد سے بچنے کے تعویذ سے زیادہ کبھی کوئی اہمیت نہیں ہوئی، اس مضمون کا درس دینے والوں کا احترام ہوتا تھا! لیکن ٹھیک ٹھیک وہ احترام جو ایک کلکٹر کمشنر یا بیرسٹر بیٹا اپنے بوڑھے، جاہل اجڈ اور دیہاتی باپ یا چچا کا کرتا ہے، اس کا نصاب "راہِ نجات" اور بہشتی زیور کے مسلے مسائل سے آگے نہیں بڑھا۔ اس مضمون کے امتحان میں کامیابی کا معیار اس سے زیادہ نہیں تھا کہ طالب علم نے سورۂ فاتحہ یا کوئی اور سورت جو عام طور پر نماز میں پڑھی جاتی ہے زبانی سنادی

ہے۔[1]

زیدی صاحب کے عہد کو اس حیثیت سے عہد آفریں کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا یہ خواب یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ اس عہد میں اپنی تکمیل کی منزل کی طرف بڑھنا اور سرسبز وشاداب ہونا شروع ہوا اور بارہ برس کی مدت میں وہ یونیورسٹی کے چمن کا ایک شجرِ بارآور بن گیا۔

دینیات کا تصور

لیکن جو کچھ ہوا بے سبب نہیں ہوا، اس کی جڑیں بہت گہری اور دور رس ہیں اور اس کا دارومدار صرف اس ایک بات پر ہے کہ دینیات کا اصل تصور اور اس کی تعریف کیا ہے؟ قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں پہلے دینیات کا اصل تصور اور اس کی حقیقت معلوم کر لیجئے، بدقسمتی سے عام مسلمانوں کا کیا ذکر! اچھے خاصے لکھے پڑھے اور بہت سے علماء تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اسلام نام ہے چند عبادات اور چند اخلاقی تعلیمات اور چند خاص معتقدات کا، بس یہی چند چیزیں ہیں جو ایمان وکفر کے درمیان ایک حدفاصل ہیں اور ان پر عمل کر لینا انسان کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے اس بنا پر جو چاہے کیجئے، مگر نماز روزہ کی پابندی کرتے رہیئے، خیرخیرات کیجئے، تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو جائیے، کسی ایک بزرگ کا مرید ہو کر سب کچھ ان کی خدمت کے لئے وقف کر دیجئے، اور بزرگوں کے مزارات پر جو عرس ہوتا ہے اس میں شریک ہو جیئے، سیرت کے جلسے بلکہ کانفرنسیں بڑی دھوم دھام سے منعقد کرائیے، اور واعظین کرام کو گراں قدر نذرانے پیش کر دیجئے، اگر آپ دولتمند ہیں تو اس سے بحث نہیں کہ دولت کس طرح کمائی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز، بہرحال سال میں کم از کم ایک عمرہ اور ہر برس ممکن نہ ہو تو دوسرے تیسرے برس ایک حج ضرور کرتے رہیئے، بس یہ چند اعمال و افعال ہیں ان کی وجہ سے آپ دنیا میں بھی سرخرو رہیں گے اور

---

[1] دیکھئے پروفیسر حمید الدین مرحوم کا مضمون مجلۂ علوم دینیہ، علی گڑھ ج ۱، نمبر ا میں

آخرت میں بھی ! یہی اسلام ہے اور یہی دین ! اب اگر کروڑوں انسان بھوک پیاس سے مر رہے ہیں، جہالت و نادانی کا شکار ہیں، دنیا کے کروروں غریبوں کا خون سرمایہ داری کی جونک چوس رہی ہے، تہذیبِ فرنگ نے انسان کو برہنہ کر دیا ہے اور وہ عریانی و فحاشی کے چوراہے پر کھڑا ننگا ناچ ناچ رہا ہے۔ آمرانہ ذہنیت نے جمہوریت کے دعاوی کے باوجود رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کے امتیاز کے بغیر کروروں بندگان خدا کو اپنی سیاست کے شکنجہ میں جکڑ کر زندگی کی ان آسائشوں سے محروم کر دیا ہے جو پروردگار عالم نے ان کے لئے پیدا کی تھی تو یہ سب کچھ ہوا کرے، اگر آج غلط طرزِ فکر، غلط اقدار کی پرستش اور صحیح اقدار حیات سے روگردانی کے باعث انسان کے سر پر قیامتیں اور ہلاکتیں منڈلا رہی ہیں تو ہوں ! ایک مسلمان کو ان سے کیا واسطہ ! یہ سب تو سیاسی اور دنیوی مشغلے ہیں۔ صلاح و تقویٰ اور طہارتِ نفس کو ان چیزوں سے کیسا تعلق ! مانا کہ قرآن میں خدا کو رب العلمین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃٌ للعالمین فرمایا گیا ہے، مگر اس کے یہ معنی کہاں ہیں کہ ہمارے لئے مسلمان ہونے کے ناطے دنیا کے تمام انسانوں کی جسمانی اور باطنی، مادی اور روحانی، دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کے لئے وہ تمام کام کرنے ضروری ہیں جو اللہ کی رب العالمینی اور آنحضرت صلی اللہ کے رحمت کونین ہونے کے طبعی مظاہر ہیں، ہم ہر نماز کے بعد اپنی فتح و نصرت اور ظالموں کی تباہی و بربادی کے لئے دعا تو کر لیتے ہیں ! تو کیا یہ کافی نہیں ہے، اور کیا اس سے ہمارے خیرِ امم اور امت وسطاً ہونے کا مقتضا پورا نہیں ہوتا ؟ ظاہر ہے جب اسلام کا تصور یہ ہو تو اس کی دینیات کا نصاب بھی اسی ذہن کا آئینہ دار ہوگا۔ اس میں نہ وسعت ہوگی اور نہ علمیت، وہ نہ اپنوں کو مطمئن کر سکے گا اور نہ غیروں کو، یہ اسلام دعا درود، سلام اور منقبت اور تعویذ گنڈے تک محدود ہوگا۔ اور اس میں نہ حرکت کا نشان ہوگا اور نہ علمیت کا۔ اس کا چراغ علم و فن کی آندھیوں میں روشن نہیں رہ سکے گا اور اس کی کشتیِ افکار و آرائے جدیدہ کے طوفان

سے صحیح سلامت نہ گذر سکے گی۔

لیکن درحقیقت اسلام کا صحیح تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کا عظیم ترین اور سخت انقلاب آفرین مذہب ہے، اس نے تاریخ کو ایک نہایت اہم موڑ دیا ہے، اس نے انسان کو زندگی اور کائنات کے معاملات ومسائل پر سوچنے اور غور کرنے کا ایک نیا ڈھنگ اور نیا آہنگ دیا ہے، زندگی محدود تھی، اسلام نے اس کو لامحدود بنادیا۔ کائنات بد وضع اور بے رونق تھی اس نے اسے لالہ زار کردیا، انسان ڈر اور خوف، مایوسی وناکامی اور احساس بےچیزی کا صیدزبوں تھا۔ اسلام نے اس کی ہمت باندھی، اسے حوصلہ بخشا، اسے جرأت وجسارت عطا کی اور اس کے سر پر کائنات ارض وسما پر حکمرانی و فرماں روائی کا تاجِ زرفشاں رکھا، وہ جامد نہیں ابدی الحرکت ہے، اس کا کوئی ایک میدان نہیں بلکہ انسان کے فکر وعمل کے ہر میدان میں وہ رواں دواں ہے، مذاہبِ عالم، علوم وفنون، فکر ونظر، شعروادب، سماجیات ومعاشیات سیاست اور حتی کہ فنون لطیفہ اور فلسفہ وحکمت، ان میں سے وہ کونسی چیز ہے جس پر اسلام نے اپنی چھاپ نہ لگائی ہو اور جس کے نقش ونگار میں اپنا رنگ نہ بھرا ہو، یہ اس کے علمی کارنامے تھے، ساتھ ہی اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رنگ ونسل، وطنیت وقومیت اور امیری اور غریبی کی تمام حدبندیوں کو ختم کرکے سب کو ایک رشتہ وحدت انسانی سے منسلک کردیا اور جو لوگ اسلام کی سچائی پر یقین واعتقاد رکھتے ہیں اور جن کا اصطلاحی نام مسلمان ہے ان کو دنیا کے تمام انسانوں کا محافظ اور نگراں مقرر کرکے ان کا یہ فرض قرار دیا کہ دنیا میں کہیں اور کسی جگہ بھی اگر کوئی ایک انسان یا ایک پوری آبادی ظلم اور ناانصافی کا شکار ہے، قحط اور وبا میں مبتلا ہے، اخلاقی انحطاط اور فکری واعتقادی گمراہی میں گرفتار ہے بہرحال مسلمان کو ان سب کی مدد کرنی چاہیئے، گویا ایک مسلمان کی زندگی یہ ہونی چاہیئے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتا ہے اپنا دل
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے یہ ہمہ گیر انقلاب کیونکر پیدا کر دیا؟ جواب یہ ہے کہ اپنے نظام فکر وعمل سے! پس جس کو ہم دینیات کہتے ہیں وہ اسی نظام فکر وعمل کا نام ہے اور چونکہ وہ ہمہ گیر اور نہایت وسیع ہے (جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا) اس بنا پر دینیات بھی اپنے مفہوم میں ایک نہایت وسیع مضمون ہوگا۔ اور بنیادی طور پر وہ مندرجۂ ذیل دو قسم کے علوم وفنون پر مشتمل ہوگا۔

(۱) وہ علوم جن کا تعلق براہِ راست دینیات سے ہے اور جو اس کے لئے اصل ماخذ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان علوم میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ مع اپنی تمام شاخوں اور لوازم ولوائم کے شامل ہیں۔

(۲) وہ علوم وفنون جن کا تعلق بالواسطہ دینیات سے ہے، اس سے مراد وہ علوم ہیں جو (۱) اسلام کے نظام فکر وعمل کو کلاً یا جزءً متاثر کرتے ہیں (۲) یا وہ علوم جن کے ذریعہ اسلام اپنے نظام فکر وعمل کو باختلافِ زمان ومکان لوگوں کے ذہن میں زیادہ راسخ اور موثر طریقہ پر ذہن نشین کرسکتا ہے، علاوہ ازیں اس ذیل میں وہ علوم وفنون بھی آتے ہیں جو اسلام کے نظام فکر وعمل کی کارگزاریوں اور انسان اور اس کے مختلف اداروں پر اس کے اثرات کا مرقع پیش کرتے ہیں، اس بنا پر قسم ثانی میں مندرجہ ذیل علوم وفنون شامل ہوں گے: تاریخ، فلسفۂ تاریخ، منطق وفلسفہ، معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور سائنس۔ مذکورہ بالا دونوں قسموں میں پہلی قسم کے علوم اور ساتھ ہی علوم آلیہ جیسے عربی زبان اور اس کے متعلقات، دینیات کے ہر طالب علم کے لئے لازمی ہوں گے اور قسم دوم کے علوم وفنون کو مختلف گروپ میں تقسیم کرکے ایک طالب علم کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ قسم اول کے علوم کے ساتھ قسم دوم کا جو گروپ چاہے اختیار کرلے[1]۔

---

[1] میں نے یہی خیالات اپنے انگریزی مضمون "How to tach Religian"
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے نظام فکر و عمل کے سرمایہ میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن اس کے باوجود یورپ اور امریکہ میں کسی یونیورسٹی کے دینیات کالج (College of Divinity) کو ملاحظہ فرمائیے! آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کا نصاب مذہبی علوم و فنون کے علاوہ سیکولر علوم و فنون پر اور اس کے مطابق کالج کی لائبریری ہر علم و فن کی کتابوں پر مشتمل ہے[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں ظاہر کئے ہیں۔ کئی سال ہوئے پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ مذاہب کے زیر انتظام پٹیالہ میں ایک سیمینار "مذہب کا مطالعہ کس نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے" کے عنوان پر ہوا تھا، اور میں نے یہ مقالہ اسی سیمینار میں پڑھا۔ اب سیمینار کے دوسرے مقالات کے ساتھ یہ مقالہ بھی کتاب کی شکل میں یونیورسٹی سے شائع ہو گیا ہے

[1] میں نے بھی اپنے زمانہ میں فیکلٹی آف تھیالوجی کی لائبریری کو مختلف علوم و فنونِ جدیدہ پر بہترین کتابوں سے پُر کر دیا تھا، یہاں تک کہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ تعجب کرتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک ناگوار واقعہ بھی پیش آیا جس کا مجھ کو اب تک افسوس ہے، ہوا یہ کہ ایک مرتبہ جناب بشیرالدین صاحب لائبریرین مولانا آزاد لائبریری نے لائبریری میں مختلف شعبہ جات کے صدر صاحبان کی ایک میٹنگ بلائی اور اس میں بطور شکایت کہا کہ بعض شعبوں کے صدر ڈپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے بالا ہی بالا کتابیں خرید لیتے ہیں اور اس کا بل لائبریرین کے پاس ادائیگی کے لئے بھیجدیتے ہیں، یہ خلاف قاعدہ بات ہے، آپ حضرات کے آرڈر لائبریرین کے واسطہ سے جانے چاہیئے، اسی سلسلے میں انھوں نے مزید کہا کہ بعض حضرات اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے ایسی کتابیں خریدتے ہیں جو ان کے مضمون کی نہیں ہوتیں، یہ کہکر انھوں نے مزید فرمایا: مثلاً فیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین نے برٹرنڈرسل کی خود نوشت سوانح عمری خریدی ہے، بھلا دینیات کو اس سے کیا تعلق؟ یہ سنتے ہی میں فوراً کھڑا ہوا اور ناراضگی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

بہرحال میں علی گڑھ دینیات کے اسی وسیع تصور کو لے کر آیا تھا اور اسی کے مطابق کام کرنا تھا۔ میں نے جب یہاں اپنے شعبہ کا چارج لیا تو اس کی حالت یہ تھی کہ :

(۱) شعبہ میں صرف دو لکچرر تھے، ان میں سے ایک صاحب ناظم دینیات کا کام کرتے تھے اور ان کا دفتر مسجد کے احاطہ کے اندر ایک کمرہ میں تھا۔

(۲) صدر شعبہ کوئی نہیں تھا، کیونکہ صدر ریڈر سے کم نہیں ہوتا۔

(۳) شعبہ کا اور فیکلٹی کا کوئی دفتر نہیں تھا

(۴) اس کا کلرک نہیں تھا۔

(۵) ریڈر اور پروفیسر کی عدم موجودگی میں حسب قاعدہ و ضابطہ پرو وائس چانسلر ڈین آف فیکلٹی ہوتا تھا، لیکن پرو وائس چانسلر کے ڈین ہونے سے فیکلٹی کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ ظاہر ہے۔

اس دفتری خستہ حالی اور کس مپرسی کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ دینیات کے مضمون کی طلباء میں اور اساتذہ میں کوئی وقعت نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نصاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے کرخت لہجہ میں کہا: آپ کو یہ فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا ہے کہ یہ کتاب دینیات کے دائرہ میں نہیں آتی، برٹرنڈرسل عصر حاضر کا عظیم مفکر، فلسفی اور سائنٹسٹ ہے لیکن ساتھ ہی خدا اور مذہب کا منکر ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ دینیات کے اساتذہ اور طلباء اس کتاب کو پڑھیں اور رسل نے خدا اور مذہب کے انکار کے جو دلائل دیئے ہیں ان پر غور کر کے اس کے جوابات تلاش کریں۔ علاوہ ازیں میں نے بشیر الدین صاحب سے شکایت کی کہ ایک عام بات کہتے کہتے ایک شخص کا معین طریقہ پر نام لینا آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بشیر صاحب میرے بڑے کرم فرما اور دوست ہیں، دوسرے دن انھوں نے مجکو معذرت نامہ لکھا اور میں نے بھی اپنے لہجہ کی کرختگی اور درشتی پر اظہار افسوس کیا، بات آئی گئی ہوئی۔

کی حیثیت ایک علمی مضمون کی دوسرے شعبوں کے مضمونوں کی طرح نہیں ہے، اس کے امتحانات برائے نام ہیں اور ان میں بڑی فیاضی اور دھاندلی برتی جاتی ہے، طلبا محض اس لئے دینیات لیتے ہیں کہ اس میں تو بے روک ٹوک پاس ہو ہی جائیں گے، علاوہ ازیں اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ بھی تھی کہ دینیات کے اساتذہ ہمیشہ وہ حضرات ہوتے رہے ہیں جو کیسے ہی بڑے عالم فاضل ہوں، لیکن انگریزی میں بولنے اور لکھنے سے عاجز تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے ماحول میں خواہ کوئی مضمون ہو، کوئی استاد انگریزی میں مہارت کے بغیر خاطر خواہ عزت اور وقار حاصل نہیں کر سکتا اور ایسا استاد خود بھی احساس کمتری کا شکار ہونے کے باعث اندر سے گھٹا گھٹا اور یونیورسٹی کی عام سوسائٹی اور اس کی فضا سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرے گا۔

سنی دینیات میں تو دو لکچرر تھے۔ شیعہ دینیات میں صرف ڈیڑھ ہی تھے، اور وہ اس طرح کہ ایک صاحب لکچرر تھے اور دوسرے محض ٹیچر، یہی حال زنانہ کالج کا تھا، وہاں سنی دینیات میں ایک خاتون لکچرر تھیں، لیکن شیعہ میں جو خاتون پڑھاتی تھیں وہ ٹیچرس ہی تھیں، ڈین کی حیثیت سے اب شیعہ دینیات بھی میری نگرانی میں تھا۔ اس بنا پر یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ اور فیکلٹی کے لئے باعث مذلت تھی اس لئے میں نے مذکورہ بالا دونوں جگہوں کو ختم کرا کے ان کی جگہ دو لکچرر مقرر کرائے، کسی کام اور پروگرام کو شروع کرنے اور اطمینان کے ساتھ اسے انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ بیٹھنے کی جگہ تو معقول ہو، اس سلسلہ میں میں نے "ولایت منزل" حاصل کی جو ایک نہایت وسیع کشادہ اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی مضبوط عمارت ہے اور حسن اتفاق سے ایک چھوٹی سی مسجد بھی اس میں بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے حاصل کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ کیونکہ اس پر بہت سے لوگوں کی نگاہ تھی، اگر زیدی صاحب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اس عمارت کو اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ کیا، مالیوں کے ذریعہ اس میں خوبصورت لان بنوائے، اور پھلواریاں

بنوائیں۔ ڈین کے دفتر اور صدر شعبہ کے دفتر دونوں کے لئے الگ الگ فرسٹ گریڈ اور سکنڈ گریڈ کے کلرک اور چپراسی، لائبریری کے لئے اسسٹنٹ اور ایک اٹنڈنٹ حاصل کیے۔

یہ سب کچھ تو فیکلٹی کی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تھا۔ معنوی حیثیت سے نصاب میں تغیر وتبدل کر کے اس کی حیثیت ایک علمی مضمون کی بنائی جو یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ نواب علی یاور جنگ کے زمانہ میں اساتذہ کی ایک میٹنگ تھی اس میں کہیں دینیات کا ذکر آ گیا تو ایک پروفیسر نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے نصاب دینیات کے بعض مشمولات کا تذکرہ کر کے اس کا مذاق اڑایا ایک اور پروفیسر صاحب نے اس پر کچھ اور حاشیہ آرائی کر دی، لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں خود نواب صاحب ان دونوں حضرات کو ان کے نام سے خطاب کر کے بولے: آپ یہ باتیں پرانے زمانہ کی کرتے ہیں۔ اب آج کل ہمارے ہاں جو نصاب رائج ہے آپ اس کو دیکھئے، میں نے بہت غور سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نصاب جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کے نصاب دینیات سے بھی بدرجہا بہتر ہے۔ فیکلٹی کی کلاسوں یعنی بی ٹی ایچ (۲ سالہ) اور ام۔ ٹی ایچ (ایک سالہ) کے نصاب میں یہ تبدیلی کی کہ جو طلباء عربی سے ناآشنا ہوں، ان کے لئے ایک پرچہ عربی کا سو نمبروں کا اور جو طلباء عربی جانتے ہوں ان کے لئے ایک متبادل پرچہ "تاریخ فقہ اسلامی" کا لازمی کر دیا، اور حدیث واصول حدیث اور فقہ واصول فقہ کی کتابوں میں ادل بدل کر انھیں اپ ٹو ڈیٹ بنا دیا، علاوہ ازیں ام۔ ٹی ایچ کے نصاب میں ایک مستقل پرچہ "مذاہب کے تقابلی مطالعہ" کا اضافہ کیا۔

نصاب کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر اساتذہ قابل نہیں ہیں تو وہ کسی مصرف کا نہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے فیصلہ کیا (۱) اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ڈپارٹمنٹ کے کاموں اور لکچروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے (۲) ایسے اساتذہ کا تقرر

کیا جائے جو لیاقت و قابلیت کے ساتھ انگریزی میں بھی اعلیٰ سند یافتہ ہوں، علمی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہوں اس سلسلہ میں میں نے اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ جب کبھی کوئی پوسٹ خالی ہو تو اس پر خود فیکلٹی کے اعلیٰ سند یافتہ کا حق بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہے، بشرطیکہ وہ چاہے علامہ نہ ہو۔ پوسٹ کا حق خاطر خواہ طریقہ پر ادا کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہو اس امر کو پیش نظر رکھنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا اور ڈپارٹمنٹ کے حق میں مفید بھی! کیونکہ دینیات کی تعلیم اور اس میں ریسرچ پر جس نے عمر کے چھ سات برس صرف کئے ہیں اس کے لئے ملازمت کے مواقع کسی اور یونیورسٹی اور دفتر وغیرہ میں تو ہیں نہیں۔ اب اگر اس غریب کو یہاں بھی موقع نہ ملے تو اس سے طلبا میں بددلی اور بیزاری پیدا ہوگی۔

بہرحال اس نقطۂ نظر اور اس کے ماتحت لگن سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے چارج لیا ہے اس وقت صرف دو استاد تھے، لیکن جب میں نے چھوڑا تو یہ تعداد آٹھ تک پہونچ گئی تھی، پھر ان میں ڈاکٹر یعنی ایم اے پی ایچ ڈی بھی ہیں، قاہرہ کے پڑھے ہوئے بھی ہیں، بلند پایہ اور اعلیٰ کتابوں کے مصنف اور معارف اور برہان کے مقالہ نگار بھی، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی یونیورسٹی کے ایک ڈپارٹمنٹ کا اسٹاف، بحیثیت مجموعی سندات، تحریر و تقریر، علمی و تحقیقی کارناموں اور اپنے مضمون پر دسترس کے پیش نظر جتنا اچھا ہو سکتا ہے، یہ اسٹاف اس سے کم اچھا نہیں ہے۔

ایک استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مضمون کو اس طرح پڑھائے کہ طالب علم کے دماغ میں اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو اور یہ چیز دوسرے طلبا کے لئے بھی اس مضمون کی طرف رغبت کا سبب بنے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کی مختلف مجلسوں اور سیمیناروں میں میری زبانی تقریر یا مقالہ تو ہوتا ہی رہتا تھا اب شعبۂ دینیات کے اساتذہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہو کر کبھی اردو میں اور کہیں انگریزی میں مقالہ خوانی اور بحث مباحثہ میں حصہ لینے لگے اور دوسرے شعبوں، یہاں تک کہ سائنس کے اساتذہ کے ساتھ

ان کو مذاکرہ میں شرکت کا موقع ملا تو اب دینیات کے متعلق یونیورسٹی کا جو ذہن پہلے تھا وہ بالکل تبدیل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کے شعبہ میں داخلہ کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، فیکلٹی کی کلاسیں جہاں پہلے ہو کا عالم رہتا تھا وہاں اب چہل پہل رہنے لگی، لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی اور آرٹس کے مضامین کے ساتھ سائنس اور کامرس کے طلبا بھی داخلہ لینے لگے۔ یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں فیکلٹی کے امتحانات اکا دکا کسی نے پاس کر لئے تو خیر، ورنہ اس مضمون میں پی ایچ ڈی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اب لڑکے اور لڑکیاں بھی پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے لگے۔ ان کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا وظیفہ مبلغ -/300 یا یونیورسٹی کا وظیفہ مبلغ -/250 ماہوار تین برس تک کے لئے ملتا تھا۔ جن طلبا یا طالبات کو پی ایچ ڈی کی ڈگری اب تک مل چکی ہے ان کی تعداد کافی زیادہ ہے ان میں سے جن کے مقالات چھپ چکے ہیں یا اب زیر طباعت ہیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر قاری حافظ محمد رضوان اللہ — مولانا محمد انور شاہ کشمیری۔ حیات اور کارنامے
اس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔

(۲) ڈاکٹر حنیفہ رضی — عبد اللہ بن مسعود اور ان کی فقہ
یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے طبع کی ہے

(۳) ڈاکٹر اقبال حسن خاں — شیخ الہند۔ حیات اور کارنامے
مطبوعہ مسلم یونیورسٹی

(۴) ڈاکٹر ماجد علی خاں — زندگی کا تصور قرآن اور سائنس میں
یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور لاہور کے شیخ محمد اشرف اسے چھاپ رہے ہیں،
مقالہ نگار نے پہلے ایم ایس۔ سی کیا اور پھر فیکلٹی آف تھیالوجی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد مذکورہ بالا موضوع پر دینیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔

پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں نے پانچ چھ برس شعبہ دینیات سے وابستہ رہ کر وقت

ضائع نہیں کیا بلکہ محنت کی اور مضمون میں کمال پیدا کیا وہ کسب معاش میں بھی کسی سے کم نہیں رہے۔
چنانچہ ڈاکٹر ماجد علی خاں جن کا ذکر ابھی ہوا ٹری نڈاڈ (Trinidad) کے ایک کالج
میں لکچرر اور ڈائرکٹر آف اسلامک اسٹڈیز بھی ہیں۔ مس شفقت فاطمہ جو دینیات کی بہت
ممتاز طالبہ رہی ہیں اور جو مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ریسرچ کر رہی تھیں دو برس سے زیادہ سے
ٹیونس کے ایک کالج میں اسلامیات کی لکچرر ہیں اور اب آئندہ سال سعودی عربیہ جارہی ہیں،
وہاں تقرر ہو گیا ہے، ایک لڑکی کراچی کے ایک لڑکیوں کے کالج میں دینیات کی لکچرر ہے۔
یہ نام وہ ہیں جنھوں نے تعلیم یہاں پائی مگر اب بیرونی ممالک میں کام کر رہے ہیں، لیکن جو خود
ہندوستان میں ہیں اور خوش اور مطمئن ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

یونیورسٹی میں دینیات کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے، لیکن غیر ملکی طلبار سے قطع نظر
ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے بھی ایسے مسلمان طالب علم کثرت سے آتے ہیں جو اردو
نہیں جانتے مگر دینیات لینا چاہتے ہیں، ہر سال ایسے طلبار کی الگ کلاس بنتی تھی اور میں
خود اسے انگریزی میں پڑھاتا تھا۔

طلبار کی ایک سوسائٹی تھی جو ہر ڈپارٹمنٹ میں ہوتی ہے، یہ جسد بے روح تھی میں نے
اس کو فعال و موثر بنایا، اس سوسائٹی کے وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے رہتے تھے جن کے اختتام
پر خورد و نوش کا بہترین انتظام ہوتا تھا اور اس میں دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبار
بھی شریک ہوتے تھے، اس طرح دینیات کا حلقۂ تعارف داثر دسیع ہوتا تھا، لائبریری کے
متعلق میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ لائبریری یونیورسٹی کی چند بہترین ڈپارٹمنٹل
لائبریریوں میں سے ہے۔

۱۸، ۱۹ برس پہلے کی بات ہے۔ محب محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دیوبند سے لکھنؤ
اور میں کلکتہ جارہا تھا۔ سفر میں چند گھنٹوں کی معیت ہو گئی، اس موقع پر مولانا نے فرمایا: میرا
احساس یہ ہے کہ مدارس عربیہ عمر طبعی کو پہونچ گئے ہیں اور اب دین کی حفاظت اور

اس کی خدمت کا کام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لینے کا فیصلہ مشیت الٰہی کر چکی ہے، ان حالات میں میری بڑی تمنا اور آرزو ہے (اور میں نے چند حضرات سے اس کا تذکرہ کیا بھی ہے) کہ آپ کو اب کلکتہ سے علی گڑھ بلایا جائے، وہاں آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ مولانا نے یہ بات اس زمانہ میں فرمائی تھی جب کہ علی گڑھ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، لیکن مولانا نے یہ کچھ ایسی ساعتِ نیک میں فرمایا تھا کہ میں علی گڑھ پہونچ ہی گیا۔ البتہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مقصد بھی پورا ہوا یا نہیں؟ کیونکہ مولانا کا مزاج دعوتی اور تبلیغی ہے اور میری طبیعت علمی اور اکتشافی! بہرحال مجھکو اس کی مسرت ہے کہ زیدی صاحب جن کے دل میں دینیات کے شعبہ کی بیکسی کا بڑا غم تھا اور جس کا وہ اکثر اظہار فرماتے رہتے تھے، ان کا مقصد پورا ہوگیا، چنانچہ جب میں علی گڑھ سے سبکدوش ہو کر دہلی آیا ہی آیا تھا ایک روز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز کی ایک میٹنگ تھی اس میں زیدی صاحب نے پروفیسر خلیق احمد نظامی، پرنسپل فاروقی اور پروفیسر مجیب کی موجودگی میں مجھ سے مخاطب ہو کر اپنے خاص لہجہ میں زور دیکر فرمایا: "اگر میں وہاں ہوتا تو ابھی آپ کو پانچ برس اور علی گڑھ سے نہ جانے دیتا[1]۔"

---

[1] اس میں شک نہیں کہ فیکلٹی آف تھیالوجی کی ترقی سے متعلق جو منصوبہ اور خاکہ میرے ذہن تھا میں اس کی کما حقہ تکمیل نہیں کر سکا اور اس کی حسرت ہی رہ گئی، مجھے ان طلبا ر کی طرف سے سخت صدمہ پہونچا جن کو میں نے ڈھائی سو تین سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ دلایا اور وہ مقالہ کی تکمیل کیے بغیر چل دیے، ان نوجوانوں کی اس سہل انگاری اور ژولیدہ دماغی نے میری ہمت توڑدی اور بعض منصوبوں کو خود مجھے مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اور جو کچھ میں کر سکا ہوں اس کے لئے اپنے رفقائے کار اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار و انتظام، خصوصاً وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور اکاڈمک و اکزکٹو کونسل کا دل سے شکر گذار ہوں:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

پروفیسر آل احمد سرور
کا
ایک خط

پروفیسر سرور نے تقسیم کے بعد سے اب تک مسلم یونیورسٹی کا پورا دور نہایت قریب سے اور محرم راز کی حیثیت سے دیکھا ہے اس لئے ذیل میں اڈیٹر برہان کے نام ان کا یہ خط شائع کیا جارہا ہے:

محترمی! تسلیم

برہان ایک عرصہ سے میرے پاس آتا ہے اور میں باقاعدہ اس کا مطالعہ کرتا ہوں، آپ کی تحریریں خاص طور سے دیکھتا ہوں، ادھر آپ نے علی گڑھ پر مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے. وہ شروع سے دیکھ رہا ہوں، تازہ شمارے (اگست ۷۳ء) میں آپ نے ذاکر صاحب کے دور اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے، یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ آپ نے ذاکر صاحب کی خدمات کا دور رخی جائزہ لیا ہے اور ان کی سیرت و شخصیت پر گہری نظر ڈالی ہے، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ ذاکر صاحب نے علی گڈھ کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا کماحقہ اعتراف نہیں ہوا، اور چونکہ میں انھیں خاصے قریب سے دیکھ

سکا ہوں اس لئے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عام طور پر مسلمانوں نے ان کی شاندار خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ اس سلسلہ میں احسان فراموشی تک کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے غلطیاں تو سبھی سے ہوتی ہیں، مگر بلا شبہ آزادی کے بعد اور تقسیم کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو گئے تھے ان میں ذاکر صاحب نے علی گڑھ کو بچالیا، موجودہ احتجاج کے سلسلہ میں بھی آپ کا رویہ میرے نزدیک تعمیری تنقید کا ہے، امید ہے کہ یہ نقطۂ نظر مقبول ہوگا اور موجودہ تنگ نظر سیاست کی رو کو بدلے گا، میری مبارکباد قبول فرمائیے۔

مخلص آل احمد سرور

از علی گڑھ ۲۷ر اگست ۱۹۷۳ء

اڈیٹر برہان:

مبارکباد کا شکریہ!

مقبول یار گشت نظیری کلام ما
بیہودہ صرف شکر نہ کردیم سودہ را

لیکن برہان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نامکمل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں میں خود علی گڑھ میں نہ تھا، میں نے علی گڑھ پہونچ کر ڈاکٹر صاحب کے جو آثار یا قیہ دیکھے برہان کا مضمون انہیں پر مبنی ہے، سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ قبل از وقت کیوں چھوڑا؟ اور وہ کیوں وہاں سے بیزار ہو کر گئے؟ پھر یہ بھی سنا جاتا ہے کہ آخر میں ان کے اور مولانا ابو الکلام آزاد کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے تھے، مجکو اس سلسلہ میں جو کچھ معلوم ہے وہ بہت

ناقص ہے اور اس کا مرتبہ علم حصولی کا ہے، پروفیسر آل احمد صاحب سرور کو ان چیزوں کا علم حضوری ہے، اگر وہ ان کو لکھدیں تو برہان ان کو شائع کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرے گا۔
اور ڈاکٹر صاحب پر برہان کے مضمون کی تکمیل ہو جائے گی،
برہان کا یہ سلسلۂ مضامین یونیورسٹی کی اور خصوصاً یونیورسٹی بعد از تقسیم کی ایک تاریخی روئداد ہے، اسی وجہ سے بیرونی ممالک میں بھی اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے، جنوبی افریقہ اور موریشش (جس کے سفرنامہ کے لئے شدید تقاضے چاروں طرف سے آرہے ہیں) سے تو میں ابھی آیا ہوں۔ وہاں کے مسلمانوں کو علی گڑھ کے ساتھ محبت نہیں عشق ہے، اسی وجہ سے برہان کا یہ سلسلۂ مضامین وہاں بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھا جا رہا ہے اور ان حضرات نے ان مضامین کے انگریزی ترجمہ کو کتاب کی صورت میں چھاپنے پر ایک گرانقدر رقم کی پیش کش بھی کی ہے، بہرحال ان وجوہ سے میں چاہتا ہوں کہ تقسیم کے بعد سے اب تک یونیورسٹی کی پوری سرگذشت اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کسی کی لاگ و رعایت اور جنبہ داری کے بغیر قلبند کردوں تاکہ ایک طرف گورنمنٹ کو محسوس ہو کہ اس نے ۱۹۷۲ء کا ایکٹ نافذ کر کے کیا حماقت کی ہے اور دوسری جانب مسلمانوں کو بھی عبرت ہو کہ انھیں یونیورسٹی کے لئے اور اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کرنا کیا چاہیئے تھا اور کیا کر رہے ہیں! اسی بنا پر اگر پروفیسر آل احمد

سترور ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کے عہد سے متعلق مذکورہ بالا حصہ کو مکمل کردیں تو میں بہت شکر گذار رہوں گا۔

مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(از مولانا محمد عبدالشاہد خاں صاحب شروانی، اسسٹنٹ لائبریرین
شعبۂ مخطوطات وانچارج اورنٹیل ڈویژن)

یہ عظیم المراتب اور رفیع المنازل کتاب خانہ، احاطۂ مسلم یونیورسٹی کے وسط میں اپنی وسیع وعریض ہفت منزلہ عمارت اور مشرقی طرز کے خوشنما صدر دروازہ کے ساتھ بڑی شان وشوکت لئے ہوئے ہر زائر کو کچھ دیر کے لئے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

اس عمارت کا نقشہ مشہور انجنیر مسٹر فیاض الدین حیدرآبادی نے بنایا تھا جس کا سنگِ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم حکومتِ ہند نے ۲۲ ر نومبر ۱۹۵۹ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے دورِ وائس چانسلری میں رکھا تھا اور افتتاح ۶ ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو کرنل سید بشیر حسین زیدی وائس چانسلر کے عہد میں کیا تھا اس کی بنیاد کی کھدائی کا افتتاح معمر ترین اولڈ بوائے ڈپٹی محمد حبیب اللہ خاں نے ۱۷ ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو پھاوڑا چلا کر کیا تھا۔

حکومتِ ہند کا بارہ لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس عمارت کا رقبہ تین لاکھ تیس ہزار ایک سو ساڑھے ترسیٹھ مربع گز ہے۔ اگر اس کے مشرقی، مغربی اور جنوبی وسیع شاداب اور خوش منظر لانوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ رقبہ چہار چند ہو جائے گا۔

دسمبر ۱۹۶۰ء ہی سے یہ کتاب خانہ ۴۸ سال "لٹن لائبریری" کے نام سے موسوم

رہنے کے بعد" مولانا آزاد" آزاد لائبریری" کے نام پر مبدّل ہوگیا۔ اور اب" مولانا آزاد لائبریری" کے نام سے شہرت یافتہ ہے۔

اس لائبریری کی موجودہ رفعت و منزلت تمام تر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومتِ ہند کی رہین منت ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں جب مولانا وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے کانووکیشن ایڈریس کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ اور لٹن لائبریری کی عمارت میں بیٹھ کر اس کا سرسری جائزہ لیا تو عمارت کو غیر مکتفی محسوس کرتے ہوئے اس کی جدید شاندار و مستقل ضروریات عمارت کے تخیل کا اظہار فرمایا۔ اور واپس جا کر اس کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر شروع کیں۔ جسے اپنی زندگی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ کسے خبر تھی کہ فروری ۱۹۵۸ء میں وہ رہگزارِ عالمِ جاودانی ہوجائیں گے۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو اس کا افتتاح بھی کرنا پڑے گا۔ اور انھیں کے نام سے یہ لائبریری موسوم بھی کرنا ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کی اس لائبریری سے مولانا آزاد کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اسی موقع تشریف آوری پر جب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے ملنے ان کی کوٹھی حبیب منزل۔ پرسن روڈ پر تشریف لے گئے تو اپنے "صدیق مکرم" کو ہم لوگوں کی موجودگی میں توجہ دلائی کہ اپنا نادر الوجود اور بیش بہا کتابخانہ، مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کو مرحمت فرمادیں۔ نواب صاحب نے اس شرط پر یہ مشورہ قبول کیا۔ کہ مولانا آزاد خود حبیب گنج آکر اس کارِ خیر کو انجام دلائیں۔ افسوس کہ مولانا آزاد اپنی ملکی و قومی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ وعدہ پورا نہ فرما سکے اور نواب صاحب ڈیڑھ سال بعد جوارِ رحمت خداوندی میں پہنچ گئے۔ مولانا آزاد کو اس کا افسوس رہا۔ اس کے بعد جب میں حاضرِ خدمت ہوا تو نواب صاحب کے خلف الصدق مولوی حاجی محمد عبیدالرحمٰن خاں شروانی کو میرے ذریعہ پیغام بھیجا۔ بالآخر یہ کتابخانہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں نئی لائبریری میں آگیا اور اس کی وجہ سے مولانا آزاد لائبریری کی اہمیت میں دوچند اضافہ ہوگیا۔ اس کتابخانہ کو حبیب گنج سے علی گڑھ منتقل کرانے میں راقم الحروف بھی ذاتی و صفاتی طور پر شریک رہا۔ اس کتابخانہ

کے انتقالِ مکانی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کے پیہم اصرار کو بھی بڑا دخل رہا۔ مرحوم خود حبیب گنج تشریف لے گئے۔ اور کتابخانہ کے نوادر سے متاثر ہوکر جلد سے جلد منتقل کرانے کے لئے سرگرم رہے۔

آغاز اِس لائبریری کی ابتدا بانیٔ درسگاہ سر سید احمد خاں اور اُن کے خلف الرشید سید محمود کی کتابوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ (قائم شدہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء) کے ایک کمرے میں ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ جب اسی سال "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے لارڈ لٹن وائسرائے ہند علی گڑھ آئے تو ان کی منظوری سے اِس کا نام "لٹن لائبریری" رکھا گیا۔ اور موجودہ سر سید ہال میں اسٹریچی ہال سے متصل ایک ہال اور پانچ کمروں پر مشتمل عمارت میں سنہ ۱۹۶۰ء تک اسی نام سے موسوم رہی۔

سر سید کی کتابوں میں مخطوطات بھی تھے۔ جن میں حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی سنہ ۷۵۰ھ کی تاریخ گزیدہ مصنفہ سنہ ۷۳۰ھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے سرورق پر سات مہریں ہیں۔ ایک مہر "تابع شرع محمد اسحاق ۱۰۵۲ھ" کی ہے۔ یہ نسخہ ابوالفیض فیضی فیاضی متوفی سنہ ۱۰۰۴ھ کی ملکیت میں رہا ہے۔ سرورق پر ان کی مہر اور دستخط بھی ہیں۔ اول و آخر اوراق پر "سید محمد" کی مہریں ہیں۔ یہ نسخہ باریک نستعلیق خط میں خوشخط لکھا ہوا ہے۔ ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے سالِ کتابت نہ معلوم ہو سکا۔ مصنف نے یہ کتاب لکھکر وزیر غیاث الدین بن رشید الدین صاحبِ جامع التواریخ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

سید محمود کی کتابوں میں القانون فی الطب اور کتاب النجاۃ بھی شامل تھے۔ جبار یک نسخ ٹائپ میں سنہ ۱۵۹۳ء کے مطبوعہ روم ہیں۔ پونے چار سو سال گذرنے پر بھی انکا کاغذ پائدار اور مضبوط ہے۔ یہ دونوں کتابیں مصنفہ بوعلی ابن سینا متوفی سنہ ۴۲۸ھ / سنہ ۱۰۳۶ء ہیں۔ اور لائبریری میں قدیم ترین مطبوعات ہیں۔

رفتارِ ترقی یہ لٹن لائبریری ۲۴ سال تک سنہ ۱۹۰۱ء تک آہستہ خرامی سے قدم فرسا

رہی یعنی اس کا اسٹاف تین افراد اور ذخیرۂ کتب ۱۰۰۵ کی تعداد تک پہنچ سکا تھا۔ ان کتابوں میں نصف سے زیادہ (۲۷۶۵) مشرقی علوم والسنہ کی کتابیں تھیں اس کے بعد یہ لائبریری ۱۹۶۰ء تک سست رفتاری پر گام زن رہی یعنی جب یہ پرانی عمارت سے منتقل ہوکر نئی عمارت میں آئی تو اس کا اسٹاف ۴۱ افراد پر مشتمل تھا اور کتابوں کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۱۸۲۰۱۶ تھی۔

انگریزی وغیرہ	عربی	فارسی	اردو	ہندی وسنسکرت	مخطوطات	
۱۱۵۰۲۹	۸۲۸۴	۵۵۰۰۵	۳۷۷۸۵	۶۴۱۹	۸۹۸۴	۱۸۲۰۱۶

"مولانا آزاد لائبریری" ہونے کے بعد ۱۹۶۱ء سے اس کتاب خانے نے تیز گامی اختیار کی۔ اس کا اندازہ اس رفتارِ ترقی سے ہوسکتا ہے کہ مالی سال ۱۹۷۱-۷۲ء کے خاتمہ پر ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو ۱۱ سال میں اس کے اسٹاف اور کتابوں کی تعداد علی الترتیب ۱۱۹ اور ۵۲۵۳۹۴ تھی۔ لٹن لائبریری نے ۴۸ سال میں جتنی ترقی کی تھی مولانا آزاد لائبریری نے ۱۱ سال میں اس سے سہ چند ترقی کی۔

۱۹۶۰-۶۱ء میں اہم ملازمین میں، عہدے داروں میں لائبریرین کے علاوہ، ایک اسسٹنٹ لائبریرین، ایک ریفرنس اسسٹنٹ اور دو لائبریری اسسٹنٹ تھے۔ اور منظور شدہ بجٹ ۶۹۶، ۹۵، ۱ تھا۔ ۷۱-۱۹۷۲ء میں یہ بجٹ (بزمانہ سید محمد حسین رضوی) ۵۰۴، ۸۷، ۹ پر پہنچ گیا۔ اسٹاف اور کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

اسٹاف

لائبریرین	۱	اسپی پروفیشنل اسسٹنٹ	۲۲	تھرڈ گریڈ	۳۶
ڈپٹی لائبریرین	۱	دفتری عہدے داران	۵	جلد ساز (مختلف گریڈ)	۱۳
اسسٹنٹ لائبریرین	۵	کلرک فرسٹ گریڈ	۴	خاکروب	۴
پروفیشنل اسسٹنٹ	۱۶	" سیکنڈ گریڈ	۱۲		

کتب

انگریزی	۳۱۸۴۶۵	سنسکرت	۴۲۸۰	پشتو	۳۷
اردو	۶۱۱۸۹	ملیالم	۱۹۰۵	مراٹھی	۷۹
عربی	۲۱۱۸۳	تلیگو	۱۷۶۵	بھاشا	۵
فارسی	۱۳۱۲۸	تامل	۳۱۰	بنگالی	۲
ہندی	۱۷۶۳۰	ترکی (مع رومن)	۲۹۱	مخطوطات	۱۳۲۸۱

سہولتِ مطالعہ | طلبہ و اساتذہ کے لئے خصوصاً اور دیگر مقامی و بیرونی دانشوروں کے لئے عموماً اس لائبریری میں تین بڑے ہال جنھیں کرسیوں، میزوں اور ہر ہال کے مناسب موزوں الماریوں میں کتابوں سے آراستہ کیا گیا ہے دارالمطالعہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ دو ہالوں کے بالائی حصوں میں ۲۰ کیبن بھی بنائے گئے ہیں جو ریسرچ اسکالروں کو الاٹ کر دئے جاتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ تنہائی میں سکون و یکسوئی سے رات تک کام کر سکتے ہیں۔ نیچے کے دونوں ہال بطور ریڈنگ روم علی العموم ۶ بجے شام تک اور امتحانات کے زمانے میں ۱۰ بجے رات تک کھلے رہتے ہیں جب کہ لائبریری ۱/۲ ۴ بجے شام بند ہو جاتی ہے۔ ان تینوں ہالوں کے علاوہ اورنٹیل ڈویژن، پریڈیکل سیکشن اور ہندی و سنسکرت سیکشن کے ہالوں میں بھی مطالعہ و ریسرچ کا انتظام ہے یہاں خاصی تعداد میں میزیں اور کرسیاں مطالعہ کرنے والوں کے لئے مہیا کر دی گئی ہیں۔ اور ضرورت مند برابر سرگرم مطالعہ رہتے ہیں۔

مشرقی شعبہ

اس لائبریری کا وقار و اہمیت اس کے مشرقی شعبے کی وجہ سے ہے۔ یہ شعبہ جو عربی، فارسی، اردو، بھاشا، ترکی اور پشتو پر مشتمل ہے تقریباً ایک لاکھ دس ہزار

کتابوں کا ذخیرۂ عظیم رکھتا ہے۔ اس کی تقسیم مطبوعات اور مخطوطات دو حصوں پر ہے دونوں حصّے اپنے نوادر و خصوصیات کی بنا پر دوسرے مشرقی کتاب خانوں سے بڑی حد تک ممتاز و مفتخر ہیں۔ یہ شعبہ زیادہ تر اکابرِ ملّت اور اربابِ علم و خیر کے عطیات کا رہینِ منت ہے۔ قابلِ ذکر معطیان میں حسب ذیل اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ ان حضرات نے جن میں اداروں کے ناظمین بھی شامل ہیں اپنی مادرِ درسگاہ (مسلم یونیورسٹی) کی لائبریری کو مزین کرنے کے ساتھ اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دینے کا بھی سروسامان کیا ہے۔

۱۔ سبحان اللہ کلکشن	عطیہ	مولوی سبحان اللہ خاں	رئیس گورکھپور
۲۔ منیر عالم "	"	شاہ منیر عالم	غازی پور
۳۔ سلیمان "	"	سر شاہ سلیمان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی و چیف جسٹس	الٰہ آباد
۴۔ احسن "	"	سید علی احسن	مارہرہ
۵۔ عبدالحیّ "	"	محمد مہدی انصاری فرنگی محل	لکھنؤ
۶۔ شیفتہ "	"	نواب محمد اسحاق خاں	جہانگیر آباد میرٹھ
۷۔ قطب الدین "	"	ابوالقاسم جج	اٹاوہ
۸۔ حبیب گنج "	"	مولوی حاجی محمد عبیدالرحمن خاں شروانی	علی گڑھ
۹۔ آفتاب "	"	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	"
۱۰۔ جواہر میوزیم "	"	اسلامیہ کالج	اٹاوہ

شعبۂ مطبوعات

مالی سال مختتم ۳۱ مارچ ۱۹۶۲ء کو مطبوعات مشرقیہ کی تعداد بہ تفصیل ذیل تھی۔

عربی	فارسی	اردو	بھاشا	ترکی	پشتو	
۲۱۱۸۳	۱۳۱۲۸	۶۱۱۸۹	۵	۳۹	۳۷	۹۵۵۸۱

ان مطبوعات میں ہر قسم کے نوادر آپ کو ملیں گے اور اکثر ایسی کتابیں بھی ملیں گی جن کا اب دستیاب ہونا ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہوگا۔ کچھ ایسی کتابوں کا تذکرہ جو قدیم مطبوعات کا درجہ رکھتی ہیں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

قدیم مطبوعات عربیہ

۱۔ القانون فی الطب — ابن سینا — مطبوعہ روم ۱۵۹۳ء

۲۔ کتاب النجاۃ — " — " " "

۳۔ مقامات الحریری مع ترجمہ لاطینی — الحریری — " ویشتلخ ۱۶۲۸ء

۴۔ انجیل یوحنا — " — " بٹاور ۱۶۵۴ء

۵۔ نظم الجوہر کتاب المجموع علی التحقیق والتصدیق — سعید ابن بطریق — " اکسونیا ۱۶۵۶ء

۶۔ التاریخ المشرقی — جان ہنریکو ہاتنگر — ... ۱۶۶۰ء

۷۔ بائبل عربی ولاطینی — ———— — " روم ۱۶۷۱ء

۸۔ العہد الجدید ووصایا اللہ العشر — ۱۷۲۷ء

۹۔ سیرۃ السلطان صلاح الدین الایوبی — بہاء الدین ابن شداد — " ہولنڈ ۱۷۳۲ء

۱۰۔ مورد اللطافۃ — جمال الدین تغری بردی — " لندن ۱۷۹۲ء

۱۱۔ شذور العقود فی ذکر النقود — المقریزی احمد بن علی — " " ۱۷۹۶ء

۱۲۔ ذکر فتح جزیرۃ ذودس — احمد بن عام الکوفی — " " ۱۷۹۷ء

۱۳۔ الف لیلۃ ولیلۃ — ———— — " لندن ۱۷۹۸ء

۱۴۔ بغیۃ الباحث عن جمل المواریث — ابن المتقنۃ — " " ۱۷۹۹ء

۱۵۔ التواریخ القدیمۃ من المختصر فی اخبار البشر — ابو الفداء — " لیبزک ۱۸۳۱ء

قدیم مطبوعات عربیہ ہند

۱۔ مجموعۃ الکتب المتداولۃ لدرس النحو — جان بیلی۔ المرتب — " کلکتہ ۱۸۰۵ء

کتاب	مصنف		مقام	سنہ
۲۔ نفحۃ الیمن	احمد الشروانی الیمنی	مطبوعہ	کلکتہ	۱۸۱۱ء
۳۔ رسالہ من رسائل اخوان الصفا	———	"	"	۱۸۱۲ء
۴۔ البراہین الساباطیۃ	جواد ساباط	"	"	۱۸۱۳ء
۵۔ دیوان المتنبی	المتنبی	"	"	۱۸۱۴ء
۶۔ القطبی	قطب الدین الرازی	"	"	۱۸۱۵ء
۷۔ الفوائد الضیائیۃ	عبد الرحمن الجامی	"	"	۱۸۱۷ء
۸۔ شرح السبع المعلقات	عبد الرحیم	"	"	۱۸۱۷ء
۹۔ سورۃ یٰس	———	"	لکھنؤ	۱۸۲۰ء
۱۰۔ السور الخمس الشریفۃ	———	"	لکھنؤ	۱۸۲۰ء
۱۱۔ حل ابیات واحادیث وآیات الفوائد الضیائیۃ	عبد الرحیم	"	کلکتہ	۱۸۲۰ء
۱۲۔ الاشباہ والنظائر	ابن نجیم	"	"	۱۸۲۶ء
۱۳۔ البہجۃ المرضیۃ شرح الالفیۃ	السیوطی	"	کلکتہ	۱۸۳۱ء
۱۴۔ عنوان الشرف	شرف الدین اسماعیل الیمنی	"	لکھنؤ	۱۸۴۰ء

مطبوعات قدیمہ فارسیہ

کتاب	مصنف		مقام	سنہ
۱۔ گلستان با ترجمہ لاطینی	سعدی شیرازی		CLEMTUS	۱۶۰۱ء
۲۔ تذکیر سلاطین ایران بعد الاسلام با مقدمہ و ترجمہ بزبان لاطینی	میر خواند ہروی	"	وائنا	۱۷۸۲ء
۳۔ توزکات تیمور	ابو طالب حسینی مترجم	"	اوکسفورڈ	۱۷۸۳ء
۴۔ تذکیر سلاطین ایران بعد الاسلام با مقدمہ و ترجمہ بزبان لاطینی	میر خواند ہروی	"	غوتنجن	۱۸۱۸ء
۵۔ کتاب زبور	ولیم گلن ۔ مترجم	"	لندن	۱۸۲۵ء
۶۔ کتاب المقدس توریت	تومس کنسٹبل ۔	"	ادنبرغ	۱۸۴۵ء

قدیم مطبوعات فارسیۂ ہند

۱۔کشف اللغات	دو جلد	عالم ہمت با ستصلاح جوزت	مطبوعہ	کلکتہ	۱۸۰۶ء
۲۔ہدایہ	چار جلد	غلام یحییٰ خاں ۔مترجم	〃	〃	۱۸۰۷ء
۳۔شاہنامہ فردوسی		فردوسی	〃	〃	۱۸۱۱ء
۴۔ فرائض سراجیہ		———	〃	〃	〃
۵۔ محامد حیدریہ		محمد صادق اختر	〃	لکھنؤ	۱۸۲۰ء
۶۔گلدستۂ نشاط		منولال۔مرتب	〃	کلکتہ	۱۸۳۶ء
۷۔سیر المتاخرین		غلام حسین طباطبائی	〃	〃	〃
۸۔ دیوان زخمی		رتن سنگھ زخمی	〃	لکھنؤ	۱۸۳۷ء
۹۔نزہتہ الناظرین		کندن لال اشکی الٰہی	〃	〃	۱۸۳۹ء
۱۰۔جام جم		سر سید احمد خاں	〃	اکبرآباد	۱۸۴۰ء
۱۱۔حدائق النجوم		رتن سنگھ زخمی	〃	لکھنؤ	〃
۱۲۔نفائس اللغات		اوحد الدین بلگرامی	〃	〃	۱۸۴۱ء
۱۳۔شرح گل کشتی		رتن سنگھ زخمی	〃	〃	۱۸۴۲ء
۱۴۔دستور محبت		لچھمی نرائن	〃	〃	۱۸۴۳ء
۱۵۔ مفردات اہلیہ		فرید الدین مرادآبادی	〃	اکبرآباد	۱۸۴۷ء
۱۶۔انشائے مادھورام		مادھورام	〃	لکھنؤ	〃
۱۷۔مرآۃ الخیال		شیر خاں	〃	عمدۃ الاخبار	۱۸۴۸ء
۱۸۔کلیات فرد		ابوالحسن النعمتی پھلواروی	〃	کلکتہ	۱۸۵۱ء
۱۹۔مہر نیم روز		اسد اللہ خاں غالب	〃	دہلی	۱۸۵۴ء
۲۰۔تضمین گلستان سعدی		ہر گوپال تفتہ	〃	نولکشور	۱۸۵۷ء

مندرجہ بالا فارسی مطبوعات ہند ۱۸۵۵ء تک لئے گئے ہیں۔ انیسویں صدی کے مطبوعات کی طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے، کچھ ہندو مصنفین کی تصنیفات بھی ان میں شامل ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ برادرانِ وطن نے گزشتہ تین صدیوں میں فارسی زبان و ادب کی کیا خدمات کی ہیں۔

مطبوعاتِ اُردو

کتاب	مصنف / مترجم		مطبع	سنہ
۱۔ اخلاق ہندی ترجمہ مفرح القلوب	میر بہادر علی حسینی	مترجم	مطبوعہ کلکتہ	۱۸۰۳ء
۲۔ ستہ شمسیہ	محمد فخرالدین خاں	،،	،، حیدرآباد دکن	۱۸۴۰ء
۳۔ تاریخ ابوالفداء	کریم الدین	،،	،، دہلی	۱۸۴۷ء
۴۔ آثار الصنادید	سرسید احمد خاں		،، ،،	،،
۵۔ اصول قواعد مایعات	پنڈت اجودھیا پرشاد	،،	،، ،،	۱۸۵۰ء
۶۔ زبدۃ التواریخ	عالم علی		،، کلکتہ	۱۸۵۳ء
۷۔ اسباب بغاوتِ ہند	سرسید احمد خاں		،، آگرہ	۱۸۵۹ء
۸۔ یونان کے قدیم زمانے کی تاریخ	سینٹیفک سوسائٹی	،،	،، علی گڑھ	۱۸۶۵ء
۹۔ تزک جہانگیری	سید احمد علی	،،	،، کان پور	۱۸۷۱ء
۱۰۔ نگارستانِ الفت	صفدر علی خاں		،، رام پور	۱۸۷۸ء
۱۱۔ بزمِ سخن	علی حسن خاں		،، آگرہ	۱۸۸۰ء
۱۲۔ تذکرہ آثار الشعراء	ممتاز علی		،، بھوپال	۱۸۸۶ء
۱۳۔ منشور سخن	میر اعظم علی ربطؔ		،، آگرہ	۱۸۸۸ء
۱۴۔ صدق البیان	شاہجہاں بیگم		،، ،،	۱۸۹۳ء
۱۵۔ حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالیؔ		،، کانپور	۱۹۰۱ء
۱۶۔ اسبابِ بغاوتِ ہند	سرسید احمد خاں		،، ،،	،،
۱۷۔ ،،	،،		،، آگرہ	۱۹۰۳ء

کتب مشتمل بر صنائع مختلفہ

لائبریری میں مختلف صنائع پر مشتمل کتابوں کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ چند صنائع کا بطور نمونہ ذکر کیا جاتا ہے۔

صنعت غیر منقوطہ | عربی و فارسی کی مندرجہ ذیل چھ کتابیں پیش خدمت ہیں۔ ہر کتاب کے سامنے تعدادِ صفحات بھی دے دی گئی ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ صنعت گروں نے اپنی صنعت میں کتنی عرق ریزی کی ہے۔

صفحات

۱۔ موارد الکلم (عربی) فیضی، ابو الفیض متوفی ۱۰۰۴ھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۵ء ۱۴۸

۲۔ سواطع الالہام (تفسیر قرآن) " " " " " " لکھنؤ ۱۸۷۳ء ۷۸۰

۳۔ اُسس الاصول " محمد الکرمانی " ایران ۱۹۰۱ء ۲۵۸

۴۔ دیوان جامی (فارسی) مادح، عبدالرحمن جامی متوفی ۸۹۱ھ " لکھنؤ ۱۸۸۴ء ۸۶

۵۔ انشائے بے نقط " نادان، کامتا پرشاد " " " ۱۲

۶۔ سحر حلال ـــــ حاذق، غلام حضرت خاں رام پوری " رام پور ۱۹۰۵ء ۴۲

صناعۃ التربیع

۷۔ السور الخمس الشریفۃ (عربی) ـــــــــ " لکھنؤ ۱۸۲۰ء ۵۵

یہ مجموعہ، غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی ہدایت پر ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں مطبع سلطانی میں چھاپا گیا۔ یہ پانچ سورتوں (یٰس، الفتح، الواقعۃ، الملک، النباء) پر مشتمل ہے۔ اس میں چار جدولیں ہیں۔ تقریباً ہر درمیانی جدول کی ابتداء و انتہاء ایسے حروف پر ہے جو کھڑے لکھے جاتے ہیں مثلاً و، ل، م اور یہ حروف جداول کا حصہ بن جاتے ہیں۔

صنعت فنیہ

صفحات

۸۔ عنوان الشرف (عربی) شرف الدین اسماعیل الیمنی المتوفی ۸۳۷ھ مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء ۱۱۶

مصنف نے عجیب فنی صنعت میں یہ کتاب مرتب کی ہے۔ مسلسل پڑھی جائے تو علم فقہ کا رسالہ ہے۔ پہلی جدول میں فن عروض، دوسری میں تاریخ، تیسری میں نحو اور چوتھی جدول میں فن قافیہ۔ اس طرح یہ کتاب پانچ فنون کے رسائل پر مشتمل ہے۔

			صفحات
۹۔ پنج گنج خسروی (فارسی)	دلیر چھپرا موی	مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء	۲۸

اس رسالہ میں مصنف نے بڑی صنعت رکھی ہے۔ مسلسل بلا لحاظ جداول پڑھا جائے تو نثر میں قصہ عشق و محبت ہے جس میں طائر ہنس کی مدد سے کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ پہلی جدول سے لے کر چوتھی جدول تک مختلف بحور و قوافی میں متفاوت عاشقانہ مثنویاں ہیں۔ مندرجہ بالا عربی کتاب میں بھی یہی صنعت ہے مگر اس میں نثر ہی میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس رسالۂ فارسی میں نثر و نظم دونوں کو سمو دیا گیا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔

غیر مسلم مصنفین کی فارسی تصانیف

برادرانِ وطن خصوصاً ہندو شعراء و ادباء نے اردو ادب میں جو چار چاند لگائے وہ اہلِ علم و ادب سے پوشیدہ نہیں۔ اس دورِ قحط الرجال میں بھی ہمارے ملک میں ہزاروں ایسے ہندو ادیب نظر آتے ہیں جو برابر اردو ادب کی بقا و ترقی میں سرگرم کار ہیں۔

فارسی زبان و ادب کی ان برادرانِ وطن نے بیسویں صدی کے اوائل تک جو غیر فانی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست سے ہو سکے گا۔ یہ وہ تصانیف ہیں جو مولانا آزاد لائبریری کے فارسی سیکشن میں موجود ہیں۔ یہ فہرست احصائی نہیں بلکہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔

نثر

۱۔ مخزن العلوم	برجموہن	مطبوعہ ۱۸۷۳ء

۲۔ پر بودہ چندر اودی ناٹک	بنوالی جی دلّی	مطبوعہ ۱۸۷۷ء
۳۔ عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت	بخت سنگھ	" ۱۸۷۹ء
۴۔ سوانح عمری	چرنجی لال	" ۱۸۵۹ء
۵۔ کشائش نامہ	راجکرن	" ۱۸۷۰ء
۶۔ شش جہت	روپ نرائن	" ۱۸۵۴ء
۷۔ گلشنِ رنگین	سندر لال	" ۱۸۵۲ء
۸۔ تحفۃ العجائب	کنج بہاری لال	" ۱۸۵۱ء
۹۔ منشآت	راجہ امرت لال	" ۱۸۹۱ء
۱۰۔ انشائے راحت جان	جے سکھ رائے	" ۱۸۷۹ء
۱۱۔ صفات کائنات	وارستہ، حضر کوٹی مل	" ۱۸۷۸ء
۱۲۔ مطلع السعدین	" "	" ۱۸۷۹ء
۱۳۔ نگار دانش	نول کشور	" ۱۸۸۴ء
۱۴۔ منشآت خاندان جواہر مل خطاط	اننت چند داؤ ونگری	" ۱۸۷۸ء
۱۵۔ انشائے تمیز	تمیز، کالے رائے	" ۱۸۷۶ء
۱۶۔ انشائے دولت رام	دولت رائے	" ۱۸۷۵ء
۱۷۔ ارمغانِ بے بہا	دین دیال	" ۱۸۷۲ء
۱۸۔ چہار چمن موسوم بہ انشائے بہاریہ	رگھبر دیال	"
۱۹۔ خلاصۃ الآداب	فتح چند	" ۱۸۶۵ء
۲۰۔ انشائے بے نقاط	نادان، کامتا پرشاد	" ۱۸۷۲ء
۲۱۔ انشائے مفید	لچھمی رام	"
۲۲۔ رقعات	لچھمی نرائن	" ۱۸۷۵ء

۲۳۔ انشائے مادھورام	مادھورام	مطبوعہ	۱۸۴۷ء
۲۴۔ انشائے ہرسہائے	ہرسہائے	"	۱۸۸۲ء
۲۵۔ خیالات نادر	ہرنرائن	"	"
۲۶۔ انشائے لطیف	ہیرالال عرف ہری کرشن	"	۱۸۷۹ء
۲۷۔ چمنستان	مخلص، انندرام	"	
۲۸۔ حدائق النجوم	زخمی، رتن سنگھ	"	۱۸۴۰ء
۲۹۔ آصف جاہی یعنی نصاب فارسی	آنند ناتھ	"	۱۹۴۱ء
۳۰۔ کلیات	گویا، بھائی نندلال	"	۱۹۶۳ء
۳۱۔ گوہر دانش	ہرمزجی (پارسی)	"	۱۹۰۱ء
۳۲۔ خیالات شیدا	شیدا، امرناتھ	"	۱۸۸۰ء
۳۳۔ دوست داران وطن	اجے سنگھ لاہوری	"	۱۳۳۰ش
۳۴۔ نزہتہ الناظرین	اشکی الہٰی، کندن لال	"	۱۸۳۹ء
۳۵۔ بوستان اودھ	درگا پرشاد	"	۱۸۹۲ء
۳۶۔ گلستان ہند	"	"	۱۸۹۷ء
۳۷۔ خلاصۃ التواریخ	سجان رائے بھنڈاری	"	۱۹۱۸ء
۳۸۔ تاریخ ظفرہ	گردھاری لال	"	
۳۹۔ تاریخ یادگار	مکھن لال	"	
۴۰۔ رسالہ دربار آصفیہ	منسارام	"	۱۸۹۰ء
۴۱۔ وقائع عالم شاہی	فراقی، پریم کشور	"	۱۹۴۹ء
۴۲۔ مرآۃ دولت عباسیہ	دولت رائے	"	۱۸۵۰ء
۴۳۔ بساط الغنائم	شفیق، لچھمی نرائن	"	۱۳۱۴ف

کتاب	مصنف / مؤلف		سنہ
۴۴ - مجموعۂ مکاتیب	گنگا دھر مجموعہ دار	مطبوعہ	
۴۵ - رامائن امر پرکاش	امر سنگھ	〃	۱۸۷۷ء
۴۶ - متاکشرا	وگیانیشور	〃	۱۸۷۹ء
۴۷ - تحفۃ الاسلام	اندرمن	〃	
۴۸ - گاتھا	پورداؤد (پارسی) مترجم	〃	
۴۹ - اوستا	〃	〃 〃	〃
۵۰ - راہنمائے سنسکرت	اینڈو شیکر	〃	۱۳۳۰ش
۵۱ - پرشین سانسکرت گرامر	کہنن راجہ	〃	۱۹۵۳ء
۵۲ - بہار ابطال ضرورت	بہار، ٹیکچند	〃	۱۸۵۱ء
۵۳ - بہار عجم	〃	〃	۱۸۹۴ء
۵۴ - دریائے عقل	گنگا پرشاد	〃	۱۸۷۷ء
۵۵ - جواہر الحروف	بہار، ٹیکچند	〃	۱۸۵۰ء
۵۶ - مفتاح اللغات	رام نرائن	〃	۱۸۶۹ء
۵۷ - مصباح العلم	لعل بہادر	〃	۱۸۷۹ء
۵۸ - جواہر منظومہ	دولت رائے	〃	۱۸۷۸ء
۵۹ - مرآۃ الصرف	〃	〃	〃
۶۰ - مخزن اخلاق	درگا پرشاد	〃	۱۸۹۹ء
۶۱ - می باید پسندید	رائے چند	〃	۱۸۹۷ء
۶۲ - نازک خیالات یعنی ترجمۂ آتم بلاس شنکر اچارج	منسا رام خوشابی	〃	۱۹۰۲ء
۶۳ - منتخب المصادر	سنت پرشاد	〃	۱۸۶۸ء
۶۴ - منتخب تنقیح الاخبار	کندن لال - راجہ بہادر	〃	۱۸۵۰ء
۶۵ - شرح گل کشتی	زخمی، رتن سنگھ	〃	۱۸۴۲ء

(نظم)

۱۔ بہارستان	بہار، ٹیک چند	مطبوعہ	۱۸۸۳ء
۲۔ دیوان الفتی	الفتی، پیارے لال	"	۱۸۷۰ء
۳۔ دیوانِ انور	انور، کالکا پرشاد	"	۱۸۹۵ء
۴۔ دیوانِ آتش	آتش، لال چند	"	۱۸۵۲ء
۵۔ خیال بے خودی	بیخود، سیتل سنگھ	"	۱۸۷۱ء
۶۔ دیوان تفتہ	تفتہ، ہرگوپال	"	۱۸۵۷ء
۷۔ مطلع خورشید	جوہر، جواہر سنگھ	"	۱۸۶۰ء
۸۔ دیوان ضمیر	ضمیر، نرائن داس	"	۱۸۹۰ء
۹۔ دیوانِ مائل	مائل، چُنی لال	"	۱۸۸۹ء
۱۰۔ دیوانِ موزون	موزوں، راجہ رام نرائن	"	۱۸۷۱ء
۱۱۔ دیوانِ وقار	وقار، جوالا پرشاد	"	۱۸۵۱ء
۱۲۔ قصائد پُر فوائد	بہجت، نتھن لال	"	۱۸۷۴ء
۱۳۔ برتری ہری ستک مول	گھنشیام سنگھ	"	
۱۴۔ دیوان زخمی	زخمی، رتن سنگھ	"	۱۸۳۷ء
۱۵۔ دیوان گویا	گویا، بھائی نند لال	"	
۱۶۔ راماین	امانت رائے	"	۱۸۷۱ء
۱۷۔ سری بھاگوت	"	"	۱۸۵۵ء
۱۸۔ مناجات ہفت پیکر	اوماں پرشاد	"	۱۸۹۵ء
۱۹۔ ریاض بہار آگیں (سوداماں چرتر)	بخشی رام	"	۱۸۸۳ء

۲۰۔ سنبلستان	تفتہ، ہرگوپال	مطبوعہ ۱۸۶۰ء
۲۱۔ مظہر الحسن	شاد، سری کرشن	″
۲۲۔ رامائن رام چرتر	گوپی ناتھ	″
۲۳۔ دستور محبت	لچھمی نرائن	″ ۱۸۴۳ء
۲۴۔ گوہر عرفان فروغ	فروغ، بدری کرشن	″ ۱۹۲۱ء
۲۵۔ دیوان نانک شاہ	نانک شاہ	″ ۱۹۳۵ء
۲۶۔ اختراع جدید	وقار، رائے کشن کمار	″ ۱۸۷۷ء
۲۷۔ رامائن	ہرلبھ، سیٹھ	″ ۱۹۰۲ء
۲۸۔ ظفرنامہ رنجیت سنگھ	ہندی، کنھیا لال	″ ۱۸۷۶ء
۲۹۔ یادگار ہندی	″	″ ۱۸۷۳ء
۳۰۔ تضمین گلستان سعدی	تفتہ، ہرگوپال	″ ۱۸۵۷ء
۳۱۔ ترجیع بند	خود رفتہ، بہاری لال	″ ۱۸۸۱ء
۳۲۔ نوحۂ وفات و مسدس شہر آشوب	فروغ، بدری کرشن	″ ۱۸۹۸ء
۳۳۔ بندگی نامہ	ہندی، کنھیا لال	″ ۱۸۷۸ء
۳۴۔ گلدستۂ نشاط	منولال ۔ مرتب	″ ۱۸۳۶ء
۳۵۔ حدیقۂ عشرت	درگا پرشاد	″ ۱۸۹۸ء
۳۶۔ سفینۂ ہندی	ہندی، کنھیا لال	″ ۱۹۵۸ء
۳۷۔ سفینۂ خوشگو	خوشگو، بندرابن داس	″ ۱۹۵۹ء
۳۸۔ ایمان شاد	شاد، سرکشن پرشاد	″
۳۹۔ مثنوی آئینۂ وجود	″	″ ۱۹۱۹ء

مشرقی شعبۂ مطبوعات میں اکثر کتابوں کے مختلف و متعدد ایڈیشن لائبریری میں موجود

ہیں جس سے ریسیرچ اسکالروں کو اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملتی ہے اور شعبۂ مخطوطات میں کسی مخطوطہ پر کام کرنے والے دانشوروں کو بھی شعبۂ مطبوعات سے استفادہ ناگزیر رہتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں شعبے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شعبۂ مخطوطات

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس لائبریری کی ابتدار بانی درسگاہ سرسید احمد خاں اور ان کے خلف الرشید جسٹس سید محمود کی کتابوں سے ہوئی اور جیسے مختلف اربابِ دانش اور اہلِ علم کے عطیات کا اضافہ ہوا تو مشرقی و مغربی شعبوں کی تقسیم ناگزیر ہوئی پھر جب قلمی نسخوں کی بہتات ہوئی تو مشرقی شعبے کو مطبوعات و مخطوطات دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ اب مطبوعات کا حصہ اورنٹیل ڈویژن اور مخطوطات حصہ مینوسکرپٹس ڈویژن کہلاتا ہے۔ دونوں کا اسٹاف اور محل وقوع علیحدہ ہے۔ باہمی ربط قائم رکھنے کے لئے آخرالذکر ڈویژن کا اسسٹنٹ لائبریرین ہی اول الذکر ڈویژن کا انچارج بھی ہے۔ دونوں شعبوں میں تقریبًا ایک لاکھ دس ہزار مطبوعات و مخطوطات ہیں۔

شعبۂ مخطوطات اس وقت گیارہ کلکشنوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یونیورسٹی کلکشن
۲۔ سبحان اللہ ،،
۳۔ عبدالسلام ،،
۴۔ شیفتہ ،،
۵۔ منیر عالم ،،
۶۔ سر سلیمان ،،
۷۔ احسن کلکشن
۸۔ آفتاب ،،
۹۔ جواہر میوزیم ،،
۱۰۔ فرنگی محل ،،
۱۱۔ حبیب گنج ،،

ان سبھی کلکشنوں پر نظر ڈالنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اگر ان کے نوادر و خصائص کو قلمبند کیا جائے تو مستقل ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ حتی الوسع ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے قابلِ ذکر گوشوں پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔

قرآن مجید

لائبریری میں مطبوعات و مخطوطات قرآن پاک کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ مخطوطہ قرآنوں کی تعداد ۱۹۰ ہے، تقریباً ہر نسخہ خصوصیات کا حامل ہے۔ چند نسخوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن شریف مترجم فارسی۔ تقطیع کلاں، طول ۲۴ انچ، عرض ۱۴½ انچ۔ کاغذ کشمیری، بخط کشمیری۔ بین السطور ترجمہ فارسی، شنگرفی، برحاشیہ تفسیر حسینی، دو دو صفحات اول و آخر و ابتدا، ہر منزل مطلا، لاجوردی رنگ آمیزی، جداول مطلا و لاجوردی مع شنگرفی، اسما سور و حوصنہ مطلا، خط گوشہ لاجورد۔ در آخر تفسیر نوشتہ سید محمد مختار ـــــ ۲۵ ر جمادی الآخر ۱۲۸۲ھ

۲۔ قرآن مجید۔ بخط اورنگ زیب عالمگیر بادشاہِ ہند۔ خوشخط بخط نسخ۔ ورق آخر کی پشت پر ۱۰۸۶ھ مرقوم ہے لیکن خود عالمگیر کی مندرجہ ذیل عبارت تاریخ کتابت کی نفی کرتی ہے:۔

"من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام نام ننوشتہ ام، تاریخ ہم نوشتن در کار نیست، اگر چہ برائے او سبحانہ نوشتہ اند علم و حسبی و یکفی" (کلمات طیبات عالمگیر (۴) ۳۲۲/۹۲ عبدالسلام)

۳۔ قرآن مجید۔ تقطیع کلاں مطلا مجدول۔ مترجم فارسی بہت ہی باریک کام بنایا گیا ہے جو بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ کاتب مولانا عبدالرحمن احمد آبادی کے شاگرد ہیں جو اکبر شاہ کے معاصر تھے۔

۴ - قرآن مجید - با صنعتِ تقابل حروف - مترجم فارسی، ترجمہ سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے - خاص صنعت کتابت یہ ہے کہ ہر صفحہ میں طاق سطریں ہیں اور درمیانی سطر کو اس کی بالائی و تحتی سطروں کی حدِ فاصل قرار دے کر ان کو جفت کر دیا ہے اور ان تمام سطروں کے اول حروف میں اس طرح کی یکسانیت رکھی ہے کہ جو حرف اول سطر کے شروع میں ہے وہی حرف صفحہ کی آخری سطر کی ابتداء میں ہے اور جو دوسری سطر میں اول حرف ہے وہی آخر کی دوسری سطر میں ہے - اس طرح تمام سطروں میں اس صنعت کا التزام ہے -

۵ - قرآن شریف - بخط ثلث - یہ نسخہ ۱۰۹۰ھ میں ہرات سے اورنگ زیب کے لئے ہدیہ بھیجا گیا -

۶ - قرآن مجید - سی درقی - ابتدائی دو سورتوں کے عنوان مطلاّ و منقش، جدول طلائی علامات آیات مطلاّ - یہ نسخہ بھی اورنگ زیب عالمگیر کو ہدیہ کیا گیا، آخر میں ان کی مہر ثبت ہے - اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر پارہ ایک ورق پر ہے اور پاروں کے اختلاف حجم کے باوجود خط کی یکسانیت میں فرق نہیں آیا ہے - سورۂ فاتحہ وابتدائی صفحہ سورۂ بقرہ برنگ سفید -

۷ - قرآن شریف - مکتوبہ عبدالباقی حداد ۱۱۳۰ھ، مطلاّ و منقش، نہایت خوشخط بخط نسخ

۸ - " " مرصع و مذہب - بخط نسخ نہایت اعلیٰ، ہر سورہ کا عنوان مطلا -

۹ - " " صرف سورہ فاتحہ و سورہ بقرہ، بخط کوفی خوشخط، مکتوبہ بر چرم آہو - قدیم و نادر -

۱۰ - حمائل شریف - جداول و علامات آیات مطلا، بین السطور کی لکیریں زرّیں، حاشیہ پر مابین سیاہ خطوط نقوش زرّیں - ہر سورہ کا عنوان مطلا، نام سورہ برنگ سفید، خوشخط بخط ایران - عنوان اور ساتوں منزلوں پر نہایت عمدہ صنعت کی گئی ہے - بخط نسخ نہایت اعلیٰ نسخہ، خصوصی صفحات پر ناخن سے اُبھارے ہوئے پھولوں کی رنگ آمیزی -

۱۱ - قرآن شریف - مطلا و مرصع و منقش، بین السطور ترجمہ فارسی برنگ سرخ، برحاشیہ تفسیر بخط نستعلیق شکستہ آمیز - ابتدائی ورق اور آخری دو اوراق نہایت دیدہ زیب،

خصوصی صفحات کی جداول مرصّع و منقش۔ ابتداء میں چند اوراق پر ہر سورہ کے فوائد و خواص و تعداد حروف وغیرہ۔ آخر میں تین صفحات پر فالنامہ حروف، منظوم بزبان فارسی، بر ورق سادہ مہر مکتب خورد " محمد عبدالرحیم ۱۳۰۹ھ "

۱۲۔ قرآن شریف۔ مکتوبہ ۱۲۸۳ھ۔ بر حوالی متون و بر حواشی، تفسیر عربی۔ بر ورق اول یک مہر مربع و دو مہر مدوّر و مہر سہ غیر صاف۔

۱۳۔ پنجسورہ۔ لوح و جداول و خطوط بین السطور مطلا، حواشی منقش و مطلا، نہایت خوشخط بخط نسخ۔ مکتوبہ محمد طاہر بن شیخ عبداللہ احمد آبادی ۱۰۸۰ھ۔ بر ورق آخر یک مہر مدوّر " قابل خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ " و دو مہر بیضوی " نیکنام خاں مشاق خاں " و " محی الدین علی خاں " شاہی کتاب خانہ میں داخل رہا ہے۔

۱۴۔ قرآن شریف۔ نہایت خوشخط بخط نسخ۔ جداول و علامات آیات و خطوط سطور مطلا، عنوان ہائے سور برنگ سفید، مکتوبہ ۱۲۱۱ھ

۱۵۔ طومار بخط غبار۔ یہ ۱۸ فٹ ۳ انچ طویل اور ۳ انچ عریض کاغذی پگڑی ہے جس کے نیچے کپڑا لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ تعوذ و تسمیہ، نصر من اللہ و فتح قریبا اور کلمات درود کے ہر حرف و نقطہ و جملہ میں پورا قرآن پاک بخط غبار لکھا گیا ہے۔

۱۶۔ قرآن شریف بخطِ غبار بشکل کتبہ۔ یہ کتبہ پارچہ مومی پر قرآن پاک کی سات منزلوں میں سے چار منزلوں پر بخط غبار مشتمل ہے۔ سر کتبہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا طغرا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت:۔

" حضرت قطب شیخ فرید صاحب گنج شکر قدس اللہ سرہٗ "

میں ابتدائی چار منزلیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کتبہ کا طول ۴ فٹ ایک انچ اور عرض دو فٹ پانچ انچ ہے۔ نیچے یہ عبارت درج ہے:۔

" از سید شوکت حسن خفی رقم امروہوی ۱۳۲۶ھ "

۱۷۔ قرآن پاک۔ بشکل صدری۔ یعنی القمیص المجوش المصحف لحرز الملوک والابطال فی الحروب والمعارک۔ یہ صدری خفی خط نسخ میں پورے قرآن پر مشتمل ہے۔ اس کا گلا اور دامن بڑے خوشنما طرز پر بنایا گیا ہے نیلے اور سرخ رنگ نے خوشنمائی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ پوری صدری مرصع ہے۔ یہ بڑی نادر اور نایاب چیز ہے۔ طول دو فٹ ۲ انچ، عرض ایک فٹ ۹ ½ انچ، آستین طول و عرض دس انچ۔

سر راس مسعود (نبیرۂ بانی درسگاہ سرسید احمد خاں) نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں دورۂ یورپ کے موقعہ پر اپنے دوست لارڈ لوتھین کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں یہ تحفہ حاصل کیا۔ (ریکارڈ رجسٹرار آفس)

قرآن شریف کا تحفہ

یوپی گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ لارڈ لوتھین کے ایک دوست نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ایک قبا نذر کیا۔ جس پر تمام قرآن شریف لکھا ہوا ہے۔ یہ غلاف ۱۸۵۷ء کے زمانے میں کوئی افسر انگلستان لے گیا تھا اب پھر مسلمانوں کو واپس دے دیا گیا۔

(ہفت روزہ ایمان۔ سیرت کمیٹی پٹی لاہور۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء)

(بحوالہ ہفتہ وار المنیر لائل پور۔ پاکستان۔ جلد ۱۳ شمارہ ۲۰ و ۲۱ مورخہ ۳ و ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

ادعیہ | ۱۔ دلائل الخیرات۔ مؤلفہ محمد بن سلیمان الجزولی المتوفی ۸۷۰ھ۔ نہایت خوشخط نسخہ بخط نسخ

۲۔ جوشن صغیر و کبیر۔ بخط نسخ نہایت اعلیٰ نسخہ۔ مکتوبہ قاسم الداعوی ۹۸۳ھ، اول چار اوراق تمام مرصع، بین السطور و حواشی مزین بہ گلکاری طلا تمام عنوان، مرقومہ برنگ سفید۔

۳۔ ادعیہ۔ بخط نسخ مکتوبہ باقی محمد ۱۰۶۲ھ۔

قدیم نسخے

عربی | ۱۔ قرآن شریف (سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ) برچرم آہو، معریٰ از نقاط و اعراب۔

بخط کوفی مطلا و منقش و خوشخط۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

۲۔ عیون الاجوبہ فی فنون الاسئلہ۔ تصنیف ابوالقاسم عبدالکریم القشیری المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء بخط المصنف پانچویں صدی ہجری کی تصنیف و ترقیم۔

۳۔ نہج البلاغہ۔ مرتبہ الشریف الرضی المتوفی ۴۰۶ھ/۱۰۱۶ء۔ دو جلد، مکتوبہ ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء۔ کاتب علی بن ابی القاسم بن علی چھٹی صدی ہجری کے ربع ثانی میں اس کی کتابت کا اختتام اسی سال ہوا ہے جس سال کاتب نے حج کیا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کی دو عظیم یادگاریں اس سال سے وابستہ ہیں

یہ نسخہ مختلف کتاب خانوں کی زینت رہا ہے۔ دونوں جلدوں کے اول و آخر اوراق پر گیارہ تحریریں ہیں۔ تین پر ۱۰۲۴ھ، ۱۱۸۴ھ، ۱۲۵۷ھ تاریخ پڑی ہے سات تحریروں کے ساتھ دستخط بھی ہیں۔ ۱۶ مہریں ہیں، ۵ محکوک ہیں ۴ مربع مہریں "سید ابوجعفر باسطی" کی ہیں، ایک مربع مہر "سید محمد عباس الموسوی ۱۲۵۲ھ" کی ہے اور چھ مکعب و مدور مہریں "الواثق بالملک التعالی عبدہ مبارک بن عبداللہ العالی الاوالی" کی ہیں۔ اس کا مقابلہ الادیب افضل الدین الحسن کے ذاتی نسخہ سے ہوا ہے۔

۴۔ صحاح الجوہری۔ تالیف ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری المتوفی ۳۹۶ھ۔ بخط نسخ، مکتوبہ ۶۴۳ھ روشنائی شیر خرما۔ یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول کے سرورق پر کچھ تحریریں اور مہریں ہیں۔ اکثر تحریریں مٹا دی گئی ہیں، باقی ماندہ تحریروں میں اہم تحریر محمود بن احمد بن مسعود القونوی المتوفی ۷۷۱ھ کی ہے۔ عبارت یہ ہے :-

"من کتب العبد الفقیر الی اللہ الغنی محمود بن احمد بن مسعود القونوی الحنفی متہ اللہ بہ"

صمصام الملک کی مہر بھی ہے۔ سید نورالحسن نادر کی بھی تحریر اور مہر ہے "نور چشم اصفیا نادر حسن" ایک مہر "قائم در اللہ" بھی ہے۔ دوسری جلد کے آخر میں یہ عبارت ہے "بلغ مقابلۃ بخط ابن الجوالیقی"

۵۔ شرح سبعہ معلقہ۔ تالیف ابوعبداللہ الحسین بن احمد الزوزنی المتوفی ۴۸۶ھ۔ کاتب ابوالعلا بن ابی الفوارس القطروی۔ مکتوبہ ۶۳۶ھ۔ بخط بہاری۔ ورق اول پر مہر بیضوی "محمد یوسف" ابتدائی ۸ ورق محمد اوسف الحسینی بن میر عبدالجلیل بلگرامی کے لکھے ہوتے ہیں مورخہ ۵ ہم ۱۱ ھ۔

۶۔ اختیار دواوین المتنبی والبحتری وابی تمام۔ تالیف عبدالقاہر الجرجانی المتوفی ۴۷۱ھ۔ کاتب ابوالعلا بن ابی الفوارس القطروی۔ مکتوبہ ۶۳۹ھ۔ بخط بہاری۔

۷۔ صُراح۔ تالیف ابوالفضل محمد بن عمر المعروف بجمال القرشی۔ بخط نسخ مکتوبہ ۸۰۸ھ سالِ تصنیف ۶۸۱ھ۔ مختلف کتاب خانوں میں داخل رہی ہے۔ سرورق کی عبارتیں اس پر شاہد ہیں۔ اول و آخر ورق پر ۱۲ مختلف مہریں ہیں جن میں سے اکثر محکوک و مندرس ہیں۔ تین بیضوی مہریں "یحییٰ خان" کی ہیں اور ایک مہر مدور "بیر محمد بندہ شاہ عالم" کی ہے۔ ۱۱۶۸ھ

فارسی ۱۔ مثنوی معنوی۔ از جلال الدین رومی متوفی ۶۷۲ھ۔ بخط نسخ خوب، مکتوبہ ۷۱۲ھ مولانا آزاد لائبریری میں فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ وفاتِ مصنف سے ۴۰ سال قبل کا مکتوبہ چھ مہریں ثبت ہیں۔ ۵ محکوک و غیر مقرو ایک مہر مدور کلاں "بسم اللہ و بحمد اللہ الداعی شیخ عبدالقادر القادری الرفاعی" دفتر اول و ششم کے آخر میں چار مہریں "محمد اورنگ زیب بادشاہ" کی ہیں یہ نسخہ ان کے کتاب خانے میں داخل رہا ہے۔ اس کے حواشی ۸۵۵ھ میں لکھے گئے ہیں۔

۲۔ قصائد شمس طبسی متوفی ۶۲۴ھ۔ خطِ نستعلیق شکست آمیز، مکتوبہ ۱۰۲۷ھ۔

۳۔ ترجمہ عوارف المعارف۔ از قاسم محمود خطیب قصبہ چہرہ مرید شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی ۶۶۱ھ) بخط بہاری بقلم دلشاد بن اقبال۔ مکتوبہ ۸۵۵ھ۔

۴۔ غزلیات سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ مشتمل بر خواتیم و بدائع وطیبات۔ مکتوبہ ۸۰۵ھ کاتب احمد بن ابی سعید۔ جداول و عنوانات مطلا، خط پختہ۔

۵۔ چہل ناموس۔ از ضیاء الدین نخشبی متوفی ۷۵۱ھ۔ مکتوبہ محمد اسلم ۱۰۹۱ھ خطِ نستعلیق پختہ سال تصنیف ۷۳۰ھ

۶۔ کلیات " " کاتب جمال اسکافی سال " ۱۱۱۲ھ بخط نستعلیق

۷۔ مثنوی معنوی۔ بخط نستعلیق ۔ مکتوبہ ۸۶۲ھ

۸۔ خمسہ نظامی متوفی ۶۰۲ھ " " ۸۷۳ھ ۔ مصوّر۔

۹۔ مثنوی معنوی۔ " " ۸۸۰ھ

۱۰۔ مثنوی نہ سپہر۔ از خسرو دہلوی متوفی ۷۲۵ھ ۔ مکتوبہ ۸۸۹ھ خط نستعلیق جدول طلائی

۱۱۔ کلیات عماد فقیہ متوفی ۷۷۳ھ ۔ مکتوبہ قبل از ۹۰۰ھ " "

۱۲۔ انتخاب از اختیارات بدیعی۔ از حاجی زین الدین عطار۔ خط نستعلیق مکتوبہ حسن علی مشہور

بہ صبوری ۹۰۸ھ۔

۱۳۔ رسالہ اسامی الادویہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خط نستعلیق " " "

بہ صبوری ۹۰۸ھ۔

۱۴۔ معارف العوارف ترجمہ عوارف المعارف۔ از عبدالرحمٰن بن علی بزغش بخط نسخ مکتوبہ ۹۰۹ھ۔

۱۵۔ رسالہ قوشجی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " " ۹۰۹ھ۔

اردو بھاشا ۱۔ نو طرز مرصع۔ از مرصع رقم، میر عطا حسین خاں تحسین۔ مکتوبہ ۱۱۰۱ھ

۲۔ بہشت کنشت ترجمہ ہشت بہشت خسرو۔ از غلام احمد دہلوی " ۱۱۲۷ھ

۳۔ پدماوت۔ از ملک محمد جائسی " ۱۱۳۶ھ

۴۔ ترجمہ بھگوت گیتا۔ از راجہ بیربر ندیم اکبر بادشاہ " "

۵۔ رس گاہک چندر کا شرح رشک پریا کیشو داس مکتوبہ سید غلام نبی رسلین بلگرامی ۱۱۵۹ھ

۶۔ امر چندر کا " " "

۷۔ دہ مجلس دکنی منظوم۔ از ولی دکنی مکتوبہ ۱۱۹۰ھ

۸۔ دیوان سودا " ۱۱۹۶ھ

۹۔ دیوان ولی دکنی " ۱۱۹۶ھ

۱۰۔ فقہ ہندی منظوم۔ از عبدی۔ سال تصنیف ۱۱۴۸ھ

۱۱۔ رسالہ دید ابقدا ازفیاض الحق۔ سال تصنیف ۱۹۶۷ء

کتب عربیہ ساتویں صدی ہجری، کتب فارسیہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری اور کتب اردو دبھاشا گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری تک کی پیش کی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مذکورہ زبانوں کا قدامت کتابت کے لحاظ سے کیسا نایاب ذخیرہ شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔

نادر نسخے | ۱۔ حالنامہ بایزید انصاری (فارسی) مرتبہ علی محمد بن ابی بکر قندھاری مرید و خادم خاندان بایزید انصاری۔ بایزید عہد اکبری کے مشہور بزرگ تھے جنھیں لوگ پیر روشن ضمیر کہتے تھے اور جنھوں نے پہاڑوں میں ایک دینوی حکومت قائم کر رکھی تھی اور جن سے شاہانِ دہلی پریشان اور حکومت کا امن پراگندہ تھا۔ یہ کتاب روشنیہ تحریک کی بہترین تاریخ ہے۔ اس نسخے کے علاوہ دنیا میں کسی اور نسخے کے وجود کا علم نہیں۔ مکتوبہ بخط نسخ۔

۲۔ نفائس المآثر (فارسی) از مرزا علاء الدولہ نامی قزوینی۔ سال تالیف ۹۷۳-۹۷۲ھ اس کتاب کا دوسرا نام تذکرۂ علاء الدولہ بھی ہے۔ ابتداء میں دسویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے پھر تیموریوں کی تاریخ بابر سے اکبر تک کی لکھی گئی ہے اس تذکرہ کے کسی اور نسخہ کا علم نہیں۔ برٹش میوزیم کے دو مجموعوں میں اس کے کچھ اقتباسات ملتے ہیں۔ یہ نسخہ بخط نسخ مکتوبہ ۱۰۸۳ھ ہے۔ یہ نسخہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے پاس رہ چکا ہے۔ جابجا ان کی تصحیحات اور حواشی درج ہیں۔ سرورق پر ان کی تحریر، دستخط اور مہر بھی موجود ہے۔

۳۔ مونس الاحرار فی دقائق الاشعار (فارسی) مشتمل بر ہفتاد و پنج شعراء۔ از احمد بن محمد کلاتی۔ سال تصنیف ۷۴۱ھ بخط نستعلیق غنیمت، اوراق ۴۰۷، تقطیع کلاں۔ اس تذکرہ کے کسی دوسرے نسخے کا علم نہیں۔

۴۔ قصائد نعتیہ۔ از عمید، فضل اللہ لوئکی (معاصر سلطان ناصر الدین محمود متوفی ۶۶۴ھ) بخط نستعلیق خفی بہتر۔ یہ نسخہ بھی نایاب ہے۔

مصور نسخے | ۱۔ خمسہ نظامی گنجوی متوفی ۵۹۹ھ۔ مکتوبہ حسین عبداللہ ۸۸۳ھ۔ قصاویر ۱۸ بخط نستعلیق خوشخط،

ابتدائی ۲ صفحات مطلا سرورق پر ۲ مہریں۔

۲۔ دیوانِ حافظ شیرازی متوفی ۷۹۱ھ۔ مکتوبہ ۱۰۸۱ھ، بخط نستعلیق نفیس، ۳ مرقعے۔

۳۔ مثنوی معنوی۔ از جلال الدین محمد رومی متوفی ۶۷۲ھ۔ مکتوبہ ۱۰۹۱ھ، بخط نستعلیق نفیس، کاتب عبداللہ بن قنبر سمرقندی، مزین بہ تصاویر کثیرہ۔ میر نور اللہ کے حواشی بھی درج ہیں۔

۴۔ مثنوی حسینی۔ مصنفہ ۱۱۶۳ھ۔ تصاویر ۲۹۔

۵۔ گلستان و بر حاشیہ بوستان۔ از سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ۔ مکتوبہ حامد ساکن جھی ۱۲۵۰ھ۔ تمام مطلا و مجدول و مرصع۔ تصاویر ۱۹۔

۶۔ حملۂ حیدری۔ از محمد رفیع باذل مشہدی۔ بخط نستعلیق پاکیزہ، مصور و مطلا۔ تصاویر ۲۰

۷۔ شاہنامۂ فردوسی متوفی ۴۱۱ھ۔ (۴ نسخے) مصور۔

مرصع و منقش نسخے | ۱۔ کریما۔ از سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ۔ مکتوبہ بدرعلی تلمیذ آغا مرزا ۱۲۷۰ھ بخط نستعلیق نہایت خوشخط، زر افشاں۔

۲۔ ہفت بند کاشی۔ مکتوبہ عطارد رقم و مرصعۂ محمد علی ۱۲۵۰ھ۔ بخط نستعلیق خوشخط۔ زمین سنہری۔

۳۔ " " " محمد حسن کاشمیری۔ مرصع بطلا۔ " " " "

۴۔ ملفوظات صاحبقران۔ حالات امیر تیمور۔ از افضل بخاری۔ در عہد شاہجہاں۔ مکتوبہ ہدایت اللہ ۱۲۲۰ھ ابتدائی دو صفحوں پر نہایت خوبصورت سنہرا کام ہے۔ اس نسخہ کی کتابت مرزا ایزد بخش بہادر خلف شاہ عالم بادشاہ غازی کے لئے کی گئی ہے آخر میں ان کی مہر ثبت ہے۔

۵۔ چہل حدیث با ترجمہ فارسی منظوم۔ بخط نستعلیق جلی تمام صفحات مرقع و مذہب و مطلا، بر حواشی گلکاری بطلا، مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۰ھ۔

۶۔ مرغوب القلوب (مثنوی)۔ بخط نستعلیق جلی تمام صفحات مرصع و مذہب و مطلا، بر حواشی گلکاری بطلا، مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۰ھ۔

خوشخط نسخے | ۱۔ دیوان لسانی شیرازی متوفی ۹۴۰ھ۔ بخط نستعلیق نفیس، مکتوبہ حسن قلی ۹۸۰ھ۔

۲۔ خمسہ نظامی گنجوی۔ مکتوبہ فیروز محمد بن سلیمان۔ بخط نستعلیق خوبتر۔

۳۔ کلیات۔ مکتوبہ سبحان اللہ، سنہ ۹۶۳ھ۔

۴۔ مثنوی معنوی۔ مکتوبہ سنہ ۹۰۱ھ، بخط نستعلیق نہایت خوشخط، مطلا۔

۵۔ زاد المعاد۔ ،، سنہ ۱۲۳۳ھ کاتب طاہر شیرازی، بخط نسخ خوشخط، مجدول طلائی لوح زرجدی

۶۔ طبقات اکبری۔ از خواجہ نظام الدین احمد بخشی۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۰۱ھ، بعہد مصنف کاتب عبد الحق قریشی۔

۷۔ مجموعۃ الرسائل الاربعۃ فی المناظرۃ المذہبیۃ۔ از نور اللہ شوستری و حسین بن عبد الصمد العاملی وغیرہما مکتوبہ ۱۱۱۶ھ بخط نسخ خفی بہتر۔ بر حواشی گلکاری، لوح مطلا، نسخہ مجدول بطلا، مشتمل بر چہار رسائل۔ سرورق پر دو مہر مربع محکوک۔ کاتب عبد الوہاب بن محمد طاہر۔ مقام کتابت احمد آباد گجرات۔

خود نوشت نسخے ۱۔ عیون الاجوبۃ فی فنون الاسئلۃ۔ از ابو القاسم عبد الکریم القشیری المتوفی سنہ ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء۔ بخط المصنف۔ ۲۔ فتح المتعال فی مدح النعال۔ از احمد بن محمد المغربی المتوفی سنہ ۱۰۴۱ھ۔ بخط المصنف۔

۳۔ مجموعۃ الرسائل۔ از ابن طولون، محمد بن علی بن احمد الصالحی الدمشقی الحنفی المتوفی سنہ ۹۵۳ھ۔ ،،

۴۔ تلخیص الشفاء۔ از فضل امام خیر آبادی متوفی ۱۲۴۳ھ۔ مکتوبہ ۱۲۲۷ھ۔ ،،

۵۔ حاشیہ افق المبین۔ از فضل حق خیر آبادی متوفی ۱۲۷۸ھ ،،

۶۔ دیوان صائب متوفی ۱۰۸۸ھ۔ مکتوبہ ۱۰۸۳ھ . . . . بخط المصنف

۷۔ شرح خطبۃ القواعد۔ از فخر الدین محمد۔ مکتوبہ ۹۰۰ھ . . . . . . ،،

۸۔ چار چمن۔ از غلام محی الدین مبتلا دعشق۔ ،، ۱۱۸۷ھ ،،

۹۔ ارتیاح الاکباد بارباح فقد الاولاد۔ از الحافظ السخاوی، محمد بن عبد الرحمن متوفی ۹۰۲ھ ،،

۱۰۔ حالات خود نوشت۔ از نجم الدین علوی کاکوروی قاضی القضاۃ کلکتہ متوفی ۱۲۲۹ھ ،،

۱۱۔ ترغیب السالک (مسوّدہ) از مصطفیٰ خان شیفتہ متوفی ۱۲۸۶ھ . . . ،،

۱۲۔ ضیاء الایمان فی آداب القرآن۔ از سید عبد الجبار بن سید علاء الدین۔ مکتوبہ ۱۳۰۹ھ ،،

۱۳۔ ہدایۃ النجاۃ۔ از عبد الحلیم فرنگی محلی لکھنوی متوفی ۱۲۸۵ھ بخط نستعلیق شکست آمیز مکتوبہ ۱۲۵۴ھ ،،

۱۴۔ فرقۃ المدرسین بذکر المؤلفات والمؤلفین۔ از عبدالحئی فرنگی محلی لکھنوی متوفی ۱۳۰۴ھ۔ بخط المصنف

۱۵۔ وظائف وفات النبی المولدیہ النبویہ واللیلیہ۔ از عبدالغنی بن احمد الحنفی مکتوبہ ۱۱۳۲ھ۔ "

متفرقات مع خصوصیات | ۱۔ بعثت بند کاشی۔ بخط ناخن، نستعلیق خوشخط۔ کاغذ مختلف الالوان روشن نگار۔ مکتوبہ ۱۲۴۶ھ

۲۔ قصیدہ حافظ شیرازی۔ " " درمنقبت حضرت علی مرتضیٰ۔

۳۔ ذکر شہادت نواب علاء الدولہ۔ از ابن ناصر، بخط شکست۔ مکتوبہ مرلی دھر ۱۲۴۸ھ

ہر جملے سے تاریخ شہادت مرحوم (۱۱۷۰ھ) برآمد ہوتی ہے۔

۴۔ قصیدہ در تعزیت میر عبدالجلیل بلگرامی۔ از غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ۔ مشتمل بر چہار مطالع

و یک صد و یک بیت۔ ہر مصرع بیت سے تاریخ وفات مرحوم (۱۱۳۸ھ) نکلتی ہے۔

۵۔ مجموعہ منتخبات شعرائے اردو۔ یہ کسی ضخیم مجموعہ کا حصہ ہے جس میں ۸ شعرائے اردو کے منتخبات

ہیں۔ بخط نستعلیق پاکیزہ، تمام صفحات زر افشاں۔ روشنی میں جھل مل جھل مل ہوتے ہیں۔

۶۔ اشعار دیوان ترکی۔ ترکی زبان کے کسی شاعر کے دیوان کا ایک خوشخط صفحہ جس کے صفحہ اول پر جہانگیر

کی تحریر اور مختلف مغل امرا کی تحریریں اور مہریں ثبت ہیں جہانگیر کی تحریر اس طرح ہے:-

"اللہ اکبر بتاریخ ۱۲ آذر سنہ ۱ داخل کتابخانہ این نیازمند درگاہ الٰہی شد۔ حررہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ ۱۰۱۴ھ"

عنایت خاں شاہجہانی کی مہر اور عبداللہ چلپی کے دستخط بہت واضح ہیں۔ ایک دوسری تحریر سے

جو اس صفحہ پر ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ سلاطین خراسان و ہرات کے کتب خانوں سے منتقل ہوتا ہوا مغل بادشاہوں

کے کتب خانوں تک پہنچا ہے۔ صفحہ اول پر "خاصہ اول" بھی لکھا ہوا ہے۔

۷۔ بہارستان جامی متوفی ۸۹۸ھ اس نسخہ پر جامی کی تحریر موجود ہے مکتوبہ ۸۹۰ھ بعہد مصنف، بخط نستعلیق غنیمت۔

لوح و جدول مطلا۔

۸۔ دیوان صائب۔ مکتوبہ عارف تبریزی ۱۰۸۵ھ اس کے حواشی پر صائب کے قلم کی تازہ غزلیں ہیں اور

آخر میں "بلغ سماعاً منّی" لکھا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتابخانہ کی زینت رہا ہے۔ ۱۱۳۶ھ کا "عرض دیدہ" موجود ہے۔

۹۔ دیوان صائب۔ مکتوبہ قبل از ۱۰۷۰ھ اس نسخہ پر صائب کی تصحیحات اور حواشی پر ان کے قلم سے غزلیں

درج ہیں۔ ورق ۱۰۱ کے حاشیہ پر آخری مکمل غزل لکھ کر عبارت بھی لکھی ہے۔ تاریخ ۱۰۷۰ اعدادی ہے۔
یہ نسخہ بھی شاہی کتابخانوں میں رہ چکا ہے مختلف تحویل داروں کی تحریریں درج ہیں قدیم ترین تحریر
۳ جمادی الاول ۱۰۳۲ھ کی ہے۔ تین غیر مقروء مہریں بھی ہیں۔

۱۰۔ جمہرة اشعار العرب۔ مرتبہ ابی الخطاب القرشی۔ مکتوبہ ۹۹۰ھ۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے
کہ اول نسخوں میں اور اس نسخہ میں نمایاں اختلافات ہیں۔ اس سے قدیم نسخہ کا بھی علم نہیں۔

۱۱۔ سہو المصلین۔ از حسن بن محمد بن احمد۔ مکتوبہ ۸۳۱ھ۔ فقہ کی ایک غیر الحصول کتاب۔

۱۲۔ کتاب الامتاع باحکام السماع۔ از کمال الدین ابو الفضل جعفر بن ثعلب الادفوی الشافعی
المتوفی ۷۴۸ھ۔ مکتوبہ ۱۰۴۷ھ۔

۱۳۔ حقیقتہائے ہندوستان۔ (در احوال مداخل ومخارج صوبجات ہندوستان) از لچھمی نراین
شفیق اورنگ آبادی۔ سال تصنیف ۱۲۰۴ھ۔ مکتوبہ ۱۲۰۸ھ۔ سرورق پر مصنف کی تحریر
اور دستخط ہیں۔

۱۴۔ ذکر الملوک (تاریخ حقی) مختصر تاریخ ہند از عہد معز الدین محمد بن سام متوفی ۶۰۲ھ
تا عہد اکبر بادشاہ۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ۔ مکتوبہ ۱۰۳۰ھ سال تصنیف ۱۰۰۵ھ

۱۵۔ اشعة اللمعات۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مکتوبہ محمد علی الدہلوی ۱۰۴۸ھ۔
بخط نسخ خفی پاکیزہ۔ در آخر ترقیمہ بقلم المصنف ۱۰۴۹ھ۔

۱۶۔ تاریخ گزیدہ۔ از حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی ۷۵۰ھ۔ سال تصنیف ۷۳۰ھ۔ سرورق
پر مہریں۔ یہ نسخہ ابو الفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی ملکیت میں رہا ہے سرورق پر ان کی مہر اور دستخط
بھی ہیں۔ سر سید احمد خاں کی ملکیت میں بھی رہا ہے ان کی مہریں بھی ہیں۔

۱۷۔ چاول۔ اس چاول پر ایک طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
کی تصویر اور دوسری جانب ان کا نام مع خطابات تحریر ہے۔

۱۸۔ المطول۔ از سعد الدین التفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ بخط نسخ مکتوبہ ۸۳۹ھ کاتب
سید شریف۔ بر سرورق عبارت و دستخط نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ بسلسلۂ دخول نسخہ بکتابخانہ
شاہی و ہفت مہر مدور و بیضوی "عنایت خاں شاہجہانی" "محمد حسن بندۂ شاہجہاں" "عبد اللہ
خانہ زاد عالمگیر بادشاہ" وغیرہم و دستخط جائزہ عبد اللہ چلپی ۲۶ جلوسی و دیگر جائزہ ۱۰۶۶ھ و برورق
آخر پنج مہر مدور و مربع "صادق خان بندۂ شاہجہاں" وغیرہ و جائزات متفرقہ۔

ہندو مذہب سے متعلق خصوصی مخطوطات
۱۔ یجروید۔ بزبان تلیگو بر بھوج پتر۔
۲۔ ڈرامہائے بہاس۔ بزبان ملیالم بر بھوج پتر۔

یہ دونوں نسخے بہت قدیم اور اہم ہیں۔ کاغذ مہیا ہونے سے قبل مخصوص درخت کی چھال کو
چھیل کر باریک بنایا جاتا تھا اور اس پر لکھا جاتا تھا جس طرح ہرن اور دوسرے جانوروں کی کھال

صاف کر کے کتابت ہا کے کام میں لائی جاتی تھی۔ قرآنِ پاک کے ڈھائی پارے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے
مخطوطکونی ایسی ہی کھال پر لکھے ہوئے ہیں۔

۳۔ شرح فارسی شری گیتا جی۔ از روی شنکر بھاس۔ تصنیف شنکر اچارج۔ مؤلفہ دھر گسائیں سنیاسی۔ مصوّر لوح وصفحۂ اوّل مطلا۔ برحواشی گلکاری بطلا، نسخہ مجدول، بخط نستعلیق خوشخط، متن بزبان سنسکرت، شرح بزبانِ فارسی۔

۴۔ شری رام چندر جنم پتر۔ بزبانِ سنسکرت۔ خوشخط مصوّر۔

۵۔ ترجمہ فارسی مہابھارت۔ از نقیب خاں بن عبداللطیف الحسینی۔ سال تصنیف ۹۹۲ھ۔ بعہد اکبر بادشاہ۔ مکتوبہ عبدالرحمٰن ۱۱۱۲ھ بمقام کشمیر، بخط نستعلیق۔ سرورق پر دو مہر مدوّر غیر مقروء۔ یہ ترجمہ ڈیڑھ سال میں بمعاونت چند برہمنان و ملا عبدالقادر بدایونی پنج بھاگ کیا گیا۔

۶۔ ترجمہ فارسی بھگوت مہاپران۔ از ابوالفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ۔ مکتوبہ ہرنیخ رائے کھتری ساکن لسارہ ۱۲۲۳ھ، بمقام چھاؤنی سباتھور۔ لوح مطلا، نسخہ مجدول، بین السطور نیز مطلا، بخط نستعلیق غنیمت۔

۷۔ ترجمہ بھگوت گیتا۔ در بھاشا۔ از راجہ بیربر ندیم اکبر بادشاہ۔ مکتوبہ دولت شاہ ۱۱۳۵ھ۔ بمقام شاہجہاں آباد، بخط نستعلیق۔ بر ورق دوم مہر مربع "لچھمن داس"

شعبۂ مخطوطات میں فرامینِ شاہی، دستاویزات، قبالہ جات، تصاویر، کتبات، مکاتیب وغیرہا کا بھی معتدبہ ذخیرہ ہے جن کی مجموعی تعداد ۲ ہزار سے متجاوز ہے۔ ۹۶۰ سکّے بھی ہیں جن میں نقرئی اور طلائی بھی ہیں۔ ہندو پیریڈ سے آخر عہد مغلیہ تک۔ فرمانوں میں بابر بادشاہ سے لے کر آخر عہد مغلیہ تک۔ فرمان بابر بادشاہ مکتوبہ ۹۳۳ھ اور فرمانِ اکبر بادشاہ مکتوبہ ۹۷۵ھ۔ کتبات اور وصلیاں ہند و بیرون ہند کے مشہور خطاطوں کی شاہکار بھی ہیں۔ مکاتیب بھی رہنمایانِ قوم، ادبا، شعرا، علما اور صلحاء ہر طبقے کے ملیں گے۔ اسی طرح تصاویر بھی شاہان و بیگمات مغلیہ، نادر شاہ، تاناشاہ، مولانا فخرالدین، طوطی بیگم وغیرہا بیسیوں مشاہیر کی ملیں گی۔ فوٹو بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں دورِ سید احمد خاں کے کمیاب گروپ بھی ہیں۔

شعبۂ مخطوطات کو حبیب گنج کلکشن نے چار چاند لگائے ہیں۔ قدیم ترین مخطوطات عربیہ و فارسیہ اسی کلکشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کلکشن کے جامع، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس اعظم حبیب گنج و صدر الصدور مملکت حیدر آباد دکن نے اپنے قلم سے اپنے کتابخانہ کے اہم نسخوں کی جو عنوان وار فہرست بنائی ہے۔ اس سے اس بیش بہا ذخیرہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ خاص عنوان درج ذیل ہیں۔

۱۔ الذھبیات۔ اس کے تحت ۹۹ وہ نسخے ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے امتیاز رکھتے ہیں۔

ان کی مدد سے ماوراء النہر، ایران، ترکی، کشمیر، ہندوستان وغیرہ ممالک کے ہنر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

۲۔ الخطاطیات۔ اس کے تحت بڑے خطاطوں کے قلم کے ۵ نسخے درج ہیں مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہ۔

۳۔ الخطیات۔ اس کے تحت ۳۵ وہ نسخے ہیں جو اعیانِ ملک کے لکھے ہوئے ہیں مثلاً مناجات امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہٗ بدرگاہِ قاضی الحاجات۔ مکتوبہ مرزا ابوالحسن آصف خاں برادر نورجہاں ۱۰۲۵ھ بخط نستعلیق خوشخط، مطلا، مجدول، زرافشاں۔

۴۔ المجلدات۔ قدیم جلد سازی کے ۱۶ نمونے۔

۵۔ السلطانیات۔ جن اہم نسخوں کا سلاطین اور وزراء سے تعلق رہا ہے وہ اس کے تحت درج ہیں مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتاب خانے کی صحیح بخاری وغیرہ۔

۶۔ الفتوحیات۔ وہ دو نسخے جو سلاطین کے کتابخانوں میں مالِ غنیمت کے طور پر داخل ہوئے۔

(۱) صحیح البخاری۔ از فتح بیدر بر دستِ ابراہیم عادل شاہ۔ مکتوبہ ۷۷۰ھ۔

(۲) مثنوی گوئے وچوگاں ملا عارفی۔ نوشتہ میر علی کاتب۔ از فتح گولکنڈہ، بر دستِ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ۔

۷۔ المقامیات۔ جن ۹۶ کتابوں پر مقام کتابت درج ہے۔

۸۔ الختمیات۔ جن ۲۶۳ نسخوں پر مہریں ہیں۔

۹۔ الحسنیات۔ اس کے تحت وہ اہم نسخے ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں۔ (غیر خطاطیات)

۱۰۔ القرطاسیات۔ اس کے ذیل میں کاغذوں کے ۱۱ اقسام دکھائے گئے ہیں۔

۱۱۔ العتیقات۔ اس کے تحت ۲۳ قدیم نسخے درج ہیں (نویں صدی یا اس سے قبل کی کتابیں) سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کا ہے۔

۱۲۔ الخطوط۔ اس میں ۱۶ مختلف خطوں کی تشریح ہے۔

۱۳۔ المصنفیات۔ اس میں ۳۸ وہ نسخے ہیں جو بخطِ مصنف ہیں یا نسخۂ مصنف سے منقول یا مقابلہ شدہ ہیں۔

مخطوطات کی ترتیب فہرست میں ڈاکٹر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی مرتبہ "فہرست نمائش گاہ مخطوطات و نوادر" مطبوعہ ۱۹۵۳ء اور ڈاکٹر پروفیسر نذیر احمد کے مجموعۂ مقالات "تاریخی و ادبی مطالعے" مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں شامل مضمون "کتاب خانہ حبیب گنج" سے بھی حسبِ مواقع مدد لی گئی ہے۔

امید ہے کہ اس مضمون سے اربابِ علم اور اہلِ دانش کی نظر میں "مولانا آزاد لائبریری" سے متعلق مفید معلومات کا اضافہ ہو سکے گا۔

برہان

جلد ۷۱ | ماہ شوال المکرم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۵

نظرات

اس مرتبہ عرب اسرائیل چوتھی جنگ متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اس کو مغربی ایشیا میں ایک پائدار اور مستقل امن کی نوید کہا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کی تین لڑائیوں میں خواہ عرب کی شکست کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ بہرحال ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اسرائیل کی طاقت و قوت ایک قضائے مبرم ہے۔ اور عرب اس کو کبھی چیلنج نہیں کر سکیں گے لیکن اس مرتبہ عربوں نے دنیا پر علیٰ رؤس الاشہاد یہ ثابت کر دیا کہ وہ مردہ نہیں زندہ قوم ہیں بزدل نہیں، بہادر ہیں۔ عروج و زوالِ اقوام کے اسرار و رموز سے باخبر ہیں۔ اور عہدِ جدید کی جنگ سامانیوں سے پوری طرح آشنا اور متحرک و فعّال۔ بیدار مغز اور روشن خیال ہیں۔ ان کی بیدار مغزی کی پہلی علامت یہ تھی کہ انہوں نے حملہ میں پہل کی اور یہ اعلان کر کے کہ ان کا مقصد صرف اپنے ان علاقوں کی بازیافت ہے جو ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ان سے ہتیا لئے گئے تھے۔ اور جن کو مجلسِ اقوام متحدہ کی تجویز اور بین الاقوامی رائے عامہ کے دباؤ کے باوجود اسرائیل نے ان کی واپسی پر کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ عربوں نے کہا کہ مسلسل چھ برس تک بڑی بے چینی سے انتظار کیا کہ کسی طرح ہمارے مغصوبہ علاقے ہم کو واپس مل جائیں۔ لیکن جب کوئی پُرامن کوشش کامیاب نہ ہوئی اور مجلسِ اقوام متحدہ بھی اپنی تجویز پر عمل کرانے میں ناکام رہی اور بڑی بڑی طاقتیں بھی ایک حقدار کو اس کا واجبی حق نہ دلا سکیں تو اب " تنگ آمد بجنگ آمد " کے مطابق اس کے سوا چارہ کار ہی کیا باقی رہ گیا تھا کہ وہ خود براہِ راست اقدام کریں۔

عربوں کے اس اعلان نے طبعی طور پر دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ کو اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس اعلان کے بعد عرب لڑے تو اس بہادری اور شجاعت و دلیری سے

لڑے کہ دشمن کے چھکّے چھڑا دیئے۔ دنیا کے بڑے بڑے فوجی مبصرین یہاں تک کہ اسرائیل کے کمانڈر انچیف اور پریذیڈنٹ نکسن تک نے عربوں کی بہادری اور جنگ آزمائی کی تعریف کی۔ اور اس کی داد دی ہے۔ دنیا نے اِس مرتبہ صاف دیکھ لیا کہ اگر جنگ صرف عرب اور اسرائیل کے درمیان محدود رہے اور امریکہ جیسی عظیم طاقت بے تحاشا اسرائیل کی مدد نہ کرے تو جنگ کا فیصلہ یقیناً عربوں کے حق میں ہوگا۔ دنیا کے اربابِ سیاست کے دل و دماغ پر یہ اثرات بے شبہ عربوں کی شاندار کامیابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور روس دونوں جو عرب و اسرائیل کی جنگ میں باہم ایک دوسرے کے حریف اور مقابل سمجھے جاتے تھے۔ اور اس مرتبہ بھی جنگ کے آغاز میں صورتِ حال یہی تھی، ایک ہو گئے۔ اور ان کے آپس کے سمجھوتہ سے جنگ بندی کے لئے جو فارمولا تیار ہوا وہ انسدادِ جنگ کی بنیاد بنا۔

جنگ بندی کا رزولیوشن مجلسِ اقوامِ متحدہ نے ۱۹۶۷ء کے جنگ کے موقعہ پر بھی منظور کیا تھا۔ اور اسی کی بنیاد پر جنگ ختم ہوئی تھی۔ لیکن اس رزولیوشن میں اور اب جو رزولیوشن منظور ہوا ہے۔ اس میں بہت بڑا فرق ہے۔ حالیہ رزولیوشن میں یہ صاف کہا گیا ہے کہ جنگ رُک جانے کے بعد فریقین میں جلد از جلد باہم گفت و شنید کا بندوبست کیا جائے گا۔ اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے جن عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا معمولی رد و بدل کے بعد اسرائیل کو ان سے دست بردار ہونا ہوگا۔ امریکہ اور روس کے باہمی اتفاق سے مجلسِ اقوامِ متحدہ کا یہ رزولیوشن اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ ان دو بڑی طاقتوں نے اب یہ محسوس کر لیا ہے عرب اور اسرائیل دونوں فوجی اور جنگی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے برابر کی طاقتیں ہیں۔ اس لئے اِن دونوں میں اگر باہمی بغض و عداوت اور جنگ کی صورت یہی برقرار رہی تو تیل اور نہر سوئز کے باعث اس کا اثر یہی نہ ہوگا کہ امریکہ اور یورپ کے اقتصادی حالات متاثر ہوں گے بلکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکہ اور روس دونوں ایک دوسرے کے فریقِ مخالف کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں کود پڑیں اور نہایت سخت قسم کی بھیانک عالمگیر

جنگ چھڑ جائے۔ اور اس جنگ کے لئے نہ امریکہ تیار ہو سکتا ہے نہ روس۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس معاملہ میں امریکہ اور روس کی نیت اور ارادہ کے بارہ میں بدگمانی سے کام لیں۔

اس رزولیوشن کی سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں بڑی طاقتیں عرب اور اسرائیل میں براہِ راست بات چیت کا بندوبست کریں گی اور جلد از جلد اعربوں اور اسرائیل نے اس کو تسلیم کرلیا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کا ایک گونہ آغاز ہو بھی چکا ہے۔ چنانچہ جنگ بندی سے ان مسطور کی تحریر کے وقت تک عرب اور اسرائیل کے فوجی افسر دو مرتبہ بات چیت کر چکے ہیں۔ اور اس پر اسرائیل کی وزیرِ اعظم نے مسرت کا اظہار کیا اور آئندہ پائیدار امن کے لئے اسے فالِ نیک قرار دیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اب جب کہ عربوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا ہے ان کو اسرائیل کے ساتھ براہِ راست بات چیت کرنے میں کوئی جھجک یا رکاوٹ نہ ہونی چاہئے۔ اسرائیل ایک چھوٹی سی مملکت ہے اور وہ چاروں طرف سے عرب ملکوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس بنا پر عربوں سے مستقل طور پر برسرپیکار رہنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے اس کو نہ وہاں کی گورنمنٹ برداشت کر سکتی ہے اور نہ وہاں کے عوام اسے گوارہ کر سکتے ہیں۔ اور نہ وہ یہودی جو لاکھوں کی تعداد میں دوسرے ممالک میں آباد ہیں اسے انگیز کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ جب عربوں اور اسرائیل میں براہِ راست گفتگو ہوگی تو وہ بے نتیجہ نہ رہے گی۔ اور اس سے بہت سے مسائل کا حل نکل آنے کے بعد مغربی ایشیا میں پائیدار امن کی ایک راہ نکل آئے گی۔

ہم اپنے عرب بھائیوں کو ان کی اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عزم و ہمت سے بین الاقوامی سیاست کا رخ موڑ دیا ہے اور بڑی بڑی طاقتوں کے لیے حقائق پر معروضی نقطۂ نظر سے سوچنے کی راہ ہموار کردی ہے۔ عربوں کی اس کامیابی میں بڑا دخل تین چیزوں کا ہے۔ ایک ان کا باہم اتحاد و اتفاق، دوسرا ان کی خود اعتمادی

اور تیسرا عہدِ جدید کے تقاضوں اور اس کے مطالبات کا صحیح ادراک شعور اور واقعہ بھی ہے کہ یہی تین چیزیں ہیں جو اس زمانے میں کسی قوم کی ترقی اور اسی کی بقا کے لئے ضروری ہیں اور سب سے آخر میں مگر سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ عرب من حیث القوم مسلمان ہیں اور اسلام کے اولین علمبردار وہی رہے ہیں اس لئے ہم ان کو کیا بتائیں کہ اسلام ہی وہ حقیقی سرچشمہ ہے جو ان کو اتحاد بھی بخشتا ہے اور علم و عمل کے اعتبار سے اُن کو ناقابلِ شکست توانائی اور طاقت بھی عطا فرماتا ہے۔ جو لوگ اس کے ہو گئے ان کو وہ یہ مژدۂ جاں فزا سناتا ہے۔ لا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون

عہدِ نبوی کا تاریخی جائزہ[1]

ہجرت

(۴)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

بیعت عقبہ سے قریشی اکابر گھبرا گئے، انھیں یقین ہوگیا کہ محمدؐ نے اُن سے لڑنے کے لئے بیعت کی ہے، انھوں نے فیصلہ کیا کہ محمدؐ کا خاتمہ کرکے بیعت سے پیدا ہونے والے خطروں کا سدِ باب کر دینا چاہئے، وہ جانتے تھے کہ اگر ان کے کسی ایک خاندان نے رسول اللہ کو قتل کیا تو اسے بنو ہاشم و مُطّلب کے غیظ اور انتقام کا نشانہ بننا پڑے گا اس لئے طے ہوا کہ قریش کے ہر خاندان سے ایک ایک جوان چُنا جائے اور یہ سب مل کر رسول اللہ کے قتل میں شریک ہوں تاکہ ان سے انتقام لینا ہاشمیوں کے بس سے باہر ہو جائے۔ رسول اللہ کو اس سازش کا علم ہوگیا، انھوں نے ہجرت کا عزم کر لیا بیعت کے تیسرے ماہ ایک رات وہ اپنے مقرب ابوبکر صدیق کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہو گئے، انھیں اندیشہ تھا کہ قریش کے گماشتے ان کا تعاقب کریں گے اس لئے مکہ کے قریب وہ ایک غار میں جو غارِ ثور کے نام سے موسوم تھا چھپ گئے اور وہاں تین راتیں گذاریں۔ اس اثنا میں قریش کے گماشتے تلاش میں ناکام ہوکر مکہ لوٹ گئے۔ رسول اللہ مع ابوبکر اپنی تیز رو اونٹنی قصوا پر سوار ہوکر جسے چار سو روپئے میں خریدا تھا دو اور عربوں کے ساتھ جن میں سے ایک رہبر تھا، مدینہ روانہ ہو گئے۔

دس بارہ دن کا سفر کرکے رسول اللہ مدینہ کے ایک بیرونی محلہ میں اترے جہاں اوس کی کثیر خاندان شاخ عمرو بن عوف کی بستیاں تھیں، یہاں دو ہفتے قیام کے بعد رسول اللہ کی سواری اندرونی شہر کی طرف روانہ ہوئی وہ اوسی محلہ سے گذرتے تو اوسی نقیب انھیں اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دیتے تاکہ رسول اللہ کا

[1] اس مضمون کی قسط ۳ کا عنوان "رسول اللہ کی ولادت" غلط تھا اسے "عہد نبوی کا تاریخی جائزہ" کر لیا جائے۔

تقرب حاصل ہوا اور جب خزرجی محلوں سے گذرتے تو خزرجی نقیب اپنے ساتھ ٹھہرنے کی درخواست کرتے تاکہ رسول اللہ کی جسمانی قربت سے ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو۔ دونوں قبیلوں کی رقیبانہ رجحانات کے پیشِ نظر رسول اللہ نے اپنے دادا کی ننھیال میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا جس کا تعلق قبیلۂ خزرج کے نجاری خاندان سے تھا۔ وہ اس خاندان کے ابوایوب انصاری کے گھر کے باہر ایک صاف ستھرے چوک میں اپنی اونٹنی سے اُترے۔ ابوایوب کا مکان دو منزلہ تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہتے تھے، ان کے ساتھ بال بچے نہیں تھے، گھر صاف ستھرا اور ماحول پُرسکون تھا۔ رسول اللہ کے پہنچتے ہی اوس و خزرج کے نقیبوں کے گھر سے ان کے لئے کھانے کے تحفے آنے لگے، پہلا تحفہ مشہور صحابی زید بن ثابت کی ماں کا تھا، انھوں نے ایک بادیہ میں روٹی، گھی اور دودھ سے تیار کیا ہوا پسندیدہ کھانا ثرید بھیجا، زید بن ثابت یہ کھانا لے کر آئے، وہ ابھی لوٹے بھی نہ تھے کہ سعد بن عُبادہ خزرجی نقیب کا بادیہ آگیا اس میں بھی ثَرید و عُراق[1] تھا۔ رسول اللہ کا قیام ابوایوب کے گھر سات ماہ رہا، اس اثنا میں ہر رات تین بار اوسی و خزرجی گھروں سے ان کے لئے کھانا آتا رہا[2]۔ کسی نے ابوایوب کی بیوی سے پوچھا کہ رسول اللہ کو کون سا کھانا پسند تھا تو انھوں نے کہا: رسول اللہ خود کسی کھانے کی فرمائش یا مذمت نہیں کرتے تھے لیکن ابوایوب نے مجھے بتایا کہ ایک رات وہ اس بادیہ میں رسول اللہ کے ساتھ شریکِ طعام تھے جو نقیب سعد بن عُبادہ نے بھیجا تھا اور جس میں طَفَیْشَل نامی سالن تھا، یہ سالن رسول اللہ نے بڑی رغبت سے کھایا، ایسی رغبت انھوں نے دوسرے کھانوں سے ظاہر نہیں کی تھی، ہم بھی رسول اللہ کے لئے طَفَیْشَل پکانے لگے، ہریس بھی پکاتے تھے، یہ بھی انھیں پسند تھا، رات کے کھانے پر ان کے ساتھ کبھی پانچ کبھی چھ اور کبھی دس تک آدمی ہوتے تھے[3]۔ رسول اللہ کو ابوایوب کے گھر کا پانی موافق نہیں آیا، اس لئے وہ ان کے لئے اچھا پانی اَنَس نامی کنوئیں سے منگوایا کرتے تھے

---

[1] بروزن غبار، عَرق بفتح العین کی جمع۔ کم گوشت ہڈی کا لذیذ سالن جسے عرب بہت پسند کرتے تھے۔

[2] ابن سعد ۱/ ۲۳۷ انساب الاشراف ۱/ ۲۶۷

ہند اور حارثہ بیوت السقیا
سات ماہ بعد جب رسول اللہ اپنے گھر منتقل ہوئے تو انس بن مالک،
قیل لأم ایوب وکان
نامی کنوؤں سے دیگچوں میں بھر کر رسول اللہ کے گھر پانی پہنچاتے تھے[۱]
أشہر أی الطعام کان احب الی رسول
مقام رسول اللہ فی منزل زوجہا سبعة
ولا رأیتہ ذم طعاما قط
اللہ : فقالت : ما رأیتہ أمر بطعام یصنع لہ بعینہ
تعشی معہ لیلة من قصعة ارسل بہا سعد بن
ولکن أبا أیوب أخبرنی أنہ
فکنا نعمل لہ وکنا نعمل
عبادة فیہا طفیشل فرآہ ینہکہا نہکا لم یرہ ینہک غیرہا
وکان یحضر عشاءہ الخمسة الی الستة الی العشرة۔[۲]
لہ الہریس فنراہ یعجبہ ،

مشکلات

اقتصادی، قیادتی اور مذہبی۔ وہ جب
مدینہ آکر رسول اللہ کو تین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔
تک مکہ میں تھے انھیں نہ رہائش کی کوئی تکلیف تھی، نہ کھانے پہننے کی، نہ روپیہ پیسہ کی، ان کا
ذاتی فراخ و پرآرام مکان تھا، ان کی مالدار بیوی خدیجہ اپنی وسیع اور پھلتی پھولتی تجارت سے اتنا
وافر کما لیتی تھیں کہ رسول اللہ اور ان کے متعلقین کو ہر طرح کی آسائش میسر تھی اور اتنا روپیہ پس انداز
ہو جاتا تھا کہ وہ دوسروں پر خرچ کرتے تھے۔ رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آتے تو ایک انصاری
کے گھر سات ماہ تک ٹھہرے۔ ان کا اپنا مکان نہ تھا، نہ مکان بنانے کے وسائل۔ ان کے میزبان
ابوایوب اور دوسرے انصاری مقرب ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے، ان کے پاس
اتنا پیسہ نہ تھا کہ اپنی دوسری ضروریات رفع کرتے۔ ہجرت کے چار ماہ بعد انھوں نے بال بچوں
کو مکہ سے بلایا تو ان کے سفر خرچ کا بندوبست ابوبکر صدیق سے ڈھائی سو درہم قرض لے کر کیا۔[۳]

[۱] انساب الاشراف ۱/ ۲۵ه
[۲] ایضاً ۱/ ۵۲۵، ابن سعد ۱/ ۵۰۴۔
[۳] انساب الاشراف ۱/ ۲۶۹، ابن سعد ۸/ ۶۳

ابوبکر صدیق ہجرت کے وقت دو ڈھائی ہزار روپئے مدینہ لے آئے تھے ہجرت کے ساتویں ماہ ان کا خاندان آیا تو اسے ایک دوسرے انصاری کے گھر ٹھہرایا گیا اور کچھ دن بعد انصاری نقیبوں نے ان کے لئے دو تین کمرے مسجد سے متصل بنوائے تو ان میں نہ اثاثہ تھا نہ گرہستی کا سامان۔ رسول اللہ کی منگنی تین سال پہلے عائشہؓ سے ہوئی تھی، عائشہ کو مدینہ آئے کئی ہفتے گذر گئے لیکن وہ رخصت ہو کر رسول اللہ کے گھر نہ جا سکیں۔ کیوں کہ ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لئے روپیہ نہ تھا، ان کے خسر ابوبکرؓ نے یہ رقم ادا کی تو عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی[1]۔ نئے گھر میں رسول اللہ کے لئے دودھ، کھجور اور کھانا انصاری گھروں سے آتا تھا، کھانا پکانے کا سامان اکثر ان کے گھر میں موجود نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ابوبکر صدیق نے بکری کی ران بھیجی تو اس دن نہ جلانے کے لئے تیل تھا نہ پکانے کے لئے گھی[2]۔ مکہ میں رسول اللہ اپنی دوسری بیوی سودہ، دو لڑکیوں فاطمہ اور ام کلثوم، لے پالک زید بن حارثہ، اُن کے لڑکے اُسامہ بن زید، ابو رافع (مولیٰ) ام ایمن (کھلائی) اور علی بن ابی طالب کے کفیل تھے، یہ سب مدینہ آ گئے تو ان کی کفالت رسول اللہ کے لئے پریشان کن مسئلہ بن گئی۔ ان ایام میں علی حیدر کی ناداری کا حال خود ان کی زبانی سننے کے قابل ہے جاڑوں کی ایک صبح میں گھر سے بھوکا نکلا تو مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے ایک کٹی ہوئی سوراخ دار کھال لی جو گھر میں موجود تھی، اس کے شگاف سے سر نکال کر اسے گلے میں ڈال لیا اور گرمی حاصل کرنے کے لئے اسے سینہ پر باندھ لیا، خدا کی قسم، نہ تو میرے پاس گھر میں کھانے کے لئے کچھ تھا نہ رسول اللہ کے گھر میں، ان کے پاس اگر کچھ ہوتا تو مجھے ضرور اس کی خبر ہوتی، میں مدینہ کی بیرونی بستی میں نکل گیا، ایک یہودی نے اپنے باغ کی دیوار سے سر نکال کر کہا: بدو، کیا ایک ڈول پانی کے بدلے ایک کھجور لے گا؟ میں نے آمادگی ظاہر کی، اس نے باغ کا دروازہ کھول دیا اور میں اندر چلا گیا۔ میں کنوئیں سے ایک ڈول

---

[1] ابن سعد ۸/۶۳

[2] ابن سعد ۱/۲۰۵

پانی نکالتا اور وہ مجھے ایک کھجور دے دیتا، جب میری مٹھی کھجوروں سے بھر گئی تو میں نے کہا: بس میرے لئے اتنی کھجوریں کافی ہیں، انھیں کھا کر میں نے پانی پیا اور رسول اللہ کے پاس مسجد میں چلا گیا جہاں وہ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں (ہجرت سے پہلے مدینہ میں رسول اللہ کے نمایندے) مصعب بن عُمیر سامنے سے نمودار ہوئے، ان کے جسم پر ایک پیوند لگی چادر تھی۔ رسول اللہ نے پیوند دیکھے تو انھیں مکہ میں مُصعب کی ٹھاٹ دار زندگی یاد آگئی جب وہ عطر میں لسے ہوئے عمدہ کپڑے اور اعلیٰ قسم کے جوتے پہنا کرتے تھے[1] اور اب (وہ ایسے مفلس تھے کہ) ان کے تن پر پھٹی ہوئی چادر تھی، اس خیال سے رسول اللہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے[2]۔ ہجرت کے دوسرے سال علی حیدر کی فاطمہؓ سے شادی ہوئی تو وہ بالکل تہی دست تھے، ان کا مہر ایک زرہ بکتر[3] دو سو پچاس روپے میں بیچ کر ادا کیا گیا جو رسول اللہ نے انھیں عطا کی تھی، اسی رقم سے رسول اللہ نے فاطمہؓ کے لئے خانہ داری کی کچھ ضروری چیزیں مہیا کیں۔

رسول اللہ کے کئی درجن ہاشمی و مطلبی رشتہ دار اور دوسرے قریشی مع بال بچوں کے مدینہ آگئے تھے، ان میں سے اکثر مکہ کے خوش حال تاجر تھے، معدودے چند کو چھوڑ کر مدینہ میں تقریباً سب ہی بے سروسامان پریشاں حال اور مختلف قسم کی معاشی اور سماجی زحمتوں سے دوچار تھے۔ انصار نے عارضی طور پر انھیں اپنے گھروں میں ٹھہرا لیا تھا اور ان کے کھانے پینے کا کلی یا جزئی بندوبست بھی کرتے تھے لیکن عرصہ تک نوواردوں کے قیام و طعام سے عہدہ برآ ہونا ان کے بس سے باہر تھا، ان کے چند خاندان ہی مرفہ الحال تھے، باقی کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں، وہ زراعت، نخلستانوں، دستکاری، معمولی تجارت کے ذریعہ روزی حاصل کرتے تھے۔ سال میں کچھ ہفتے ایسے بھی گذرتے جب اُن کے پاس پیٹ بھرنے

---

[1] استیعاب (ابن عبدالبر، حیدرآباد) ۱/ ۳۷۹

[2] کنزالعمال (متقی بُرہان پوری، حیدرآباد) ۳/ ۳۲۱

[3] ایضاً ۷/ ۱۱۱

کے لئے کھجور کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میزبان و مہمان کے تعلقات کچھ دن خوشگوار رہے پھر پیچیدگیاں اور بدمزگیاں پیدا ہونے لگیں اور انصار کا غیر ہمدرد طبقہ اور خاص طور پر وہ نمائشی مسلمان جنہیں قرآن میں منافق کا لقب دیا گیا ہے مہاجرین کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ مکہ کے معزز، متمول اور دوسروں کو کھلانے پلانے والے باوقار، باتمکین ہاشمی و قرشی رشتہ داروں کو افسردہ محتاج اور انصار کا دست نگر دیکھ کر رسول اللہ کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔

اپنی اور اپنے متعلقین کی بے سروسامانی، ہاشمی وغیر ہاشمی مہاجرین کی خستہ حالی کے علاوہ رسول اللہ کی فکروں میں مدینہ کے ایک نو مسلم طبقہ نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا، یہ طبقہ شہر کے بے سہارا اور ادھر اُدھر سے آئے ہوئے عربوں پر مشتمل تھا جو ایک خوش حال زندگی کی امید میں مسلمان ہو گئے تھے، ان کے ہاتھ میں نہ پیسہ تھا، نہ جسم پر کپڑا، نہ پیر میں جوتا، ان کی ایک جماعت کی نشست و برخاست مسجد نبوی کے سائبان میں تھی، یہ لوگ ننگے جسم، ننگے پیر، ننگے سر دن میں ادھر اُدھر مزدوری کی تلاش میں نکل جاتے تھے یا جنگل سے ایندھن جمع کر کے بیچتے تھے، ننگے جسموں ہی سے نماز پڑھتے، انھیں کبھی مزدوری ملتی ہی نہ تھی اور کبھی اتنی کم ملتی کہ ان کا گذارا نہ ہوتا تھا، انھیں کبھی رسول اللہ کے گھر کچھ کھانے کو مل جاتا، کبھی انصاری گھروں سے، یہ لوگ زیادہ تر بھوکے رہتے تھے، کھانے، کپڑے اور پیسہ کے لئے ان کی نظریں رسول اللہ کی طرف اٹھتیں لیکن وہ ان کی مدد کرنے سے خود کو قاصر پاتے۔

ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد جب رسول اللہ قریش سے لڑنے بدر روانہ ہوئے تو ان کی زبان پر یہ دعا تھی: مالک، میرے ساتھیوں کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں، انھیں سواری عطا کر، ان کے پاس کپڑا نہیں، انھیں کپڑا دے، وہ بھوکے ہیں، انھیں پیٹ بھر کھانا دے، وہ مفلس ہیں انھیں دولت عطا کر۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّھُم حُفَاۃٌ فَاحمِلْھُم، اِنَّھُم عُرَاۃٌ فَاکسُھُم، اللھم انھم جیاع فأشبِعھم وعالۃ فأغنِھم[1]۔

اعلان نبوت کے تیرھویں سال انصار کے جن بہتر نمائندوں نے بیعت کی تھی وہ ادس

---

[1] ابن سعد ۲/۲۰، مغازی (واقدی، کلکتہ) صفحہ ۱۹، ابن عبد الحکم (تاریخ مصر، لائڈن) صفحہ ۲۹۵

وخزرج کے سارے نمایندوں پر مشتمل نہیں تھے، ان دونوں قبیلوں کی ایک اقلیت کے نمایندے بیعت میں شریک ہوتے تھے۔ بیعت کرنے والوں میں معدودے چند کو چھوڑ کر جو پختہ کارسن رسیدہ اور صف اول کے لیڈر تھے باقی دوسرے اور تیسرے درجہ کے ادھیڑ و جوان لوگ تھے، جن کا مقصد رسول اللہ کی قیادت میں ابھرنا اور اپنی قوم میں رسوخ بڑھانا تھا۔ اقلیت کے نمایندوں کو اسلام یا رسول اللہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں سے کچھ حنیفی مُوحد تھے، بعض کا رجحان عیسائیت کی طرف تھا اور بیشتر یہودی نظریات وعقائد سے متاثر تھے۔ انھوں نے اکثریت کے دباؤ میں آکر اسلام قبول کرلیا تھا لیکن وہ ہر معاملہ میں رسول اللہ کی بے چون وچرا اطاعت کرنے کو تیار نہیں تھے انھیں یہ بات بھی کھٹکتی تھی کہ رسول اللہ نے انھیں نظر انداز کرکے اُن سے کم عمر، کم تجربہ اور کم صلاحیت لوگوں کو اپنا مقرب اور قبائلی لیڈر (نقیب) بنالیا تھا، ان میں سے بعض کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے رسول اللہ کی بے چون وچرا اطاعت کی تو ان کے مفادات کو نقصان پہنچے گا اور قبیلہ میں ان کا اثر ورسوخ کم ہوجائے گا، بعض کا خیال تھا کہ بہت سے مقامی اور قبائلی معاملات میں ضروری ہے کہ رسول اللہ کی رائے سے ان کے عدم تجربہ یا ناواقفیت کی بنا پر اختلاف کیا جائے اور انھیں مناسب مشورہ دیا جائے۔

مکہ سے روانہ ہوکر رسول اللہ سب سے پہلے مدینہ کے باہر اوس کی ایک وسیع شاخ عمرو بن عوف کے محلہ میں اُترے، یہاں ان کی پذیرائی سعد بن خیثمہ نے کی جنھیں بیعت عقبہ کے موقع پر رسول اللہ نے عمرو بن عوف کا رسمی لیڈر (نقیب) مقرر کیا تھا، یہاں قریب دو ہفتے قیام کے دوران ان کی ملاقات قبیلہ کے ایک معمر پختہ کار زعیم ابو عامر راہب سے ہوئی، ابو عامر بیعت عقبہ میں شریک نہیں ہوا تھا اس نے قبیلہ کے دباؤ میں آکر بادل ناخواستہ اسلام قبول کرلیا تھا اور ایک خبر یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوا ہی نہیں تھا، اسے مذاہب کے مطالعہ کا شوق تھا، عیسائی راہبوں اور یہودی علماء سے مذہبی گفتگو کیا کرتا تھا، گاہے گاہے شام جاتا اور وہاں کے ممتاز راہبوں سے ملتا، وہ خود ابراہیمی توحید کا قائل تھا۔ موٹے اون کے کپڑے پہنتا اور سادہ راہبانہ

زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے رسول اللہ سے پوچھا: محمدؐ تمھارا کیا مذہب ہے؟ رسول اللہ: وہی جو ابراہیم کا تھا، توحید خالص۔ ابو عامر: میں تو پہلے سے اس پر عامل ہوں۔ رسول اللہ: تم کہاں اس پر عامل ہو! ابو عامر: میرا اسی پر عمل ہے، البتہ تم نے ابراہیمی مذہب میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں داخل کر دی ہیں۔ رسول اللہ: میں نے ابراہیمی مذہب کو آلودگیوں سے پاک وصاف کر دیا ہے[1]۔ ابو عامر رسول اللہ کی گفتگو سے مطمئن نہیں ہوا، رسول اللہ اس سے بے چون وچرا اطاعت چاہتے تھے، وہ اس کے لئے تیار نہ تھا، محلہ میں اس کے ہم خیال دوسرے ممتاز لوگ بھی اس کی طرح رسول اللہ سے بدظن تھے، اُن کے اشارہ سے کچھ لوگ رات میں رسول اللہ پر اینٹیں بھی پھینکا کرتے تھے[2]۔ رسول اللہ نے اپنی حفاظت کے لئے اپنے رشتہ دار خزرجی خاندان بنو نجار کو طلب کیا، ان کے بہت سے جوان مسلح ہو کر آگئے، بنو نجار میں رسول اللہ کے دادا عبدالمطلب کی ننھیال تھی، رسول اللہ اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہو کر روانہ ہوئے، ان کے راستہ میں ایک دوسرا انصاری محلہ آیا، وہاں بیر محلہ قسم کے لوگوں نے جو بیعت عَقَبہ میں شریک ہوئے تھے انھیں اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دی، یہ محلہ چھوٹا تھا، رسول اللہ کو حفاظت کا انتظام ناکافی نظر آیا، وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ اونٹنی مامور ہے یعنی اسی جگہ رُکے گی جہاں خدا کی طرف سے اسے رُکنے کا حکم ہے۔ انھوں نے عبداللہ بن اُبَیّ بن سَلُول کے محلہ کا رُخ کیا، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا عبداللہ ایک تجربہ کار صلح پسند، دور اندیش، بارسوخ خزرجی لیڈر تھا، جس کا احترام اوس وخزرج کے دونوں قبیلے کرتے تھے۔ عبداللہ نے بیعت عَقَبہ والا حج اپنے بہت سے متبعین کے ساتھ کیا تھا لیکن اسے بیعت کا علم نہیں تھا، نشر انصاریوں نے اس سے بیعت مخفی رکھی تھی، انھیں پہلے سے عبداللہ کی رائے معلوم تھی کہ وہ رسول اللہ کے مدینہ آنے کے حق میں نہیں ہے، اسے بہت سے اندیشے

---

[1] سمہودی (وفاء الوفاء، مصر) ۱/۲۱۹، دیار بکری (تاریخ الخمیس، مصر) ۲/۱۳۰
[2] یعقوبی ۲/۴۱

لاحق تھے۔ ان میں سے ایک اس کے لئے سخت حوصلہ شکن یہ اندیشہ تھا کہ رسول اللہ کے آنے سے دونوں قبیلوں میں اس کے وقار، رسوخ اور حاکمانہ اقتدار کو کاری ضرب لگے گی۔ عبداللہ اپنی مزاحم نامی گڑھی کے باہر جسم پر چادر لپیٹے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، رسول اللہ نے اونٹنی روکی اور عبداللہ کے پاس جاکر کہا: میں تمھارے ساتھ ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ عبداللہ نے حیرت اور خفگی سے کہا: اُن لوگوں کے ساتھ جاکر ٹھہرو جنھوں نے تمھیں بلایا ہے[1]۔

ابو عامر راہب سے رسول اللہ کے تعلقات کشیدہ ہوتے چلے گئے، وہ برملا ان پر اعتراض کرتا تھا اور ان کی قیادت کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا، ہجرت کے چند ماہ بعد ایک وقت ایسا آیا جب رسول اللہ سے اس کے تعلقات سخت ناخوشگوار ہوکر منقطع ہوگئے اور اپنے خاندان کے پچاس ہم خیال لوگوں کے ساتھ وطن چھوڑکر مکہ چلا گیا، وہاں قریش کے مخالف کیمپ میں ضم ہوا۔ اور دو سال بعد جنگ اُحد میں بڑی گرمجوشی سے رسول اللہ کے خلاف لڑا۔ ابو عامر اپنی قوم (عمرو بن عوف) میں بہت سے ہم خیال وہم نوا چھوڑ گیا تھا جو رسول اللہ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے تھے اور ان کے بداندیش تھے۔ ابو عامر کے برخلاف عبداللہ بن اُبَیّ بن سَلُول رسول اللہ سے اُلجھتا نہیں تھا، نہ منہ در منہ ان پر اعتراض کرتا تھا، وہ اپنے مصاحبوں کے حلقوں میں ان پر نقد کرتا تھا اور بہت سے معاملات میں اپنے متبعین کو رسول اللہ سے عدم تعاون کا مشورہ دیتا تھا۔

صفِ اول کا ایک اور اوسی لیڈر جو رسول اللہ کی بے چون وچرا اطاعت کے لئے تیار نہیں ہوا ابو قیس صیفی بن اَسلَت تھا، وہ شاعر تھا اور ابو عامر راہب کی طرح موحد بھی، اوس کی ان چار شاخوں کے اکابر میں اسے حاکمانہ اقتدار حاصل تھا: اُمَیَّہ بن زید، خَطمہ، وائل اور واقِف۔ ابو عامر راہب کے برخلاف ابو قیس نے رسول اللہ کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی لیکن وہ مسلمان بھی نہیں ہوا، رسول اللہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھتے تو وہ واہ واہ کرتا اور جب اسلام

---

[1] سمہودی ۲/ ۲۵۸

لانے کو کہتے تو جھوٹا وعدہ کر کے چلا جاتا۔ ابو قیس اور اس کے زیر اثر چاروں شاخوں کے محلے مدینہ کی یہودی بستیوں سے ملے ہوئے تھے اور ان دونوں کے درمیان ازدواجی و اقتصادی روابط مستحکم تھے۔ یہ چاروں شاخیں یہودی نظریات و رجحانات سے بھی متاثر تھیں۔ رسول اللہ کے استیصال کے لئے ان کے اکابر مدینہ کے یہودیوں سے سازباز کرتے رہتے تھے اور قریش نیز نجد کے متعدد طاقت ور قبیلوں (غطفان، فزارہ، مرہ، سلیم، اسد) کو رسول اللہ کے خلاف بھڑکاتے تھے جس کے نتیجہ میں خندق کا معرکہ ہوا۔ سنہ ۲ھ سے سنہ ۵ھ تک جب ان کے پڑوسی دوست یہودی قبیلوں کی جلاوطنی اور تباہی رسول اللہ کے ہاتھوں مکمل ہو چکی اور دوسری طرف خندق کے معرکہ میں رسول اللہ کے استیصال کے لئے قریش کی تیسری بڑی کوشش ناکام ہوئی اور مدینہ کی مسلم اکثریت کا ان اکابر پر خشمناک دباؤ بڑھا تو یہ اور ان کے ماتحت اوسی عرب مجبور ہو کر مسلمان ہو گئے لیکن ابو قیس صیفی مرتے وقت تک رسول اللہ کی بے چون و چرا اطاعت سے بچنے کے لئے اسلام سے گریز کرتا رہا۔[۱]

رسول اللہ کو توقع تھی جیسا کہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر انصاری نقیبوں نے انھیں باور کرایا تھا کہ مدینہ کے یہودی قبیلے قینقاع، نضیر اور قریظہ مسلمان ہو جائیں گے۔ رسول اللہ مدینہ آنے کے چند دن بعد ہی یہودی اکابر اور مذہبی علماء سے ملے اور انھیں بتایا کہ میں نبی ہوں، وہی نبی جس کے مبعوث ہونے کی تم پیش گوئی کرتے تھے، توراۃ میں جس کے وہی آسمانی صفات بیان کئے گئے ہیں جو مجھ میں موجود ہیں، میں توحید خالص کی دعوت دیتا ہوں جسے ابراہیم، اسماعیل اور موسیٰ نے پیش کیا تھا۔ یہودی اکابر نے کہا کہ ہمیں اپنا مذہب بہت عزیز ہے، ہم اسے کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتے، ہم پہلے ہی سے توحید کے قائل ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، ہمارے مذہب میں وہ خوبیاں ہیں جو تمھارے مذہب میں نہیں ہیں . . . . یہودی علماء نے کہا کہ تم وہ نبی نہیں ہو جس کی ہم پیش گوئی کرتے تھے، نہ تم میں وہ صفات موجود ہیں جو مبعوث ہونے والے نبی کی توراۃ میں بیان

---

[۱] ابن ہشام ص۲۹۳ طبری ۲/۴۴

کی گئی ہیں، جس نبی کی ہم پیشین گوئی کرتے رہے ہیں وہ اسرائیلی نسل کا ہوگا عرب نہیں ہوسکتا اور اس میں وہ ساری صفات بدرجۂ اتم موجود ہوں گی جو توراۃ میں بیان کی گئی ہیں، یہودی عالموں نے رسول اللہ سے مذہب، خدا، روح اور پچھلے انبیاء کے بارے میں بہت سے سوالات کئے اور ان کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے انھیں رسول اللہ میں نبی کی جھلک نظر نہیں آئی، چند یہودی اشخاص نے شخصی مفاد یا کسی مصلحت کے زیر اثر اسلام قبول کرلیا اور شاید ایک دو کے سوا کوئی یہودی دل سے رسول اللہ پر ایمان نہیں لایا۔ رسول اللہ کئی ماہ تک یہودیوں سے اپنی نبوت کا اعتراف کرانے کی کوشش کرتے رہے، ان کی استمالت کے لئے وہ پہلے سے ہی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے تھے، اب ان کی مزید تالیف قلب کے لئے وہ عاشوراء کا روزہ رکھنے لگے اور متعدد یہودی شعائر اسلام میں داخل کرلئے مثلاً رمضان کے روزے، چار رکعتی نماز، خون و مُردہ کی حرمت اور رجم زانی، اس کے باوجود انھیں یہودیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، یہودی اکابر اور علماء انھیں اپنے مذہب، آزادی، اور خوش حالی کے لئے سنگین خطرہ تصور کرتے تھے۔

رسول اللہ کو امید تھی اور بیعت عَقَبَہ میں شریک ہونے والے مَدنی اعیان نے انھیں اطمینان بھی دلایا تھا کہ مدینہ کے پڑوس اور مضافات کے سارے عرب قبیلے اسلام لے آئیں گے، مدینہ کے قریب چند قبیلوں کے اوس و خزرج سے باہمی مدد کے معاہدے بھی تھے، بیعت عَقَبَہ کے بعد ان قبیلوں میں اسلام پھیلانے کا کام شروع ہوگیا تھا لیکن قبول اسلام کی رفتار بہت سست تھی، عرب کی نفسیات، جس کی تخلیق نامہربان طبعی حالات سے ہوئی تھی مذہب کے قیود اور نبی کی بے چون و چرا اطاعت سے اِبا کرتی تھی، آزادی فکر و عمل پر ہی اس کی بقا کا دار و مدار تھا اور مذہب و نبی ان دونوں کی راہ میں سنگِ گراں تھے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ نے مدینہ کے پڑوس و مضافات کے عرب قبیلوں مُزینہ، جُہینہ، اسلم، اشجع، غِفار، سُلیم، عَبْس، ذُبیان اور فزارہ میں اسلامی دعوت زیادہ وسیع پیمانہ پر شروع کردی، اس کے اجزائے ترکیبی تین تھے۔ توحید، نماز اور اقرار نبوت، کچھ عرصہ بعد اس میں روزہ کا بھی اضافہ ہوگیا، عربوں کے لئے زکاۃ کے بعد اسلام کی سب سے مشکل اور ناقابل قبول قید اقرار نبوت تھی

جس کے معنی تھے مدینہ کے ایک عرب کی بے چون و چرا اطاعت، نہ عام عرب اپنے فکر و عمل پر یہ بیڑی ڈالنے کے لئے تیار تھا، اس کے قبائلی سردار جنھیں قرابت میں اپنے حاکمانہ اقتدار اور آزادی عمل کی موت نظر آتی تھی۔ چند عرب قبیلے جیسے جُہینہ اور مُزینہ انصاری اکابر کے دباؤ میں آکر جن کے وہ زیرِ اثر تھے اور جن سے ان کے باہمی معاہدے تھے بُرے دل سے مسلمان ہو گئے، باقی نے نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کی وفاداری کا حلف لینے سے انکار کر دیا بلکہ انھیں اپنی آزادی و خود مختاری کے لئے خطرہ سمجھ کر ان کے خلاف جارحانہ حرکتیں کرنے لگے اور جب موقع ملتا مسلمان تاجروں، مسافروں اور مدینہ کے باہر چرنے والے مویشیوں کو لوٹ لیتے تھے۔

مختصراً یہ تھی نوعیت ان اقتصادی، قیادتی اور مذہبی مشکلات کی جن سے ہجرت کے بعد رسول اللہ دوچار ہوئے، عرب معاشرہ میں اس شخص کی سرداری تسلیم کی جاتی تھی جو خوب مال دار، طاقت ور اور فیاض ہوتا تھا، ایسے شخص کی عزت ہوتی تھی، رُعب مانا جاتا تھا اور اطاعت کی جاتی تھی، رسول اللہ نے دیکھا کہ مدینہ اور باہر کے بہت سے عرب ان کی مالی بے بضاعتی کے باعث نہ انھیں نبی مانتے ہیں نہ ان کی عزّت کرتے ہیں نہ ان کی اطاعت کرنے کو تیار ہیں، ان حالات میں انھیں معاشی توانائی حاصل کرنے اور اپنی مادی طاقت بڑھانے کا شدت سے احساس ہوا، انھیں یقین ہو گیا کہ جب تک وہ اور ان کے مہاجر رشتہ دار اور ساتھی مفلس و قلاش ہیں، کھانے پینے تک کے لئے انصار کے محتاج، اس وقت تک نہ ان کی بے چون و چرا اطاعت ہو سکتی ہے نہ ان کی اسلامی تحریک فروغ پا سکتی ہے، انھیں یہ بھی یقین ہو گیا کہ جن حالات سے وہ گھرے ہوتے ہیں ان میں معاشی توانائی حاصل کرنے اور مادی وسائل بڑھانے کا عملی طریقہ یہ ہے کہ مخالفوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے اور انھیں شکست دے کر ان کی دولت اور وسائل پر قبضہ کر لیا جائے، ہجرت کے ساتویں ماہ[1] مخالفوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی بذریعہ وحی ان الفاظ میں اجازت مل گئی۔ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (حج) (رسول اللہ اور ان کے مہاجر ساتھیوں کو لڑائی کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے (وطن سے نکلنے پر مجبور کر کے) اور بلاشبہ خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ اگلے سال قرآن نے مخالفوں سے جنگ و قتال ایک مذہبی فریضہ قرار دے دیا۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال) (کافروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر ختم ہو جائے اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب باقی نہ رہے۔

---

[1] تفسیر طبری مصر ۲۴۹/۱۷، التنبیہ والاشراف (مسعودی لائمن) صفحہ ۲۳۵، ابن کثیر ۲۴۲/۳

جنگ وقتال کی اجازت پاکر رسول اللہ نے سب سے پہلے قریش کے تجارتی قافلہ پکڑنے کی طرف توجہ مبذول کی ۔ قریش کے قافلے ہفتوں کے وقفہ سے برابر شام کے مختلف شہروں کو آتے جاتے رہتے تھے ۔ مکہ سے شام جانے والی تجارتی شاہراہ مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں بحرِ قلزم کی ساحلی پٹی سے ہو کر گذرتی تھی ۔ ہجرت کے ساتویں ماہ رسول اللہ کے جاسوسوں نے خبر دی کہ قریش کا ایک قافلہ بہت سا تجارتی سامان لیکر شاہراہ سے گذرنے والا ہے ۔ رسول اللہ نے اپنے چچا حمزہ بن عبدالمطلب کی قیادت میں ایک ٹولی بھیجی جس میں تیس نادار مہاجر تھے ، انصاری کوئی نہ تھا ۔ ٹولی کو سامان چھیننے کا موقع نہیں ملا ۔ قافلہ بہ سلامت مکہ نکل گیا ۔[1]

اس کے بعد اگلے چھ ماہ میں چھ دستے بیس سے دو سو آدمیوں پر مشتمل قریش کے شام آنے جانے والے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے کے لئے مدینہ سے بھیجے گئے لیکن ہر بار قریشی لیڈر اپنا قافلہ بچا کر صاف بخیریت نکل گئے ۔ ان میں سے چار دستوں کے قائد خود رسول اللہ تھے ۔ ان دستوں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ قریشی قافلہ سالار خوب چوکنا ہو کر اور موثر حفاظتی تدابیر اختیار کرکے گذرتے تھے ۔ جبکہ رسول اللہ کے دستے ناکافی ہتھیاروں اور باربرداری کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث اتنی تاخیر سے مقررہ جگہ پہنچے کہ قافلہ ان کی دست برد سے باہر نکل چکا ہوتا ۔

پہلا مالِ غنیمت ہجرت کے سترھویں ماہ رسول اللہ نے آٹھواں دستہ مکہ کے مشرق میں بطن نخلہ کے علاقہ میں بھیجا ۔ اس میں بارہ مہاجر تھے ، رسول اللہ کو خبر ملی تھی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ طائف سے مکہ کی طرف جانیوالا ہے یہ رجب کا مقدس مہینہ تھا جسمیں لڑائی جھگڑا اور لوٹ مار ممنوع تھی ۔ جب دستہ قافلہ کے قریب پہنچا تو قافلہ کا لیڈر انہیں لٹیرا سمجھ کر حفاظتی اقدامات کرنے لگا ۔ دستہ کے ایک رکن نے چال چلی ، اس نے اپنا سر منڈا دیا اور ظاہر کیا کہ حج یا عمرہ کرنے مکہ جارہا ہے ۔ حج او عمرہ سے پہلے عربوں میں بال کٹوانے کا دستور تھا ۔ قافلہ کا لیڈر یہ دیکھ کر بے خوف ہو گیا ۔ اور اس نے احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کیں ۔ موقع پاکر دستہ کے قائد عبداللہ بن جحش قافلہ پر ٹوٹ پڑے اور سامان سے لدے ہوئے اونٹ مدینہ لے آئے ۔ اس قافلہ میں شراب ، چمڑے کا سامان اور کشمش تھی ۔ طائف ان تینوں کی اہم منڈی تھا ۔ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے ۔ چار حصے دستے کے ارکان نے لیلئے اور ایک حصہ رسول اللہ کو دیدیا ۔ یہ پہلی فوجی مہم تھی جسمیں مالِ غنیمت حاصل ہوا ۔[2]

---
[1] ابن سعد ۲/۲ [2] ایضاً

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
تقسیم کے بعد
(۱۴)

از سعید احمد اکبر آبادی

یونیورسٹی کی ایک قدیم روایت ہے کہ جلسۂ تقسیم اسناد (convocation) کے موقعے پر چانسلر، وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور مہمان خصوصی، یہ سب ترکی ٹوپی بر سر اور رنگین وطلا جبہ در بر ہوتے ہیں، افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا ہے جو یونیورسٹی کے قاری کرتے ہیں، پھر جب ہر فیکلٹی کا ڈین اپنے ہاں کے کامیاب امیدواروں کو وائس چانسلر کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس وقت اس کا خطاب وائس چانسلر سے اور اس کے جواب میں وائس چانسلر کا اعلان کہ میں ان طلبار کو ڈگری دینا منظور کرتا ہوں، یہ سب کچھ عربی زبان میں ہوتا ہے، ان دونوں کے لئے مخصوص عربی عبارتیں ہیں جو بعینہا محفوظ چلی آرہی ہیں، جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ہر ڈین اور وائس چانسلر کو یہ عربی عبارت بر لوک زبان یاد کرنی ہوتی ہے، زیدی صاحب کو اسلامی کردار تو بڑی چیز ہے، یونیورسٹی کے روایتی کردار تک کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ کورٹ کی میٹنگ میں ایک صاحب نے رزولیشن پیش کیا کہ کنووکیشن کے موقع پر ڈین اور وائس چانسلر جو فقرے عربی میں پڑھتے ہیں وہ اردو میں پڑھیں، لیکن زیدی صاحب نے اس پر بحث کی مزید

بھی محسوس نہیں کی اور ان کی درخواست پر محرک نے تجویز واپس لے لی، اسی طرح کورٹ میں ایک مرتبہ موسیقی کا ایک شعبہ قائم کرنے کی ایک صاحب نے تجویز پیش کی تو معمولی گفتگو کے بعد زیدی صاحب کے ایما پر محرک نے اسے بھی واپس لے لیا۔

زیدی صاحب کو مسلمانوں کی زبوں حالی اور پسماندگی کا شدید غم اور دکھ ہے انھوں نے مجھ سے بارہا کہا: مولانا! کوئی مسلمان لڑکا جو فرسٹ کلاس ہو، چاہے وہ کیسے ہی غریب گھرانہ کا ہو میرے پاس لے آئیے، میں اس کو ضائع نہ ہونے دوں گا، اور فی الحقیقت ہوا بھی ایسا ہی! متعدد لڑکوں کو میں جانتا ہوں کہ انتہائی غریب گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فرسٹ کلاس تھے، زیدی صاحب نے ان لڑکوں کی ہر قسم کی مدد کی اور آج یہ لڑکے ہندو بیرون ہند میں عزت اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا نواب علی یاور جنگ کے زمانہ میں جو فتنہ و فساد ہوا اس کا سبب ہی یہ تھا کہ انجینرنگ کالج میں مقامی طلبار کا جو کوٹہ مقرر تھا نواب صاحب اسے ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے برعکس زیدی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ یونیورسٹی کے مڈیکل کالج کے ہاسپٹل کے لئے اتر پردیش گورنمنٹ کو رقم دینی تھی، لیکن گورنمنٹ نے شرط یہ لگائی کہ مڈیکل کالج میں داخلہ کے لئے یونیورسٹی کے طلبار کا کوئی کوٹہ نہ ہوگا۔ زیدی صاحب نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، بہت دنوں تک بات چیت چلتی رہی، گورنمنٹ اپنے موقف سے نہیں ہٹتی تھی اور زیدی صاحب اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے تھے، آخر گورنمنٹ کو زیدی صاحب کے مطالبہ کے مطابق پچاس فی صدی کا کوٹہ تسلیم کرنا پڑا: ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ستمبر ۶۲ء میں جب میں ایک برس کی رخصت پر کناڈا جانے لگا اور روانگی سے پہلے کی شب میں ایس ایس ہال کے ڈائننگ ہال میں میرا وداعیہ ڈنر ہوا تو مختلف شعبوں کے پروفیسروں اور اساتذہ وغیرہم کے ساتھ زیدی صاحب بھی اس میں شریک تھے اور ڈنر کے ختم پر میری نسبت اپنے مشفقانہ خیالات اور جذبات کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ یونیورسٹی کے تعلق سے یہ میری اور ان

کی آخری ملاقات تھی، میں کناڈا میں ہی تھا کہ زیدی صاحب اپنے عہدہ کی مدت پوری کرکے سبکدوش ہوگئے، علی گڑھ واپس پہونچا تو سنا کہ زیدی صاحب کو علی گڑھ سے رخصت کرتے وقت اساتذہ اور طلبار نے اپنے قلبی رنج وملال کا اور ان کی ذات کے ساتھ محبت اور احترام کا جو عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے وہ یونیورسٹی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں یونیورسٹی کے چند اعلیٰ عہدہ دار | اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ زیدی صاحب نے یہ سب کارنامے تن تنہا اور بنفس نفیس انجام دے ڈالے، درحقیقت کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا قابل اور لائق اور مضبوط عزم وارادہ کا انسان ہو، کسی ادارہ کی ذمہ دارانہ خدمت کے عہدہ سے اس وقت تک سبکدوش ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے ساتھ اچھے رفقاء کی ایک جماعت نہ ہو اور اس کو ان سب کا تعاون حاصل نہ ہو، ایک اعلیٰ درجہ کے ایڈمنسٹریٹر کی پہچان یہی ہے کہ وہ خود محنت، ایمانداری اور قابلیت سے کام کرتا ہے اور اپنی پسند کے ساتھی منتخب کرکے ان سے کام لیتا اور ان کی رفاقت سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھاتا ہے[1]، اس بنا پر ضروری ہے کہ اس عہد کے اُن چند اعلیٰ عہدہ داران یونیورسٹی کا بھی اس موقع پر تذکرہ کیا جائے۔ جو زیدی صاحب کے دست وبازو اور دل سے ان کے معاون اور مددگار تھے، اس سے آپ کو اس زمانہ کے یونیورسٹی کے ماحول اور فضا کا بھی اندازہ ہوگا۔

---

[1] جب میں ۱۹۴۹ء میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل مقرر ہو کر وہاں پہونچا تو میرے استاذ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب (دہلی یونیورسٹی) مرحوم نے مجھکو کراچی سے مبارکباد کا خط لکھا اور تحریر فرمایا: اس بات کو نہ بھولنا کہ تمھاری کرسی وہ ہے جس پر دس برس تک سر ڈینی سن راس بیٹھا ہے، لیکن ڈینی سن راس دوسروں سے خوب کام لیتا اور خود کام کم کرتا تھا، تم سے امید ہے کہ تم خود بھی کام خوب کروگے انشاء اللہ دوسروں سے بھی اسی طرح کام لوگے۔

سیدنا طاہر سیف الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ | سیدنا اس زمانہ میں یونیورسٹی کے چانسلر تھے، اگرچہ وہ مسلمانوں کے ایک خاص مذہبی فرقہ کے امام اور روحانی پیشوا تھے، لیکن نہایت متقی اور پرہیزگار اور عابد شب زندہ دار تھے، معمولی شعائر اسلام کا بھی بہت خیال رکھتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے مغرب کی نماز اور اس کے بعد اوراد و وظائف سے ایک گھنٹہ سے کم میں فارغ نہیں ہوتے تھے۔ ان کے دل میں پوری ملت اسلامیہ کا بڑا درد اور اس کے مسائل و معاملات کا بڑا احساس تھا، ان کا ابر کرم ہند اور بیرون ہند کے اسلامی اداروں پر برستا رہتا تھا، علی گڑھ یونیورسٹی کی بھی لاکھوں سے مدد کی، وہ محض خانہ پری کے لئے چانسلر نہیں تھے، بلکہ یونیورسٹی کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے اور صلاح و مشورہ میں برابر شریک رہتے تھے، میرے زمانۂ قیام میں علی گڑھ کئی مرتبہ تشریف لائے، اس موقع پر اساتذہ وغیرہم سب سے ملتے اور یونیورسٹی کے معاملات پر گفتگو فرماتے، دینیات کی فیکلٹی میں جو کام ہو رہا تھا اس سے واقف تھے اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، ایک مرتبہ مجھکو خاص طور پر تنہائی میں یاد فرمایا اور اسلام اور مسلمانوں پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، اسی اثنا میں میں نے عرض کیا کہ میں فیکلٹی آف تھیالوجی کو اسلامی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ایک مرکز (INSTITUTE OF ADVANCED ISLAMIC STUDIES) کی شکل میں دیکھنے کا متمنی ہوں اور اس کے بعد میں نے اس کا خاکہ پیش کر کے عرض کیا کہ کم از کم پچیس لاکھ روپیہ سے اس کا آغاز ہو سکتا ہے، تو چند سوالات اور ان کے جوابات کے بعد مسرت کے اظہار کے ساتھ فرمایا:
"آپ اللہ کا نام لے کر شروع کیجئے اور یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے ماتحت مختلف مراحل و منازل سے گزرنے کے بعد جب اسکیم پختہ ہو جائے تو چند روز کے لئے میرے پاس بمبئی چلے آئیے۔"
مگر افسوس ہے ۱۹۶۵ء میں ایک شدید زلزلہ آیا تو سارے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بساط کہن ہی الٹ گئی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

سیدنا یونیورسٹی کے جس کسی فنکشن میں شرکت فرماتے وہاں طلباء اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ

ننگے سران سے سامنا نہ ہو، ان کو اس طرح کی باتیں بہت بری لگتی تھیں، علی گڑھ میں قیام کے دنوں میں ایک روز ضرورتمند طلبار کی ملاقات کے لئے مخصوص ہوتا تھا، پہلے سے دن اور وقت کا اعلان ہوجاتا اور اس کے مطابق جناب موصوف اپنے سکریٹری اور اکاونٹنٹ کے ساتھ مولانا آزاد لائبریری میں آکر بیٹھ جاتے طلبار یکے بعد دیگرے اپنی درخواست کے ساتھ ان کے سامنے پیش ہوتے اور آپ درخواست پڑھوا کر سننے کے بعد اس پر حکم صادر فرماتے اور اکاونٹنٹ حکم کی فوراً تعمیل کر دیتا، اس طرح سینکڑوں طلبار کی ضرورت رفع ہوجاتی اور بے ساختہ ان کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔

نواب سر احمد سعید خاں آف چھتاری نواب صاحب اس زمانہ میں پرو چانسلر تھے اور آج کل چانسلر ہیں۔ نواب صاحب سرسید کی بزم کہن کی وہ شمع روشن ہیں کہ اگر کوئی پوچھے کہ سرسید علی گڑھ سے کس قسم کے لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے تو "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے مطابق فوراً بے تکلف نواب صاحب کی طرف اشارہ کر دیجئے اور فخر سے کہئے: "ایسے" سرسید کا اصل مقصد و منشا علامہ اقبال کے لفظوں میں "دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست" کے سوا اور کیا تھا! نواب صاحب جنھوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہیں[1] اس مصرع کا صحیح مصداق ہیں، انگریزوں کے زمانہ میں کسی صوبہ کا گورنر یا حیدر آباد ایسی عظیم ریاست کا وزیر اعظم ہوجانا ایک ہندوستانی کی معراج تھی، نواب صاحب ان دونوں پر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فائز رہے، ساتھ ہی عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان۔ اسلامی اخلاق و عادات اور مشرق کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ کا ایک پیکر حسین بھی، قرآن مجید کے حافظ ہیں اور اس کا اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ گورنری کے زمانہ میں بھی محراب سنانی ناغہ نہیں کی، تین برس پہلے عید کے موقع پر میں حاضر

---

[1] آپ کی تاریخ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۸۸۹ء ہے، اس حساب سے سرسید کے انتقال کے وقت آپ نو برس کے تھے۔

ہوا تو مسرت کے ساتھ فرمایا: میں نے اس سال ۶۹ ویں محراب سنائی ہے، بے شبہ: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔ پھر خود نواب صاحب نہیں، بلکہ عورتیں اور مرد، بوڑھے اور جوان چھوٹے اور بڑے سب ہی دیندار اور کٹر مذہبی ہیں۔ نواب صاحب کو یونیورسٹی سے محبت نہیں عشق ہے، وہ اس کے تمام اہم معاملات و مسائل میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، کبرسن کے باوجود یونیورسٹی کی تمام تقریبات میں پابندی سے شریک ہوتے، گھنٹوں بیٹھے رہتے اور تقریر کرتے ہیں، ان کی ایک معین سالانہ رقم ہے جس سے طلبار کی مدد کرتے ہیں، یوں بھی دست گرد ان کوئی ضرورتمند پہونچ جائے تو بے نیل مرام نہیں آتا۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی اوصاف و کمالات کے باعث ہندو مسلمانوں اور گورنمنٹ، سب کے ہاں بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، نواب صاحب نے "یاد ایام" کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری عمدہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کر دی ہے جو بڑی دلچسپ، بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں | ڈاکٹر صاحب برصغیر انڈو پاک کے مشہور فاضل، مورخ، ادیب اور مصنف ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور اردو، تینوں زبانوں میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں جو معیاری اور بلند پایہ ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں عرصہ تک تاریخ اور سیاسیات کے استاد رہنے کے بعد جب وہاں سے سبکدوش ہوئے تو زیدی صاحب کی نظر انتخاب نے ان کو تاڑا اور یہ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ گئے، ڈاکٹر صاحب پختہ عقیدہ اور کردار کے مسلمان ہیں، اس معاملہ میں وہ کبھی اس درجہ جذباتی ہو جاتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا ان کے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے، اعلیٰ درجہ کے پٹھان ہونے کے باعث وہ بالکل صاف ستھرے اور کھرے آدمی ہیں، مصلحت پسندی کا ان کے ہاں گذر ہی نہیں، وہ الفاظ کو چبانا اور حقائق کو گھما پھرا کر بیان کرنا نہیں جانتے، جو بات دل میں ہے اس کو برملا کہنے میں ان کو اس بات کا ڈر نہیں کہ اس سے "عزت سادات" رہے گی یا جائے گی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد ہیں، لیکن افتاد طبع اور مزاج کے

اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق تھا، بڑے بھائی کا عمل حسرت کے اس شعر پر تھا:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی مرے دل میں یا دہن میں رہے

لیکن برادر خورد کی طبیعت کا آئینہ دار یہ شعر ہے:

فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا گوشۂ خاطر اسلام پسند گروپ کی طرف تھا وہ اس کو چھپاتے نہیں تھے اور اکاڈمک کونسل، اکزکٹو کونسل اور کورٹ، غرض کہ جہاں کہیں موقع ہوتا وہ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے تھے، لیکن اب غالباً ڈاکٹر صاحب نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اسلام پسندی کا وہ شور و غوغا محض ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے تھا اور اسلام کی محبت اور دین کے ساتھ مخلصانہ تعلق سے ہرگز اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا، بہرحال مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو قلبی تعلق اور لگاؤ ہونا چاہیئے وہ تو تھا ہی۔ مزید برآں علی گڈھ سے ڈاکٹر صاحب کا دیرینہ اور خاندانی رابطہ بھی تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت پرو وائس چانسلر کے اپنے عہدہ کا حق ادا کردیا۔ انھوں نے بڑی جانفشانی، محنت اور ایمانداری سے اپنے منصبی فرائض و واجبات انجام دیے، ان کو طلبا کے ساتھ اور طلبا کو ان کے ساتھ محبت تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس عہدہ کا وقار ان کی ذات کے ساتھ قائم تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کی اسلامی، علمی اور ادبی فضا میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہو جائے، کبھی کبھی زیدی صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں اختلاف رائے شدید ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر جلد ہی صلح صفائی بھی ہو جاتی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی "یادوں کی دنیا" کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جو کافی ضخیم ہے، مگر ساتھ ہی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

حاجی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی | حاجی صاحب اس زمانہ میں ٹرسٹی تھے، آپ نے اس

انتہائی ذمہ دارانہ اور نازک عہدہ کے فرائض وواجبات جس محنت ومشقت اور دل کی لگن
کے ساتھ انجام دیے اس کی مثال اس زمانہ میں عنقا ہے، وہ اس عہدہ کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے
تھے لیکن کام اس انہماک سے کرتے تھے کہ صبح کو دس بجے کے قریب دفتر آتے اور شب میں نو ساڑھے
نو کے قریب ہی وہاں سے نکلتے تھے۔ حاضر حواسی کا یہ عالم تھا کہ دفتر کی ایک ایک چیز پر ان کی
نظر رہتی تھی، چیٹرجی رپورٹ میں مالیات سے متعلق شدید اعتراضات کی صفائی اور یونیورسٹی کی
ان سے برأت کے سلسلے میں جو کچھ ریمارک کیا گیا ہے اور جو پہلے گذر چکا اور اس میں حاجی صاحب کی
سوجھ بوجھ اور قابلیت کو بڑا دخل ہے، حاجی صاحب جو نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب
شیروانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ہیں ان کے خاندان کا علی گڑھ اور سرسید سے جسم وجان کا تعلق
رہا ہے، اسی تعلق کا نتیجہ ہے کہ حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے اپنا لاکھوں روپیہ کا
..... اور انتہائی بیش قیمت نوادر پر مشتمل کتب خانہ یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔ موصوف ایک
زمانہ میں چند مہینوں کے لئے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت بھی یونیورسٹی سے ایک
پیسہ نہیں لیا اور اب بھی کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے، ایک اچھے مسلمان کی پہچان یہی ہے کہ اس
کے دیکھنے سے خدا یاد آئے اور نیکی کی ترغیب ہو۔ موصوف اسی قسم کے مسلمان ہیں، ایک عربی
شاعر نے اپنے ممدوحین کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ آپ پر بھی صادق آتے ہیں۔ کہتا
ہے:

هينون، لينون، ايسار ذوو كرم
سواس مكرمة ابناء ايسار

ترجمہ: یہ لوگ نرم خو اور نرم طبیعت ہیں، خوش حال اور ارباب کرم[1] ہیں، بزرگیوں کے بانی

---

[1] اردو میں کرم کا لفظ مہربانی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن عربی میں اس کے معنی نہایت وسیع ہیں
اور جملہ فضائل وکمالات اخلاقی پر مشتمل ہے۔

اور خوشحال لوگوں کی اولاد ہیں (یعنی نودولتئے نہیں ہیں)

رجسٹرار وائی، ڈی خاں زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپوں میں جو کشمکش برپا رہتی تھی اس کی تان غریب رجسٹرار اور اس کے دفتر پر ٹوٹتی تھی، جہاں اکادمک کونسل یا اکزکٹو کونسل یا کورٹ کی میٹنگ شروع ہوئی اور گزشتہ میٹنگ کی کارروائی پڑھی گئی کہ رجسٹرار پر سوالات کی بوچھار شروع ہوگئی، ایک صاحب فرماتے ہیں: "فلاں آیٹم کی نسبت جو فیصلہ ہوا تھا اس کا اندراج غلط ہوا ہے"۔ ایک دوسرے نے کہا: "ریزولیشن یہ منظور ہی نہیں ہوا تھا تو رپورٹ میں اسے منظور کیسے لکھدیا گیا ہے" تیسرے نے شکایت کی کہ "میٹنگ کا ایجنڈا قاعدہ کی رو سے پندرہ دن پہلے آنا چاہئے تھا لیکن رجسٹرار آفس سے ابھی چار دن پہلے آیا ہے" چوتھے بولے: "فلاں مسئلے پر میں نے جو تقریر کی تھی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ پانچویں نے ارشاد فرمایا: فلاں پوسٹ کے متعلق سلکشن کمیٹی نے جو فیصلہ کیا تھا رجسٹرار کی رپورٹ میں اس کا اندراج اشتباہ انگیز لفظوں میں ہوا ہے، غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں، رجسٹرار اور اس کا دفتر سخت پریشان رہتا تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سب سوالات بے معنی ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ جیسا کہ جسٹس کمیٹی کی رپورٹ میں درج ہے۔ رجسٹرار آفس سے چھوٹی بڑی فروگذاشتیں اور غلطیاں ہوتی بھی رہتی تھیں، اس بنا پر زیدی صاحب کو خیال ہوا کہ رجسٹرار کی پوسٹ کے لئے کوئی پرانا تجربہ کار اور لائق و محنتی شخص لایا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے کہ اسسٹنٹ رجسٹرار کی متعدد پوسٹوں پر اپنے ڈھب اور پسند کے آدمیوں کا تقرر کرے، چنانچہ انھوں نے جستجو شروع کی اور آخرکار وائی۔ ڈی (غالباً یار وداد) خاں صاحب کو رجسٹرار کی پوسٹ پر لے آئے، موصوف اس سے پہلے ایک عرصہ تک پونا میں کام کر چکے تھے اور اس بنا پر بڑے تجربہ کار اور منجھے ہوئے تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے، یونیورسٹیوں کے طریق کار سے خوب واقف تھے، دفتری نظم و نسق میں بڑی مہارت تھی اور نہایت مستعد، چست اور ہمہ وقت حاضر رہنے والے آدمی تھے، جب وہ علی گڑھ آئے ہیں اس وقت ان کی عمر ۵۵، ۵۸ برس کی ہوگی

لیکن اس کے باوجود انھیں کام کی دھن اور محنت کی لگن ایسی تھی کہ صبح کو دس بجے کے قریب آفس میں بیٹھتے تو شام کو ۷، ۸ بجے کے قریب ہی وہاں سے نکلتے تھے اور پھر بھی جب قیام گاہ پر آتے تو فائلوں کا پلندہ ان کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ سونے سے پہلے اور سونے کے بعد پلنگ پر لیٹے لیٹے انھیں پڑھتے تھے۔ انھوں نے رجسٹرار آفس کے نظم ونسق میں بہت سی مفید اور کارآمد اصلاحات کیں اور اس عہدہ کے وقار کو اونچا کیا، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ زیدی صاحب یونیورسٹی کے لئے جو کچھ کرسکے اس میں دفتری کاموں کے اعتبار سے خاں صاحب کی مستعدی، تجربہ کاری اور محنت ولیاقت کا بھی بڑا حصہ ہے، اکاڈمک کونسل وغیرہ میں رجسٹرار پر جو لے دے ہوتی تھی خاں صاحب کے آنے کے بعد اس کا سلسلہ ختم تو نہیں ہوا۔ لیکن بہت کم ہوگیا، اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاتی تو فوراً اس کا معقول جواب ملتا تھا۔

کسی اڈمنسٹریشن کے حسن وقبح کا دارومدار موقع ومحل، زمان ومکان اور متعلقہ افراد واشخاص پر ہوتا ہے، جاگیرداری اور آمریت کے زمانہ میں اڈمنسٹریشن کا جو طریقہ کامیاب ہوسکتا تھا وہ جمہوریت کے دور میں نہیں ہوسکتا اور کسی گورنمنٹ کے سکریٹریٹ میں اچھے اڈمنسٹریشن کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ اگر بعینہا یونیورسٹی میں اختیار کی جائیں تو ان سے نقصان پہونچ سکتا ہے، جہاں تک جمہوریت کے عہد اور اس کے دور میں ایک اچھے اڈمنسٹریٹر میں جو اوصاف وکمالات ہونے چاہیئے بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ زیدی صاحب کو ان میں بہرۂ وافر ملا ہے، انھیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: "میرے نکتہ چیں اگر یہ کہیں کہ میں علمی آدمی نہیں ہوں تو میں اسے تسلیم کرلوں گا۔ لیکن میں اس بات کو کیسے مان سکتا ہوں کہ مجھے اڈمنسٹریشن بھی نہیں آتا۔"

مسٹر بدرالدین طیب جی | ۶۲ء کے آخر میں زیدی صاحب سبکدوش ہوگئے تو ان کی جگہ جناب بدرالدین طیب جی کا تقرر ہوا۔ موصوف سوا دو برس کے قریب وائس چانسلر رہے، حکومت ہند کے محکمۂ خارجہ میں اڈیشنل سکریٹری اور سینیر آئی۔ سی۔ ایس تھے اس لئے ڈسپلن ان کی

گھٹی میں پڑا تھا۔ دماغ صاف ستھرا اور بے گنجلک تھا، وہ سچے اور کھرے انسان اور غیر معمولی جرأت وجسارت کے مالک تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کی اپنی کار، اپنے ملازم، اپنے برتن اور اپنا فرنیچر یہ سب چیزیں یونیورسٹی کی چیزوں سے الگ تھیں، ان کے گھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ یونیورسٹی کی کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی گھر کے کام میں لائے۔ ان کا بچہ نرسری میں پڑھتا تھا اس کی والدہ خود اپنی کار میں اسے روزانہ لے جاتی اور پھر واپس لاتی تھیں۔ وہ اس رعب داب کے آدمی تھے کہ ضلع کا افسر بھی وقت کے تقرر اور ان کی اجازت کے بغیر ان سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کا وقار اور مرتبہ بلند کیا، ایک مرتبہ شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی تھی، بدرالدین طیب جی کو معلوم ہوا کہ بارہ سینی کالج کے ہندو طلبا ایک میٹنگ کر رہے اور حسب معمول ایک جلوس نکالنے کا ارادہ کر رہے ہیں، مغرب سے پہلے جھٹپٹے کا وقت تھا، وہ اسپورٹسمین کے لباس میں فوراً اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ سیدھے کالج پہونچ گئے، طلبا پر ان کی اس جرأت اور صاف دلی کا غیر معمولی اثر ہوا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ جلوس نہیں نکالیں گے، علاوہ ازیں انھوں نے حکام ضلع کو بھی چوکنا کیا اور خود بھی رات میں کئی مرتبہ شہر کا گشت کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک وہ رہے فرقہ وارانہ فساد کا پتہ بھی کبھی نہیں کھڑکا۔ ایک اخبار نے ایک مرتبہ یونیورسٹی کے متعلق ایک غلط سلط فتنہ انگیز خبر چھاپ دی، بدرالدین طیب جی کو علم ہوا تو اڈیٹر کو بلا کر جواب طلب کیا اور کہا: "اخبار کی آیندہ اشاعت میں نمایاں طور پر اس غلط خبر کی تردید ہو جانی ضروری ہے، ورنہ میں اخبار کا لائسنس منسوخ کرا دوں گا۔" چنانچہ اخبار میں خاطر خواہ طور پر تردید شائع ہو گئی۔

بدرالدین طیب جی موروثی طور پر کٹر نیشنلسٹ تھے، لیکن ان کے ہاں نیشنلزم کا تصور یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ بڑی مچھلی کو چھوٹی مچھلی کے ہڑپ کر لینے کی اجازت دے دی جائے۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ مسلمانوں کے ملی وجود کے بقا کا دار و مدار ان کے مذہب، ثقافت اور روایات کے زندہ رہنے پر بھی ہے، اس بنا پر علی گڑھ میں ایک دو مرتبہ نہیں مختلف جلسوں اور

جلسوں میں بار بار بڑی قوت سے کہا کہ یہاں آکر مجھے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ اگرچہ اس درس گاہ کے دروازے کسی پر کبھی بند نہیں ہوئے، لیکن اس کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کی تعلیم وتربیت تھا اور پھر فرماتے کہ جس طرح یہ مقصد سرسید کے زمانہ میں تھا اسی طرح آج بھی اس کا مقصد یہی ہونا چاہئے۔ موصوف کو اپنے اس خیال کی صداقت کا اس درجہ یقین تھا کہ جب ایک مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ یونیورسٹی کے نام سے لفظ "مسلم" خارج کیا جائے گا تو انھوں نے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا اور اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں دھاندلی کی تو میں فوراً استعفا دے دوں گا۔

چھاگلہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں طلبار کے داخلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جو طلبار ایک مرتبہ یونیورسٹی میں داخل ہو کر یونیورسٹی برادری کا جز ہو گئے ان کا حق ہے کہ آئندہ داخلہ کے معاملہ میں ان کو باہر والوں پر چند شرائط کے ساتھ ترجیح دی جائے، بدرالدین طیب جی کا وہ خیال تو تھا جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اب رپورٹ کی اس سفارش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اکاڈمک کونسل سے یہ بات منظور کرالی کہ انجینئرنگ کالج میں خود اپنے یونیورسٹی کے طلبار کے داخلہ کا تناسب ۵۰ فی صد ہوگا۔ میں بیرون ہند تھا اس لئے اکاڈمک کونسل کی اس میٹنگ میں شریک نہ تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا بیان ہے کہ "جب انھوں (بدرالدین طیب جی) نے یہ مسئلہ اکاڈمک کونسل کے سامنے پیش کیا تو یہ بھی کہا کہ میں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر کوٹھاری سے اس کے متعلق گفتگو کرلی ہے اور وہ میری رائے سے متفق ہیں"[1] چنانچہ اس پر عمل ہونے لگا اور انجینئرنگ کالج میں مقامی اور غیر مقامی طلبار کا یہ تناسب قائم ہوگیا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کسے خبر تھی کہ دو برس کے بعد یہی چیز یونیورسٹی کے

---

[1] "یادوں کی دنیا" ص ۳۵۳

لئے ایک شدید بھونچال ثابت ہوگی۔

جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کے کنونشن منعقدہ دہلی۔ مارچ ۷۳ء میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس میں انھوں نے کہا ہے: "بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی میں حکمرانی ایسی ہی کی جیسے ایک ضلع کا حاکم ضلع پر کرتا ہے، وہ اکزیکٹو کونسل، اکاڈمک کونسل اور کورٹ کے ممبروں کا بہت کم لحاظ کرتے تھے" (ص ۱۰) لیکن مجکو اس ریمارک سے اتفاق نہیں ہے، اگر جسٹس بشیر احمد سعید صاحب بجائے "ضلع کے حاکم" کے یہ کہتے کہ بدرالدین طیب جی کا اڈمنسٹریشن انگریزوں کے اڈمنسٹریشن جیسا تھا تو میرے نزدیک یہ بات صحیح ہوتی" حقیقت یہ ہے کہ ایک علی گڑھ ہی نہیں، بلکہ آزادی کے بعد سے دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرح سب ہی یونیورسٹیوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ اکاڈمک کونسل، سنڈیکیٹ، اور کورٹ وغیرہ کی میٹنگس میں وہ سنجیدگی اور متانت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے اور یہ اچھی خاصی بحث و مناظرہ کی مجلسیں معلوم ہوتی ہیں[1]۔ یہ واقعہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یہ مجلسیں مقابلۃً پھر بھی بہت غنیمت اور سنجیدہ ہوتی تھیں اور ان میں ہلڑبازی نہیں ہوتی تھی، بایں ہمہ چند گنے چنے حضرات ایسے بھی تھے جو موقع بے موقع اور ایک ہی چیز پر بار بار بولنے کے عادی تھے اور چونکہ زیدی صاحب ایک عوامی طبیعت رکھتے تھے اس لئے ان کے ہاں تقریروں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی، نتیجہ یہ تھا کہ اکاڈمک اور اکزکٹو کونسل وغیرہ کی میٹنگس پانچ چھ گھنٹے اور کبھی صبح و شام دونوں وقت چلتی تھیں۔ بدرالدین طیب جی ڈسپلن کے معاملہ میں زیدی صاحب سے بالکل مختلف آدمی تھے، انھوں نے اکاڈمک کونسل اور اکزکٹو کونسل وغیرہ کی میٹنگس کو کنٹرول کیا، وہ بار بار اور بے ضرورت کسی کو نہیں بولنے دیتے تھے اس لئے جو حضرات زیادہ بولنے کے عادی تھے — اور

---

[1] اسی سلسلہ میں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ اور مشاہدہ دہلی یونیورسٹی کے اس دور کا جب کہ سر ماریس گوائر وائس چانسلر تھے اپنے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں۔

جسٹس بشیر احمد سعید صاحب کا شمار بھی انھیں حضرات میں تھا۔ انھیں بدرالدین طیب جی کی اس روک ٹوک سے طبعاً بیزاری ہونی ہی چاہئے تھی، تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بدرالدین طیب جی میں ایک قسم کی حاکمانہ ضد اور ہٹ تھی، وہ جس بات پر اڑ گئے، اڑ گئے، اپنے سامنے کسی کی چلنے نہیں دیتے تھے، اسی وجہ سے بعض حضرات نے تو اکاڈمک کونسل کی میٹنگ میں آنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا، اور اکز کٹو کونسل اور کورٹ کی میٹنگس میں بھی وہ پہلی سی ہمہ ہمی اور چہل پہل نہ رہی تھی۔

ان کی ضد کی وجہ سے ایک مرتبہ مجھے بھی بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہوا یہ کہ شعبۂ سنی دینیات میں دو لکچرروں کا انتخاب ہونا تھا .... ان میں ایک لکچرر — کم — ناظم دینیات کی پوسٹ تھی اور دوسری لکچرر برائے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کی، جب ان دونوں جگہوں کے لئے امیدواروں کا انٹرویو ہوچکا اور بدرالدین طیب جی نے میری رائے معلوم کی تو میں نے دو امیدواروں کا نام لیا، یہ سنتے ہی طیب جی کا موڈ بگڑ گیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں زور دے کر فرمایا: "پہلی پوسٹ کے لئے آپ نے جس کی سفارش کی ہے، یہ نرے مولانا ہیں، انگریزی سے بالکل نابلد۔ پھر یہ یونیورسٹی کے طلبار کو کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ دوسرے امیدوار کی نسبت تمسخر کے انداز میں فرمایا: "مانا کہ یہ ایم۔اے، ال۔ال۔بی ہیں، لیکن یہ پوسٹ تو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ہے، امیدوار نے جب ویدوں کا اور عہد نامۂ قدیم وجدید کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو اس پوسٹ کا حق کیونکر ادا ہوسکتا ہے"۔ میں نے عرض کیا: میرے نزدیک ایک امیدوار کی عمدہ صلاحیت اور متعلقہ پوسٹ کے لئے اس کے استحقاق کی دلیل یہ ہے کہ امیدوار کو اپنے مضمون کے ساتھ شغف اور والہانہ تعلق ہو، اس کا مطالعہ برابر جاری رہے اور اس نے تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہوں۔ اس کے بعد میں نے کہا: اس معیار پر یہ دونوں امیدوار پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ یہ ان کے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کو ملاحظہ

فرمائیے، اس سے میری بات کی تصدیق ہوگی، اب رہی یہ بات کہ یہ حضرت انگریزی نہیں جانتے تو واقعہ یہ ہے کہ میں خود انگریزی کو ایک لکچرر کے لئے ضروری شرط قرار دیتا ہوں، لیکن یہ پوسٹ اس لکچرر کی ہے جسے ناظم دینیات کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس پوسٹ پر ایک باقاعدہ عالم، متشرع اور متدین کا تقرر ہو تاکہ ناظم دینیات کی پوسٹ کا تقدس برقرار رہے، اس لئے اس شخص کے حق میں میرے نزدیک انگریزی کی شرط پر اصرار کرنا مناسب نہ ہوگا۔ دوسرے امیدوار کی نسبت میں نے کہا: یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ امیدوار نے ہندو مذہب اور یہودیت وعیسائیت کا سرے سے مطالعہ کیا ہی نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں جو سوالات انٹرویو میں ان سے کئے گئے تھے ان کے جوابات انہوں نے ایسے ضرور دیے ہیں کہ ان کو پچاس فی صد نمبر دیے جا سکتے ہیں)، یہ مستعد، محنتی اور علمی وتحقیقی ذوق کے آدمی ہیں اس لئے میں نگرانی رکھوں گا۔ امید ہے وہ اپنی خامی جلد پوری کرلیں گے۔

لیکن طیب جی کہاں ماننے والے تھے، چار پانچ منٹ ان کے اور میرے درمیان کشمکش رہی، اس موقع پر اکسپرٹ حضرات حسب دستور خاموش رہے، آخر جب میں نے کہا: "وائس چانسلر صاحب! جن دو شخصوں نے اسلامیات پر محنت کی ہے، ریسرچ اور تحقیق کر کے قابل قدر علمی خدمات انجام دی ہیں، اگر ان کو اپنی محنت اور ذوق وشوق کی داد مسلم یونیورسٹی میں بھی نہیں مل سکتی تو کہاں ملے گی؟ وائس چانسلر صاحب یہ سنتے ہی ہنس پڑے اور موقع پاکر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بھی میری حمایت میں بولے تو فرمایا: "بہت اچھا! آپ کو اتنا اصرار ہے تو یہی سہی! لیکن یہ یاد رکھئے کہ ان دونوں کا تقرر حسب قاعدہ ایک برس کے لئے آزمائشی ہوگا، اس ایک برس میں ایک صاحب کے لئے انگریزی میں اچھی خاصی استعداد کا بہم پہونچانا ضروری ہوگا اور دوسرے کو یہ بتانا ہوگا کہ انہوں نے سال بھر میں ہندو مذہب اور یہودیت وعیسائیت پر آپ کی ہدایت کے مطابق کتنی کتابیں باقاعدہ پڑھی ہیں، اور پھر

بعد دے کر فرمایا : اب ان دونوں کی نگرانی آپ کا کام ہے، سال پورا ہونے کے بعد جب تک آپ اپنی رپورٹ میں ان دونوں باتوں کا مجھے اطمینان نہیں دلائیں گے میں ان کو مستقل (Confirmed) نہیں کروں گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ طیب جی کا معاملہ طلبار کے ساتھ بہت نرم اور دلجوئی کا اور اساتذہ کے معاملہ میں وہ سخت تھے۔ میرے نزدیک یہ شہرت غلط نہیں تھی لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طلبار کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اس کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے، ان کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لیتے، باقاعدہ گھوڑے کی سواری کرتے، تالاب (Swimming pool) میں ان کے ساتھ غسل کرتے اور تیرتے تھے، میں نے خود تو نہیں دیکھا اوروں سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ طلبار کسی ہال میں ڈنر کھانے بیٹھے، لیکن کھانا جو سامنے آیا تو بے حد خراب! لڑکوں نے اسٹرائک کردی اور وائس چانسلر کی کوٹھی پر پہونچے، طیب جی اس وقت گھر کے اندر بے تکلفی کے ساتھ صرف بنیان اور نیکر پہنے بیٹھے تھے، ان کو لڑکوں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو فوراً اسی حالت میں باہر نکل آئے، لڑکوں نے ان کو گھبرایا ہوا اور اس لباس میں دیکھا تو بولے "قبلہ! آپ نے لباس تو ٹھیک پہن لیا ہوتا" بدرالدین طیب جی نے جذباتی انداز میں کہا: ہیں! میرے بچے کسی وجہ سے پریشان ہو کر میرے مکان پر آئیں اور میں کپڑے بدلنے میں دیر لگاؤں! یہ کیسے ہو سکتا ہے!" لڑکے آئے تھے احتجاج کرنے، مگر وائس چانسلر کا رویہ اس درجہ مشفقانہ دیکھا تو کچھ کہے سنے بغیر واپس جانے لگے۔ بعد میں بدرالدین طیب جی کو لڑکوں کے آنے کی غرض و غایت کا علم ہوا تو اس وقت جو کچھ گھر میں موجود تھا وہ لاکر لڑکوں کے سامنے رکھ دیا اور پرووسٹ کو حکم بھیجا کہ آئندہ وہ کھانے کے خراب ہونے کی شکایت نہ سنیں، لڑکوں کے ساتھ اس تعلق خاطر کے باعث لڑکوں کی معمولی فروگذاشتوں اور غلطیوں سے درگزر کرتے تھے، لیکن جو جرائم خباثتِ نفس کا مظہر ہوتے تھے ان پر یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کے ماتحت ان کو سزا دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔

اس کے برعکس اساتذہ کا معاملہ دوسرا تھا، بدرالدین طیب جی کی نگاہ اس پر تھی کہ اساتذہ کی ذمہ داریاں بڑی نازک اور اہم ہیں، ملک اور قوم کے معمار درحقیقت یہی لوگ ہیں، نوجوانوں کے مستقبل کا بننا اور بگڑنا انھیں کی فرض شناسی اور اس سے کوتاہی اور غفلت پر مبنی ہے، اس بنا پر اساتذہ کو علم وعمل اور اخلاق کے اعتبار سے طلبا کے لئے ایک نمونہ ہونا چاہئے، لیکن افسوس ہے، علم اور اخلاق میں باہمی سمبندھ کے منقطع ہو جانے کے جو المناک مظاہر پورے ملک میں نظر آتے ہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی فضا بھی ان سے خالی نہ تھی، یہاں بھی ایسے اساتذہ (اور بعض اونچے درجہ کے) موجود تھے جو سرِ شام اسٹاف کلب میں (کچھ بیگمات کے ساتھ اور کچھ تنہا) پہونچ جاتے اور شب میں بارہ ایک بجے سے پہلے گھر واپس نہیں لوٹتے تھے، کلاس پابندی سے نہیں جس کے باعث کورس مکمل نہیں ہوتا تھا، بعض شعبوں کے صدر صاحبان کا تو یہ حال تھا کہ سال میں دو چار کلاسیں لیں اور پھر غائب! دفتر کے چپراسی سے گھر کا کام لیتے تھے، شعبہ کے فرنیچر کی بعض چیزیں بے تکلف اپنے گھر لے جاتے تھے، یونیورسٹی میں جو پرووسٹ صاحبان اور وارڈن ہوتے تھے ان میں بعض حضرات روپیہ پیسہ کے معاملہ میں غیر محتاط تھے، لڑکوں کے روپیہ سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی دعوت کرنے میں انھیں تامل نہیں، پھر یہ مرض تو اس ملک میں ہمہ گیر ہے کہ اپنی یونیورسٹی یا کسی اور یونیورسٹی کے کام سے کہیں کا سفر کیا ہے اور سفر خرچ فرسٹ کلاس کا لیا ہے، حالانکہ سفر تھرڈ کلاس میں ہوا ہے، یا ایک ہی شہر میں دو مختلف اداروں میں گئے ہیں اور دونوں جگہوں سے الگ الگ فرسٹ کلاس کے دو سفر خرچ لئے ہیں۔ بدرالدین طیب جی کو طالب علمی کے زمانہ کے علاوہ اور خصوصاً آزادی کے بعد کے زمانہ میں (جب کہ ہماری تعلیم گاہوں کے زمین و آسمان تک بدل گئے ہیں) کبھی کسی یونیورسٹی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس بنا پر اب انھوں نے اساتذہ اور انتظامیہ میں اس قسم کے لوگ دیکھے تو غصہ کے ساتھ ان کو اس کا شدید رنج اور صدمہ ہوا اور آدمی چونکہ دبنگ تھے، پروا کسی بات کی کرتے نہیں تھے۔ اس لئے کسی شخص کی بے عنوانی اور قانون کی خلاف ورزی

ان کے علم میں آئی انھوں نے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے میں ذرا تامل نہیں کیا بعض اونچے درجہ کے سینیر پروفیسر تھے ان تک کو معطل کرنے میں پس وپیش نہیں کیا، ایک پروفیسر جو چند روز پہلے ہی اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے ان کی نسبت معلوم ہوا کہ طلبار کے فنڈ کے دس ہزار روپے ہڑپ کر گئے ہیں، بدرالدین طیب جی نے ان کو فوراً بلایا اور کہا: یہ روپیہ آج شام تک فنڈ میں جمع ہوجانا چاہئے، ورنہ میں معاملہ پولیس کے سپرد کردوں گا، ایک ہڈ کلرک کی نسبت پتہ چلا کہ داخلہ کے معاملہ میں اس نے رشوت لے لی ہے، اسے فوراً معطل کر دیا گیا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ ادھر کوئی شخص معطل ہوا اور اس نے کورٹ میں رٹ داخل کردی۔ بدرالدین طیب جی سوا دو برس کے قریب علی گڑھ میں رہے ہیں، لیکن اس مختصر مدت میں بھی جس کثرت سے لوگ ان کے زمانہ میں معطل ہوئے اور جتنے رٹ یونیورسٹی کے خلاف ان کے زمانہ میں داخل ہوئے کسی وائس چانسلر کے عہد میں ایسا نہیں ہوا، ان کے عہد کی بھی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے ان کی حکومت کو ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حکومت کہا ہے لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اس کے عملہ میں یہ خرابیاں تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں اور یقیناً تھیں تو ان کو دور کرنے اور ان کی اصلاح کی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی! چنانچہ اساتذہ اور عملہ میں جو ایماندار، محنتی اور فرض شناس لوگ تھے وہ سب بدرالدین طیب جی کے مداح اور قدردان تھے لیکن جن کے خلاف انھوں نے تادیبی کارروائی کی تھی وہ اور ان کے ہم خیال و ہم مشرب انھیں کیوں پسند کرسکتے تھے، البتہ طلبار ان پر جان چھڑکتے تھے اور پروانہ وار ان پر فدا تھے۔

جب وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ سے روانہ ہوئے ہیں تو اس وقت طلبار نے جس گرم جوشی، والہانہ محبت اور تعلقِ خاطر کے جذبات کے ساتھ انھیں رخصت کیا ہے وہ پورا منظر دیدنی تھا۔ زیدی صاحب کی رخصت کے وقت تو میں ہندوستان میں ہی نہ تھا اس وقت اسٹیشن پر میں بھی موجود تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ان تک پہونچنا ممکن نہ

ہوسکا۔ میں ذاتی طور پر بھی ان کی عنایت وکرم اور توجہ کا شکر گزار ہوں۔ ان کے ہاں جو لنچ یا ڈنر ہوتا تھا اس پر وہ ڈین صاحبان کو باری باری بلاتے تھے، لیکن مجھکو ہر موقعے پر یاد فرماتے اور علم وفن، شعروادب اور مذہب وسیاست کے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتے تھے

بہرحال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی کے طلبار اور اساتذہ وملازمین میں خوداعتمادی اور عزتِ نفس کا جذبہ پیدا کیا، ان کو یہ سکھایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے تمھاری عزت کریں تو پہلے تم خود اپنی عزت کرنا سیکھو، ان میں فرض شناسی کی خو پیدا کی، یہ واقعہ ہے کہ ان کے عہد میں بڑے سے بڑا فرقہ پرست ہندو بھی یونیورسٹی کی طرف ترچھی نظر کرتے ہوئے ڈرتا تھا ضلع کے حکام اور پولیس کے افسران ہوشیار اور چوکنا رہتے تھے اور یونیورسٹی تو یونیورسٹی! ان کی وجہ سے شہر کے مسلمان بھی چین کی نیند سوتے تھے۔

ان کی فطرت میں صداقت پسندی اور حق گوئی کا جو جوہر قدرت نے ودیعت رکھا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد سے اب تک انھوں نے انگریزی کے بلند پایہ اخبارات ورسائل میں بیسیوں مضامین لکھ ڈالے جن میں انھوں نے گورنمنٹ کی مختلف پالیسیوں اور کاموں پر اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایوان پارلیمنٹ کے درو بام بھی گونج اٹھے۔ مسلمانوں نے ان کو اپنا لیڈر بنانا چاہا، مختلف جماعتوں نے ان پر ڈورے ڈالے اور ہر ایک نے ان کو اپنانے کی سعی کی۔ لیکن انھوں نے مسلم پرسنل لا اور بعض چیزیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا جذباتی تعلق ہے ان کی نسبت اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر کے انھیں مایوس کر دیا اور وہ ان کمندبازوں سے یہ کہتے ہوئے ترت نکل گئے:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

لیبیا میں سرقہ وحرابہ کے حدود

(۲)

از مولانا حبیب ریحان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ، البیضاء (لیبیا)

دفعہ ۱۴

مکرر جرم کرنے والے مجرم کی توبہ سے متعلق تحقیقی کارروائیاں[۱]

۱۔ دوبارہ جرم کرنے والے مجرم کو سابقہ دفعہ کے بند نمبر ۱ کی روشنی میں تین سال جیل میں رہنے سے قبل رہا نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ مجرم کو اس بات کا حق ہے کہ یہ مدت (تین سال) گزر جانے کے بعد نیابہ عامہ (پبلک پراسیکیوٹر) کے پاس درخواست پیش کرے جس میں سرقہ یا حرابہ سے توبہ کا اعلان ہو، پھر نیابہ عامہ اس بات کی تحقیق کرے اور جیل میں اس کے چال چلن کے بارے میں متعلقہ لوگوں سے پوچھ تاچھ کرے، اور یہ بھی کہ کیا اس کو رہا کرنے سے اصلاح کی امید ہے یا نہیں؟ (ان تحقیقات و استفسارات کے بعد) پبلک پراسیکیوٹر اپنی تحقیقات کے اوراق اپنی رائے کے ساتھ اس عدالت میں پیش کرے

۱۔ دراصل توبہ خدا اور بندہ کے درمیان ہوتی ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے گناہ سے نفرت ہو جاتی ہے اور گنا ہگار گناہ سے باز رہنے کا عہد کرتا ہے، لیکن قانونی طور پر اس کی تحقیق اور تیقن ضروری ہے اور شریعت کے اصولوں اور مصلحت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصود سوسائٹی اور فرد کی اصلاح ہے۔

جہاں سے (مجرم کی سزا کا) فیصلہ صادر ہوا تھا۔

۳۔ عدالت مجرم کو رہا کرنے کا فیصلہ صادر کرے گی اگر اس کے نزدیک مجرم کی توبہ ثابت (متحقق) ہو گئی، عدالت کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ جیل سے رہائی کے بعد کچھ مدت کے لئے اس کی نگرانی کی شرط بھی لگا دے، مراقبہ (نگرانی) کی یہ مدت اس باقی مدت سے زیادہ نہیں ہو سکتی جتنی جیل کا فیصلہ عدالت نے مجرم کے حق میں پہلے صادر کیا تھا، (عدالت جرم سے باز رکھنے کیلئے) دوسری حفاظتی تدابیر کا حکم بھی دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ حریت (انسانی آزادی) کو مقید نہ کرتی ہوں۔

۴۔ اگر عدالت نے (توبہ کی) درخواست نامنظور کر دی تو نامنظوری کی تاریخ سے (پورے) ایک سال تک دوبارہ (مجرم) درخواست پیش نہیں کر سکتا۔

۵۔ عدالت سے صادر شدہ فیصلہ جو مجرم کی توبہ قبول کرنے کے بعد اس کو رہا کرنے کے لئے اس کے حق میں ہو یا (اس کے خلاف) توبہ کی درخواست کو نامنظور کرنے کی شکل میں ہو، (دونوں صورتوں میں) اس فیصلہ پر طعن (اعتراض یا اس کی اپیل) کسی بھی اپیل کے (رائج) طریقوں کی رو سے جائز نہ ہوگی، (یعنی عدالت کا فیصلہ اس باب میں آخری ہوگا اور کسی دوسری عدالت میں اس کے خلاف اپیل دائر نہ ہو سکے گی)۔

دفعہ ۱۵

حد والے جرم مدت گزرنے سے ساقط ہو جائیں گے[1]۔

---

[1] یعنی مقنن نے مدت گزرنے سے حد ساقط ہو جانے کا نظریہ فقہ حنفی سے اخذ کیا ہے، کیونکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مدت گزر جانے کی وجہ سے گواہی میں شک پڑ جاتا ہے، اور یہ شک حد کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے لیکن مال کا ضمان ہوگا، وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جب کسی چور کو چوری کرتے دیکھتا ہے تو اس پر دو حالتوں میں سے کسی بھی ایک حالت پر عمل کرنا درست ہے، ایک تو یہ کہ "من ستر مسلما سترہ اللہ" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ دونوں جرم جن پر اس قانون کی رو سے حد واجب ہوگی، یہ حد ساقط ہو جائے گی جس دن جرم کیا گیا اس سے پورے دس سال گزر جانے کے بعد، اور یہ اس صورت میں کہ مجرم خود اعتراف جرم نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے پیش نظر وہ اس کی اطلاع نہ کرے اس حالت میں بھی وہ گنہگار نہیں، دوسری یہ کہ چوری کی کثرت ہوجانے، یا چوری سے نفرت ہونے یا سوسائٹی کو برائیوں سے پاک کرنے کی غرض سے فوراً اس کی اطلاع کرے اور اپنی گواہی دے، اس صورت میں بھی وہ گناہگار نہیں اور ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اس نے اختیار کرلی گیا وہ اپنے واجب سے سبکدوش ہو گیا، لیکن اس وقت تو چور کی چوری کو چھپالیا اور اطلاع اور گواہی نہ دی لیکن مدت گزر جانے کے بعد اس کی اطلاع دی تو یہ شک واقع ہوتا ہے کہ گواہ نے اب یہ عمل نہ اس شخص کے فائدہ کے لئے کیا ہے جس کی چوری ہوئی اور نہ جب مجرم کے ستر کی غرض سے چھپایا تھا، اور اب کسی حقد وحسد، مخالفت یا عداوت کے پیدا ہوجانے کے بعد یہ گواہی دے رہا ہے حالانکہ اگر اس کو چوری کا خاتمہ یا سوسائٹی کی اصلاح مقصود ہوتی تو اسی وقت اطلاع دیتا، الغرض اس طرح گواہی میں شبہ پڑجاتا ہے، اور حدود چھوٹے سے چھوٹے شبہ سے بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ لیبی مقنن نے مدت کی تحدید امام ابوحنیفہ کے اس قول سے کی ہے کہ قاضی کو ہر زمانہ اور ہر جگہ عرف وحالات کے مطابق یہ مدت مقرر کرنے کا حق ہے۔ فقہ حنفی میں شرح فتح القدیر کے بیان کے مطابق امام محمد کا قول ایک ماہ کا ہے اور لکھا ہے کہ ایک روایت امام ابوحنیفہ وابو یوسف سے بھی یہ ہے اور لکھا ہے کہ "وہو الاصح" امام محمد نے الجامع الصغیر میں مدت چھ ماہ رکھی ہے اور یہ بھی اقرب الی الصحہ اور معقول ہے، عصور اولیٰ میں اسلامی نظام قضاء میں وہ سستی اور طول اور تعویقات نہیں تھیں جو یورپ سے آئے ہوئے نظام عدالت میں ہیں جن کی رو سے ایک ایک دعویٰ سالہا سال تک عدالتوں کے چکر کاٹتا رہتا ہے اس لیے اب یہ چھ ماہ کی مدت بھی کافی نہیں اس لئے مجتہد اور مقنن کو مدت کے تعین کا حق ضرور ہے جیسا کہ امام اعظم کے قول میں موجود ہے کیونکہ پولیس، پبلک پراسکیوٹر، چھوٹی عدالتیں، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ کا طویل طریقہ موجود ہے لیکن گواہی اور گواہوں سے متعلق احناف کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرے، اور یہ مدت پوری ہوگی ان احکام کے مطابق جو (لیبی) قانون عقوبات میں مقرر ہیں[1]۔

دفعہ ۱۶

حدود کی سزائیں مدت گزر جانے سے ساقط ہو جائیں گی۔

۱۔ وہ حدود جو اس قانون میں بیان کی گئیں ساقط ہو جائیں گی بیس سال گذر جانے سے لیکن صرف قتل کی سزا تیس سال بعد ساقط ہوگی، اور یہ سب اس صورت میں جب کہ (عدالت) کا صادر شدہ فیصلہ مجرم کے اقرار و اعتراف سے نہ ہو (مطلب یہ ہوا کہ مجرم کے اقرار سے ثابت شدہ حد ساقط نہ ہوگی[2])

۲۔ حد ساقط ہونے کی مدت (عدالت کے) آخری فیصلے کے بعد سے شروع ہوگی۔

۳۔ ہر وہ مانع جو (حد) کو نافذ کرنے کی راہ میں مانع ہو گیا ہو وہ مدت میں محسوب نہ ہوگا[3]۔

دفعہ ۱۷

عقوبات حدود کی قطعیت اور لزوم۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عقلی اور واقعاتی دلیل کی رو سے مدت بہت زیادہ نہ ہونی چاہئے۔

۱۔ ان کا ترجمہ بھی بعد میں پیش کروں گا۔

۲۔ اعتراف کی صورت میں حد مدت گزرنے سے ساقط نہ ہوگی، یہ جمہور فقہاء امت کا قول ہے۔

۳۔ یہ تین صورتیں ہیں، پولیس یا عدالت تک کیس ہی نہ پہنچا، تو جرم دس سال میں ختم ہو جائے گا، فیصلہ صادر ہوا مجرم کی عدم موجودگی میں یا مجرم فیصلے کے بعد بھاگ گیا تو قتل کے سوا سزا بیس سال میں ختم ہو جائے گی، تیسری شکل یہ کہ بیماری وغیرہ جیسے کسی مانع کی رو سے سزا میں تاخیر ہوئی تو تاخیر کی یہ مدت محسوب نہ ہوگی۔

اس قانون میں منصوص حدود کی سزاؤں کو نافذ کرنے سے روکنے یا ان کو بدلنے یا ان میں کمی کرنے اور معاف کرنے کا فیصلہ (کسی کی طرف سے بھی) جائز نہیں ہے۔

دفعہ ۱۸

فیصلہ کو عدالت عالیہ میں پیش کرنا۔

احکام جنائیہ میں مقرر اپیل کے طریقوں اور قاعدوں میں استثناء کے ساتھ[1]۔

۱۔ اگر مجرم کی موجودگی میں حد کا فیصلہ صادر ہوا ہے، ان دونوں جرموں میں سے کسی ایک پر جو اس قانون کی دفعہ نمبر ۱ و ۴ میں بیان ہوئے ہیں، تو عدالت عالیہ کے سامنے اس کیس کے تمام اوراق فیصلہ کے چالیس دن کے اندر پیش کرنے ضروری ہیں، اور عدالت مجرم کے لئے وکیل کا بندوبست بھی کرے اگر اس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور پبلک پراسکیوٹر اپنی رائے اور رپورٹ کیس پیش کرنے کے بعد پندرہ دن کے اندر پیش کرے، اور مجرم کے وکیل کو اس کے پندرہ دن بعد اپنا دفاع پیش کرنا ہوگا۔

۲۔ عدالت عالیہ اس قضیہ میں قانونی اور موضوعی (قانون کی دیکھ بھال اور اس خصوصی کیس کی مکمل تفصیلی تحقیق کے بعد) فیصلہ کرے گی اور اس کا یہ فیصلہ آخری ہوگا۔

دفعہ ۱۹

حد کی تنفیذ

حد کا حکم اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ عدالت عالیہ اس قضیہ میں فیصلہ

۱۔ یہ مقررہ طریقے بعد میں بیان کروں گا، یہاں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ براہ راست عدالت عالیہ میں اپیل کے کاغذات پیش کرنا بھی مقنن نے ضروری قرار دیا ہے اگرچہ کہ مجرم اپیل نہ بھی کرے کیونکہ یہ حد کا معاملہ ہے اور عدالت عالیہ کی تصدیق یا فیصلے کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔

نہ کر دے۔

دفعہ ۲۰

حد کی صورت میں قتل اور جیل کی تنفیذ کی صورت

قتل اور جیل کی تنفیذ جو اس قانون میں منصوص ہے وہ ان اصولوں اور طریقوں پر ہوگی جو (لیبی قانون میں) موت کی سزا اور جیل سے متعلق نافذ ہیں[1]۔

دفعہ ۲۱

قطع (ہاتھ یا پیر کاٹنے) کی سزا کی تنفیذ۔

اس قانون کی دفعہ نمبر ۲ و ۵ میں وارد قطع کی سزا اس طرح نافذ کی جائے گی۔

۱۔ (حد) کی تنفیذ سے پہلے (یعنی جس دن حد نافذ ہونے والی ہو اس کے مقررہ وقت سے بالکل متصل) محکوم علیہ کا طبی معاینہ ضروری ہے جو سرکاری ڈاکٹر کرے گا تاکہ وہ یہ رپورٹ پیش کرے کہ تنفیذ حکم کی وجہ سے کوئی خطرناک صورت تو پیش نہیں آسکتی، کسی بیماری کی وجہ سے، یا حاملہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، اور اگر ڈاکٹر کی رائے یہ ہو کہ تنفیذ حکم میں تاخیر ہو تو اسے تاخیر کی مدت کا تعین کرنا ضروری ہوگا[2]۔

۲۔ قطع کا حکم جیل کے ہاسپٹل یا عمومی ہاسپٹل (کسی بھی سرکاری حکومت کے ہاسپٹل میں) نافذ اسپشلسٹ ڈاکٹر (سرجن) کے ذریعہ اور آپریشن کے طریقے پر، اور ان مناسب طبی طریقوں (سہولتوں) کے استعمال کے ساتھ جس میں محکوم علیہ کو بے حس (ANAESTHETISING) کرنا بھی شامل ہے[3]۔

۱۔ ان طریقوں کو بھی تفصیلی بحث میں پیش کروں گا۔

۲۔ یہ احتیاط شریعت مطہرہ کے اصولوں اور مصلحتِ عامہ کے تمام عقلی وفطری تقاضوں کی رو سے انتہائی ضروری اور معقول ہے۔

۳۔ مقنن نے یہ سہولتیں اس لیے رکھی ہیں کہ حد کا مقصود برائی سے روکنا، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۳۔ ہاتھ رسغ (گٹے، پہنچے) پر سے کاٹا جائے گا، جہاں ہاتھ کا جوڑ ہوتا ہے، اور پیر مفصل (ٹخنے) پر سے[1]۔

۴۔ مقطوع شخص طبی نگرانی میں اس وقت تک رہے گا جو مدت وہ سرجن متعین کرے جس نے آپریشن کیا ہے یہ نگرانی ہاسپٹل میں یا اس کے باہر دونوں جگہ ہوگی، اس کے لئے تمام احتیاطی تدابیر کی جائیں گی، اور ضروری علاج فراہم کیا جائے گا کہ دوسری محتمل تکلیفیں یا نقصانات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور ڈرانا ہے، ہلاک کرنا یا تلف کرنا نہیں ہے، المغنی لابن قدامہ میں لکھا ہے کہ حد آسان اور سہل ترین طریقے پر نافذ ہوگی، یہ سہولت اور آسانی شرعی طور پر بالکل صحیح ہے مقنن نے ہاسپٹل میں حد کا نفاذ رکھا ہے، اس بات کی تصریح قانون یا یاد داشت میں مجھے نہیں ملی کہ کیا عوام الناس اس پر قیام حد کو دیکھیں گے یا نہیں، چاہے وہ ہاسپٹل ہی میں کیوں نہ جمع ہوں، کیونکہ قیام حد جس طرح مجرم کو دوبارہ اس فعل شنیع سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے اسی طرح وہ پوری سوسائٹی اور عوام الناس کو بھی برائی سے روکنے اور باز رکھنے کا فطری طریقہ ہے اور محض قطع کی خبر اخبار میں پڑھنے یا ریڈیو پر سننے سے شاید وہ تاثر اور چوری سے خوف، نفرت اور نفسیاتی انفعال نہ ہو جو بذات خود اس کا مشاہدہ کرنے سے ہو، لیکن بہت ممکن ہے کہ عصر حاضر میں ٹیلی وژن، سروی اصلاحی فلمیں اور سینما اس تاثر، انفعال اور خوف و زجر کے جذبات پیدا کرنے میں مدد کرے اور اس طرح شریعت کا منشا پورا ہو۔

۱۔ یہ تقریباً جمہور فقہائے اہل سنت کی رائے ہے۔ ابو ثور اور امام احمد کا ایک قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ پیر اس طرح کاٹا جائے گا کہ ایڑی کا حصہ بچ جائے، مزید تفصیل سرقہ وحرابہ کی مفصل بحث میں کروں گا۔

پیش نہ آجائیں[1]۔

۱۔ یہ تمام احتیاطی تدبیریں ضروری اور شرعی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود ہے "فاقطعوہ واحسموہ" حسم کے معنی یہ ہیں کہ خون بہنے والی رگوں کو گرم لوہے سے داغا جائے یا المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ گرم تیل میں ڈالا جائے تاکہ خون نہ بہے، امام شافعی اور احمد کے نزدیک حسم کرنا مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب ہے اور اس کی دلیل اور ضرورت فقہ حنفی کی کتابوں میں اس طرح مدرج ہے کہ "اگر حسم نہ کیا جائے گا تو ہلاکت اور تلف کی نوبت آجائے گی اور حد زاجر ہوتی ہے نہ کہ متلف"، اس قول اور دلیل کی رو سے احتیاطی تدابیر نہ صرف یہ کہ مستحسن ہیں بلکہ واجب ہیں تاکہ مزید نقصان، امراض یا موت واقع نہ ہوجائے، لیبی مقنن نے اسی انسانی اور شرعی حکمت کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ عصور اولیٰ میں خون روکنے اور نقصانات سے بچانے کا بہترین طریقہ وہی رائج تھا جو اوپر بیان کیا گیا، روح شریعت، مصلحت شریعت اور تقاضائے شریعت یہی ہے کہ ہر عصر میں بہترین اور ماڈرن احتیاطی طریقے استعمال کیے جائیں، اس لئے ڈاکٹر، سرجن، ہاسپٹل، دوائیں اور نگرانی سب شرعی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مستحسن اور مستحب ہیں بلکہ ضروری اور واجب ہیں، لیبیا میں علاج مفت ہے اور ہر باشندہ کو مفت علاج کی سہولتیں مہیا ہیں، جن ملکوں میں یہ سہولتیں عوام کے لئے مفت نہ بھی ہوں وہاں بھی ان طبی احتیاطوں اور دوائیوں کی قیمت حکومت ہی پر ہونی چاہئے، خدا بھلا کرے ائمہ فقہ کا جزئیات تک پر بحث کر چکے ہیں، حسم کرنے کے سلسلے میں داغنے یا تیل وغیرہ کی قیمت کون ادا کرے گا؟ احناف کے نزدیک اس کی قیمت چور ادا کرے گا کیونکہ مجرم وہ ہے، اور امام شافعی واحمد کا قول یہ ہے کہ بیت المال اور حکومت ادا کرے گی، حالانکہ حسم ان کے نزدیک واجب نہیں صرف مستحسن ہے اور احناف کے نزدیک واجب ہے، دونوں اقوال اپنے مخصوص زاویہ نظر اور تفکیر کی وجہ سے صحیح ہیں، لیکن دوسرا قول فطری اور انسانی جذبات کی روشنی میں اصح ہے۔

طبی سہولتوں کا تذکرہ یہاں آگیا اس لیے راقم ایک اجتہادی مسئلہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دفعہ ۲۲ -

قطع سے متعلق خاص احکام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مختصر طور پر فقہاء و مجتہدین امت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، وہ مسئلہ یہ کہ یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہے ؟ اور اس کا کیا کیا جائے ؟ کیا یہ حکومت کی ملکیت ہے کہ اس کو بازار یا مسجد کے دروازہ پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو ؟ یا دفن کر دیا جائے کہ جسم انسانی کی حرمت کا تقاضہ پورا ہو ؟ یا یہ مقطوع کی گردن میں ڈال دیا جائے کہ حاضرین جو قطع کے مشاہدہ کے بعد تاثر اور انفعال کی کیفیت سے لبریز ہو چکے ہوں وہ اس مقطوع ہاتھ کو اس کی گردن میں لٹکا ہوا دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں ؟ اور یہ ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہو ؟

مالکی مفسر ابو عبداللہ القرطبی لکھتے ہیں: "وتعلق يد السارق في عنقه ، قال عبد الله بن محيرز سألت فضالة عن تعليق يد السارق في عنقه ، امن السنة هو ؟ فقال ، جئ رسول الله صلى الله عليه وسلم بسارق فقطعت يده ثم امر بها فعلقت في عنقه ، اخرجه الترمذي وابو داؤد والنسائي" (تفسیر القرطبی ۶-۱۷۲) امام شافعی اور احمد کے نزدیک بھی یہ سنت ہے، اس کی طرف اشارہ اور احناف کا مسلک ابن ہمام اس طرح واضح کرتے ہیں: "ويسن تعليق يده في عنقه لانه عليه السلام امر به رواه ابو داؤد وابن ماجه ، وعندنا ذلك مطلق للامام ان راه ولم يثبت عنه عليه الصلاة والسلام في كل من قطعه ليكون سنة" (شرح فتح القدیر ۴-۲۴۸) اس اختلاف فقہی کا ماحصل یا نتیجہ یہ نکلا کہ احناف کے نزدیک قطع سے زجر مکمل ہو گیا، اب مزید زجر گردن میں ہاتھ لٹکانے سے واجب یا سنت موکدہ نہیں، دوسری بات یہ کہ اگر امام چاہے تو مزید زجر کے لیے گردن میں ہاتھ حدیث کی رو سے لٹکا سکتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں کسی کو بھی مان لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے قطع ید اور اس کو گردن میں حائل کر دینے کے بعد اب کسی زجر کی ضرورت ہے نہ حکمت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اگرچہ کہ وہ مشلول ہی کیوں نہ ہو، یا انگوٹھا کٹا ہوا ہو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اب سوال طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کسی بھی صورت سے زجر مکمل ہو جانے کے بعد یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا۔

عصور اولی میں اس ملکیت اور عدم ملکیت سے نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی۔ نص کی موجودگی میں اور شریعت کی روح کے خلاف اجتہاد ناجائز بھی ہے، لیکن روح شریعت کے موافق اجتہاد اور تفکیر نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحسن اور بعض اوقات ضروری ہے۔ حد کے متعلق یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ وہ گناہ سے باز رکھنے اور تادیب و تخویف اور زجر کے لئے رکھی گئی ہے، چور کی تادیب اس طرح ہوگئی کہ اس کا ہاتھ کٹ گیا، اور عوام الناس کے لئے تخویف و تاثیر کا باعث یہ ہوگیا کہ انھوں نے اس کے قطع کا اندوہناک اور اثرانگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اس کا ہاتھ خدا کی حد کو توڑنے اور عصیاں کی وجہ سے اس کی گردن میں پڑا ہوا بھی انھیں نظر آگیا اور اس کارروائی سے مکمل طور پر شریعت کا مقصد پورا ہوگیا۔

علم طب کی روز افزوں ترقیاں اور آپریشن کے جدید طریقوں میں محیر العقول — لیکن محیر القلوب نہیں — بلکہ مقلب القلوب تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اور "سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق" (فصلت۔ ۵۳) کی قرآنی صداقت سائنس اور طب کی تجلیوں میں نمودار ہونے کے لئے بے قرار ہے، اور اسلام علم کے سارے فوائد اور سائنس و طب کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں مسلمانوں کے لئے کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے اصولوں اور شریعت کی روح کے مخالف اور منافی نہ ہوں۔

اس صورت حال کے پیش نظر ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی کی بیان کردہ اس حدیث اور مسئلہ پر نظر ڈالیں جو راقم نے فتح القدیر اور قرطبی سے نقل کیا ہے، اور اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ مقطوع ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہے جس کے جسم سے وہ کاٹا گیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یا انگلیاں کٹی ہوئی ہوں[1]، اگر شلل کی وجہ سے اس کے کاٹنے سے ہلاک ہو جانے کا خطرہ نہ ہو۔

۱۔ یہ احناف کا قول ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تو پھر اس کے لیے طب کی ان سہولتوں اور کم یاب سہی لیکن کامیاب تجربوں سے مدد لینی جائز ہے یا نہیں؟ جن کی رو سے کٹے ہوئے ہاتھ، پیر دوبارہ جوڑے جانے اور سیدھا ہاتھ الٹی جگہ اور الٹا ہاتھ سیدھی جگہ پر جوڑے جانے کے کامیاب تجربے اور قصے جو ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں؟ قطع کے سلسلے کی ساری طبی سہولتیں تو گورنمنٹ کو دینی ضروری ہیں، لیکن اگر یہ طبی آپریشن فقہی طور پر جائز ہو تو اس پر خرچ کی جانیوالی رقم یا سہولتیں حکومت پر ہرگز ضروری نہیں ہوں گی، بلکہ یہ رقم مجرم کو اپنے پاس سے خرچ کرنی ہوگی یا اس کے اعزہ، اقربا اور دوست احباب اگر چاہیں تو اس کی مدد کرسکتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ممکن ہے کہ اس طرح مجرم اور سوسائٹی دونوں میں جرم سے اجتناب اور خوف کم ہو جائے گا، اور اس طرح شریعت کی حکمت پوری نہیں ہوسکے گی، یعنی حد زاجر نہ رہ جائے گی لیکن راقم کے نزدیک یہ محض ایک فرضی اعتراض ہوگا، کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ شریعت کی پہلی حکمت یعنی مجرم کو سزا دہ تو پوری ہوگئی، دوسری حکمت یعنی سوسائٹی اس سے سبق سیکھے وہ بھی پوری ہوگئی، تیسری بات یہ کہ یہ آپریشن تو ابھی کمیاب ہے اور تجربہ کی دنیا میں ہے اور بہت مخصوص ملکوں میں ہے، لیکن کوئی سا بھی معمولی سے معمولی آپریشن سو فیصد کامیاب ہونے کی گارنٹی اپنے اندر نہیں رکھتا، اور یہ کہنا کہ اس طرح چور بار بار چوری کرے گا اور آپریشن کرا لیا کرے گا، ایک محال مفروضہ ہے، کیونکہ عام انسان ان آپریشنوں تک کو بلا وجہ بلا ضرورت اور بلا خوف نہیں کراتے جن کی کامیابی کا علم تجربہ کی رو سے بار بار ثابت ہوتا رہتا ہے، اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ معمولی سے آپریشن تک میں جان تک جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اس لیے چور محض اس آپریشن کی تسلی میں دوبارہ چوری کرنے کی جرأت قسم کے خیال میں ہرگز عام حالات میں نہیں کرسکتا، اور یوں تو پھر ایک ہاتھ ضائع ہو جانے کے بعد بھی دوبارہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ چور کا ہاتھ حسب ذیل صورتوں میں نہ کٹے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چوری کرنے والے اور دوبارہ ان پر قطع کی حد نافذ ہونے والے ہزاروں ہزار میں ایک دو مل ہی سکتے ہیں اور میرے خیال میں نہ کوئی دوسرا سوسائٹی کا وہ شخص جو چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس سہولت کی وجہ سے چوری کا ارادہ کرے گا کیونکہ اس سہولت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی جسے چوری کرنی ہوتی ہے وہ قطع ید جیسی سخت سزا کی موجودگی میں بھی یہ کام کرتا ہے، اور نہ کوئی صالح شخص اس آپریشن کی سہولت مہیا ہونے کے بعد خوشی اور بلا خوف یہ کام شروع کر دے گا، علاوہ فطرتِ بشری کے اصول کے بھی یہ بات قابل غور ہے کہ یہ آپریشن نہ ہر صورت میں کامیاب ہو سکتا، نہ ہر ملک میں ہو سکتا، اور اس پر ہزاروں کے مصارف آ سکتے ہیں، کسی بھی چور کے لئے سو فیصد کامیابی کا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہزاروں روپیہ برباد کرنے کے بعد بھی مشتبہ ومشکوک، خطرناک اور غیر یقینی کامیابی کا سہارا لے کر کوئی شخص بہ ہوش وحواس چوری کا ارادہ کر سکتا ہے؟ ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "فاقطعوا" کی نص میں قطع کا حکم دیا گیا ہے، یہ بات بالکل صحیح ہے، لیکن اس ظاہر نص کی روشنی میں ہمیشہ فقہاء نے حدیث و اقوالِ صحابہ کی مدد سے احکام کے استنباط کیے ہیں، اس کے علاوہ یہ بات صحیح ہے کہ نص میں قطع کا قطعی حکم ہے اور اس کی قطعیت سے انکار نعوذ باللہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اور حاکم کے حکم سے جب قطع ہو گیا تو اس حکم کا منشا پورا ہو گیا، ایک وقیع اشکال راقم کے نزدیک یہ ضرور ہے کہ اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ چور ہمیشہ اپنے ہاتھ سے محروم رہے تاکہ یہ اس کے لیے نکال اور عبرت ہو اور جو شخص اس کو دیکھے اس کے لئے بھی چوری سے باز رہنے کا ذریعہ ہو، اگر ایسا ہو تو پھر یہ آپریشن صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن آیت قرآنی قطع کو بدلہ بتاتی ہے "جزاء بما کسبا، نکالا من اللہ" اور نکال کے معنی قرطبی یہ لکھتے ہیں: "نکلت بالفاعل به مایوجب ان ینکل به من ذلک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(الف) اگر اس کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا ہے، یا مشلول ہے، یا انگوٹھا کٹا ہوا ہے، یا اگر انگوٹھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(الفعل" (۶-۴،۱۱) ایسا فعل کرنا جس سے اس فعل سے باز رہے، اور یقیناً قطع ید ایسی سخت سزا ہے جو بیک وقت جزا اور نکال کا کام دیتی ہے، آیت کے آخر میں ہے" فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ" تابعی عطاء اور امام شافعی کے ایک قول میں توبہ قطع تک کو ساقط کر دیتی ہے تو کیا، جزا، نکال اور توبہ واصلاح کے بعد یہ آپریشن ....
.... : صحیح نہیں ہو سکتا؟ بہرحال اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ تاحیات چور پر حد کا اثر باقی رہے تو پھر اس مسئلہ پر بحث ہی نہیں کی جاسکتی، لیکن راقم کے سامنے یہ نظیر ہے کہ عام حدود کے زاجر ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تاحیات ان کا اثر باقی رہے، زنا چوری سے زیادہ فحش کام ہے، اس کی حد کوڑے لگانا ہیں جن کا کوئی اثر تاحیات باقی نہیں رہتا، اگر تاحیات حد کا اثر باقی رکھنا ہی حد کی حکمت ہوتی تو پھر اس جرم میں عضو تناسل، خصیتین، یا اگر اس سے تناسل وتوالد کی حکمت ختم ہونے کا خطرہ ہوتا تو کسی اور ایسے ظاہر عضو کو کٹوا دیا جاتا جس کو دیکھ کر دوسروں کو تاحیات عبرت حاصل ہوتی رہتی! شراب ام الخبائث ہے اس کی حد بھی کوڑے ہیں جن کا اثر تاحیات کچھ بھی باقی نہیں رہتا، اور کسی کے لئے بھی اس سے تاحیات عبرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حدود اسلامیہ کے عبرت آموز اور اثر انگیز ہونے کے لئے ان کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے، اور ان کا نفاذ مسلمانوں کے مجمع میں ایک بار اس کی پوری ضمانت ہوتا ہے کہ ان کا اثر دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے۔

بہرحال راقم نہ تو اس مسئلہ کو جائز کرنے ہی کے درپے ہے، اور نہ اس سلسلے میں کوئی فتویٰ دینا چاہتا ہے کہ یہ مجھ جیسے ناقص علم وتجربہ والے کا کام نہیں، اور نہ کسی ایک عالم کے لکھنے سے اس مسئلہ میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کٹا ہوا نہ ہو تو (کوئی سی بھی) دو انگلیاں کٹی ہوئی ہوں[1]۔

(ب) اگر اس کا دایاں پیر کٹا ہوا ہے، یا مشلول ہے یا اس میں ایسا لنگ ہے جس کی وجہ سے اس پر چلا نہیں جا سکتا[2]۔

(ج) اگر اس کا دایاں ہاتھ چوری کے بعد کسی بھی حادثہ کی وجہ سے جاتا رہا ہو (کٹ گیا یا ٹوٹ گیا ہو)

۳۔ (مذکورہ بالا صورتوں میں کسی بھی وجہ سے) اگر قطع نہ ہو سکے تو مجرم کو سزا تعزیر کے طور پر قانون عقوبات (لیبیہ) کے ماتحت دی جائے گی[3]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:

کوئی قول فیصل ہو سکتا، بلکہ یہ علمائے امت کی اکثریت کی رائے اور اجتہاد کی روشنی میں معرض بحث میں آسکتا ہے، راقم مسئلہ صرف اسی لئے درج کر رہا ہے کہ مشاہیر اہل علم و فضل جن میں اجتہاد کی اہلیت اور شرعی شرطیں پائی جاتی ہوں وہ مسئلے کو واضح کریں۔

۱۔ یہ بھی احناف کا قول ہے کہ اس طرح منفعت جسم ختم ہو جائے گی، ہاتھوں سے پکڑنے کی صلاحیت جاتی رہے گی۔

۲۔ یہ بھی احناف ہی کا قول ہے کہ اس طرح پیر سے چلنے کی منفعت ختم ہو جائے گی کہ جسم کی ایک شق یعنی ایک جانب سے ہاتھ اور پیر کا ٹنے سے چلنا دو بھر ہو جائے گا اور شریعت کی یہ حکمت حد حرابہ میں ظاہر ہوتی ہے جہاں قطع میں اختلاف کا حکم دیا گیا ہے یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔

۳۔ قانون عقوبات میں وارد سزاؤں کا ترجمہ تفصیل مضمون میں کروں گا۔

دفعہ ۲۳۔

جزئیات میں رجوع کہاں کیا جائے؟

امام مالکؒ کے مذہب میں مشہور قول کی تطبیق کی جائے ان چیزوں میں جن کے متعلق نص (حکم) اس قانون میں وارد نہیں ہوئی ہے، سرقہ اور حرابہ کے سلسلے میں جن پر حد واجب ہوگی، اور اگر مشہور (مذہب) میں نص نہ پائی جائے تو قانون عقوبات (لیبیہ) کی تطبیق کی جائے۔ (۱)

اور (حد کے) جاری کرنے کے طریقوں کے بارے میں اس قانون میں جہاں نص نہ ہو وہاں قانون اجانات جنائیہ (لیبیہ) کی تطبیق کی جائے (۲)

اس قانون کے احکام قانون عقوبات یا کسی دوسرے قانون کے احکام کو لغو نہیں کرتے، ان چیزوں کو چھوڑ کر جن کے بارے میں اس قانون میں نص موجود ہے۔

دفعہ ۲۴۔

تمام وزیروں کو چاہیئے کہ اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اس قانون کی تنفیذ کریں، اور اس قانون پر عمل کیا جائے سرکاری گزٹ میں چھپنے کے تیس دن بعد سے۔ (۳)

انقلابی کونسل

محمد علی الجدی	عبدالسلام احمد جلود، وزیر اعظم
وزیر انصاف	۴ رمضان ۱۳۹۲ھ
	۱۱ راکتوبر ۱۹۷۲ء

---

(۱) راقم تفصیلی مضمون "سرقہ و حرابہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں" کے اندر دونوں جرموں کی جزوی تفصیلات ومسائل مذاہب اربعہ واقوال علمائے امت بیان کرے گا۔

(۲) اس کی تفصیل بھی بعد کو بیان کی جائے گی۔

(۳) یہ قانون سرکاری گزٹ میں ۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۳ ردسمبر ۱۹۷۲ء کو وزیر عدل (انصاف) (باقی حاشیہ صفحہ)

کے حکم سے شمارہ ۴۰ سال نمبر ۱ میں نشر کیا گیا ہے، توضیحی یادداشت بھی اسی شمارہ میں نشر کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ راقم عنقریب پیش کرے گا۔ اس طرح اس قانون کا اجرار الحمد للہ ثم الحمد للہ لیبیا کی اسلامی سرزمین میں ۱۸ر ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۲ر جنوری ۱۹۷۳ء سے ہوگیا ہے۔ راقم کی اطلاع کے مطابق تادم تحریر دیکم اپریل ۱۹۷۳ء) ابھی تک کسی کے ہاتھ کٹنے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ تین چوری کی وارداتیں پبلک پراسیکوٹر کے پاس آئی ہیں، جن میں تحقیق جاری ہے کہ کیا ان میں حد کی شرط پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر شرطیں نہ پائی گئیں تو تعزیری طور پر دوسری سزائیں ملیں گی، اور اگر شرطیں منطبق ہوتیں تو کیس عدالت میں پیش کئے جائیں گے، اور آخری فیصلے کے بعد اجرا ممکن ہوگا۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ لیبیا میں چوری کی وارداتیں دوسرے ملکوں کے بالمقابل بہت ہی کم ہیں، لیکن گذشتہ چند سالوں سے کچھ بڑھ رہی تھیں۔ انشاء اللہ قانون شریعت کے احیاء اور حدود کے اجرار بلکہ اعلان ہی کے بعد بہت جلد یہ کم واقعات بھی معدوم ہو جائیں گے، اور ایک حد کا قیام چالیس دن کی بارش اور اس سے جو خیر و برکت نازل ہوتی ہے اس سے بہتر ہے (تفسیر قرطبی ۱۲- ۱۶۶) کا مفہوم قلب مومن تو ہمیشہ سے سمجھتا ہے اور مانتا ہے، لیکن عام انسانوں اور عالمی قانون جنایات کے ماہرین کی عقل و نظر بھی اس کی حقانیت کی منقود ہو جائے گی، اور پھر جب کامل اسلامی نظام و قانون کی حکمرانی سارے اسلامی ملکوں میں زبان اور عمل سے شروع ہو جائے گی، کتاب و سنت کی پیروی مقصد حیات بن جائے گی اور خدا کی توحید اور رسولؐ کی محبت رگ جان میں پیوست ہو جائے گی تو پھر فرحت و انبساط ہر خطہ میں نظر آئے گا۔ انسانی آبادی کو پُرامن زندگی گذارنے کی کھوئی ہوئی سعادت پھر واپس مل جائے گی اور چوری، سینہ زوری اور تمام اخلاقی گراوٹوں، اقتصادی پریشانیوں اور نفسیاتی آفتوں سے وہ محفوظ ہو جائے گی۔ امت اسلامیہ کو قوت، عظمت اور نصرت سب دوبارہ واپس مل جائے گی، اور خدا کی زمین نور شریعت سے معمور ہو کر قلوب انسانی کو تجلیات کا طور بنا دیگی " یوم تری المؤمنین والمومنات یسعی نورہم بین ایدیہم وبایمانہم (حدید ۱۲)

ترجمہ " اس دن تم مومنین اور مومنات کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور داہنے دوڑتا (پھیلتا) ہوگا " لیکن شیاطین الانس والجن، طاغوت کے پجاری یعنی وہ منافقین جو مسلمانوں میں مل کر اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں، جن کے

قول وفعل میں تضاد ہے، جن کے باطن اسلامی شریعت سے بیر رکھتے ہیں، خدا پر اعتقاد نہیں رکھتے، رسولؐ کی اطاعت نہیں کرتے اور قانون الٰہی کے نفاذ سے پریشان ہوتے ہیں۔ وہ سب اس دن نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوں گے، آیت قرآنی میں ان سے خطاب یوم قیامت کے سیاق میں کس قدر متاثر کر دینے والے پیرائے میں کیا گیا ہے، اور جس طرح وہ زندگی میں نفاق کرتے تھے اور ظلمت حیات نور مستقیم کے مقابلہ میں انھوں نے اختیار کیا تھا اسی کی مناسبت سے انھیں نور اور رحمت سے محرومی کی وعید سنائی جارہی ہے۔ اور آخر میں پھر ایمان کامل کی دعوت، خشوع الٰہی کی ضرورت اور منزل من اللہ قانون کی پیروی کی اہمیت پر اہل ایمان کو اس طرح ابھارا ہے، "یوم یقول المنافقین والمنافقات للذین آمنوا انظرونا نقتبس من نورکم قیل ارجعوا ورائکم فالتمسوا نورا فضرب بینہم بسور لہ باب باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب، ینادونہم الم نکن معکم، قالوا بلی ولکنکم فتنتم انفسکم وتربصتم وارتبتم وغرتکم الامانی حتیٰ جاء امر اللہ وغرکم باللہ الغرور۔ فالیوم لا یوخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا ماواکم النار ہی مولکم وبئس المصیر، الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذکر اللہ وما نزل من الحق" (حدید۔ ۱۳۔ ۱۶) ترجمہ "جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو ہم تمہارے نور سے (کچھ) اقتباس کرلیں (پل صراط کے اندھیرے میں) ان سے کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹو اور روشنی ڈھونڈو (یعنی دنیا میں واپس جاسکو تو چلے جاؤ کیونکہ وہ دارالعمل تھی، روشنی وہاں عمل سے جمع کی جاسکتی تھی، یعنی یہ کہ اب روشنی ملنی ممکن نہیں جیسے کہ دنیا میں واپس جانا ممکن نہیں) پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی، جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب، وہ ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے، وہ جواب دیں گے کیوں نہ تھے لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا، اور گھات میں (مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں) لگے رہے تم، اور شک میں پڑے رہے، تم، اور (باطل) امیدوں نے تم کو دھوکہ میں رکھا، یہاں تک کہ امر الٰہی (موت یا عذاب) آپہنچا اور بہکایا تم کو اللہ سے مغرور (شیطان یا دنیا) نے، سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کفار سے، تمہارا ٹھکانا آگ ہے، یہی تمہاری رفیق ہے، اور برا انجام ہے یہ، کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے خشوع (خوف اور یاد) حاصل کریں اور اس سے جو حق (سچا دین یا قرآن) اترا۔ ....

اجتہادی تحریک

(از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو توانائی عطا کی ہے اسے مصرف کے لحاظ سے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک پیداواری اور دوسرا تفریحی۔ لیکن پیداواری اور تفریحی زمروں میں تصرفِ اوقات کا تناسب دال اور نمک کے متماثل ہے۔ اور جب یہ تناسب ایک فرد کے روزمرّہ کے کاموں میں بدلتا ہے تو وہ فرد روبزوال ہو جاتا ہے۔ یہی حال پوری قوموں کا ہوتا ہے۔ پیداواری اور تفریحی طریقوں میں ہمیشہ فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔ جب ایک طریقۂ پیداوار ایک علاقے کی آبادی کو متموّل اور خوشحال نہیں رکھ سکتا ہے تو اس علاقے کے لوگوں کو تفریح کے لئے بہت کم وقت مِل پاتا ہے۔ اگر اس علاقے کے لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو کسی نئے ترقی یافتہ طریقۂ پیداوار کو اختیار کر کے متموّل نہیں رکھ سکتے تو یہ آبادی ضروریاتِ زندگی کے معیار میں کمی کر کے اپنے وجود کو کچھ دنوں کے لئے برقرار رکھ سکتی ہے اگر وہ سابقہ معیار زندگی اختیار کئے رہنے پر مصر رہتی ہے تو جلد برباد ہو جاتی ہے۔

لیکن چونکہ انسان فطری طور سے جدّت پسند واقع ہوا ہے اس لئے وہ نت نئے پیداواری طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک انسان اس سرزمین پر بہتر سے بہتر معیارِ زندگی اختیار کرنے کے باوجود زندہ ہے اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے سلطنتِ برطانیہ میں کبھی سورج غروب

نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جہالت اور بے روزگاری کا شکار تھا۔ کیونکہ پوری قوم پیداواری اور تفریحی زمروں کا تناسب کھو چکی تھی۔ لیکن آج برطانوی سیاسی اقتدار عملاً اپنی قومی حدود میں سمٹ کر رہ گیا ہے وہاں نہ صرف یہ کہ جہالت بھوک اور بیروزگاری کا خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ وہاں کے عام لوگوں کا معیارِ زندگی بیس پچیس سال پہلے کے مقابلہ میں کافی بہتر ہے۔ اب یہ ملک اس پوزیشن میں ہے کہ ہزاروں لاکھوں غیر برطانوی لوگوں کو اپنی معیشت میں کھپا سکے۔ جرمنی اور جاپان کے کارنامے تو اس معاملے میں برطانیہ سے بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ ان سب ملکوں کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے پیداوار کے نئے طریقے ایجاد اختیار کئے ہیں جنہیں عام طور سے جدید ٹیکنالوجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پرتگال ایک سلطنت ہونے کے باوجود ایک پسماندہ ملک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو عصرِ جدید کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ پرتگیزی لوگ یوروپ کی غریب ترین قوم ہیں۔ حالانکہ ان کے قدرتی وسائل ڈنمارک و ہالینڈ وغیرہ کے مقابلے میں اچھے خاصے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی آبادی یا قوم ضرورت کے ساتھ ساتھ طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار رکھتی ہے تو وہ اپنی حاکمانہ حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے حاکمانہ حیثیت کا اظہار سیاسی اقتدار کی شکل میں ہوتا تھا۔ اور اب اس نے اقتصادی اقتدار کی شکل اختیار کرلی ہے۔ امریکہ، جرمنی اور جاپان کے اقتصادی اقتدار کی عالمگیر نوعیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

تقریباً یہی بات پوری انسانیت کے لئے بحیثیت مجموعی کہی جا سکتی ہے۔ اگر

انسان ضرورت کے مطابق طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کرتا رہا اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب باقی رکھ سکا تو اس زمین پر اس کی حاکمانہ حیثیت یا خلیفۂ ارض کی حیثیت برقرار رہے گی۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنے آبا و اجداد کے طریقۂ پیداوار پر فخر کرتے ہیں اور محض اس کے احیاء کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں تو ان کا معیارِ زندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ عملاً نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ پورا وقت پیداواری ہی میں کیوں نہ صرف کرے۔ لہٰذا جو بھی کوئی قوم زندہ و خوش حال رہنا چاہتی ہے۔ اسے بدلے ہوئے حالات میں زیادہ ترقی یافتہ پیداواری طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔

ہر طریقۂ پیداوار کے ساتھ ایک نیا تفریحی ڈھنگ بھی ایجاد ہوتا ہے۔ جو نئی تہذیب کا ایک جزو ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی زوال یافتہ یا رو بہ زوال قوم نئی ترقی یافتہ تہذیب کی طرف راغب ہوتی ہے تو عام طور سے اس کا رجحان پیداواری طریقوں کے بجائے تفریحی طریقوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ زوال یافتہ قوم کا طریقۂ تعلیم ہوتا ہے۔ جو پوری قوم کو قناعت اور سہل روی کی طرف مائل کرتا ہے اور انہیں سختی و جفاکشی کے راستے سے دور رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے مقابلے میں عقبیٰ کی بہتری کا غلط تصور دیکر انہیں مقابلہ سے کترانے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ قصہ مختصر کسی زوال پذیر قوم کی تعلیم گاہیں قتل گاہیں یا صلاحیتوں کے قبرستان کے مترادف ہوتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جب عرب کے نواح میں پھیلی تو ان کو جہاں روما کی مضبوط و منظم فوج کا سامنا پیش آیا۔ وہیں ان کو یونان کے اس فلسفہ کا سامنا کرنا پڑا جسمیں الجھ کر یونانی قوم عملی ہونے کے بجائے علمی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کو محض علمی حیثیت سے حاصل کیا۔ اور اس کو اسلامی رنگ

میں رنگ دیا۔ یہ محض جفاکشی اور عملی دنیا سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کا نتیجہ تھا لیکن اس زمانے کا علم کلام آج بھی اسی طرح پڑھایا جاتا ہے اور اس کو معراج تصوّر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اِس زمانے میں فلسفہ کے میدان میں اس علم کلام کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ حدیث کی تحقیق میں ہمارے قدیم محدثین نے جو جفاکشی کی اس کا عشر عشیر بھی آج کے علماء میں ناپید ہے۔ فقہا نے جو فقہ آج سے ایک ہزار سال پہلے مرتّب کی آج کل کے علماء اس کا اعادہ کرادینا ہی کمال سمجھتے ہیں ۔ اس کے برخلاف دینی تحقیق کے معاملے میں مغربی علما (مستشرقین) وہی رول ادا کررہے ہیں جو مسلم متکلمین نے اسلامی عروج کے دور میں کیا تھا۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی نئے زمانے میں قدامت پسندوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا بلکہ اس کے برخلاف مجدّدین نے ہی ہمیشہ اہم کام انجام دیئے۔ مثال کے طور پر خود ہندوستان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے دو تحریکیں ساتھ ساتھ ابھریں ۔ ایک علی گڑھ اور دوسری دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ اول الذکر کا مقصد مجتہد پیدا کرنے تھے اور موخرالذکر کا مقصد اسلاف کی تقلید پر زور دینا تھا۔

زمانے سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے تقلیدی تحریک بڑی حد تک متموّل خاندانوں میں پھل پھول نہ سکی بلکہ محض غریب ونادار خاندانوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے سکی۔ اجتہادی تحریک گرچہ بلند پایہ مجتہد پیدا نہ کر سکی پھر بھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں پر کافی معاشی معاشرتی اور سیاسی اثرات ڈالے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقلید کی زنجیر توڑ کر اجتہاد کے لئے زمین ہموار کی ۔ اور ہندوستانی مسلمانوں میں مقابلے سے کترانے کے بجائے مقابلے کے لئے للکارنے کی ہمّت پیدا کی۔ جو ہمیشہ زندہ قوموں

کا شعار رہا ہے ۔ مگر اب علیگڑھ اجتہادی تحریک کا گہوارہ ہونے کے بجائے تقلیدی تحریک کا مرکز ہوتا جا رہا ہے ۔ تبلیغی جماعت کے روز افزوں اثرات کی اس کے علاوہ اور کیا توجیہ کی جا سکتی ہے ۔ القصہ مختصر ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی مؤثر اجتہادی تحریک نہ ابھری تو یہ پوری قوم یا تو اپنی موت آپ مر جائے گی یا اگر باقی رہی تو اس کا مقام پست ترین زمروں میں رہ جائے گا ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سے جو لوگ دینی اور دنیاوی امور پر یکساں گہری نظر رکھتے ہیں وہ آگے آئیں ۔ اور اجتہاد کے بند دروازے کو پھر سے کھولیں ۔ لیکن یہ کام جتنا اہم ہے اسی قدر نازک و پیچیدہ بھی ہے ۔ نئی اجتہادی تحریک کا آغاز ایک ایسے ادارہ کی شکل میں کیا جا سکتا ہے ۔ جہاں پری یونیورسٹی سے لیکر پی ۔ ایچ ۔ ڈی Ph. D تک ہر مضمون کی تعلیم کا انتظام ہو ۔ جہاں پر بلند پایہ اساتذہ کا تقرر اور معیاری طلبا کا داخلہ ہو ۔ جہاں مقابلہ سے کترانے کے بجائے مقابلہ کیلئے للکارنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کی جائے ۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں اس خلا کو پورا کرنے کے لئے آغاز ایک کالج سے کیا گیا تھا مگر بیسویں صدی کے آخری دور میں اس کی ابتدا ایک ریسیرچ انسٹی ٹیوٹ (Research Institute) سے کی جانی چاہئے ۔ اور دھیرے دھیرے پری یونیورسٹی کی طرف جانا چاہئے ۔ یعنی زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ابتدا ہی مخالف سمت سے کرنی پڑے گی ۔

کیا امت مسلمہ اس گراں بار کو اٹھانے کے لئے تیار ہے جو اس کی زندگی و ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے ۔

استدراک

نفائس المآثر

۹۷۳ ھ

برہان ۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء جلد ۱۷، شمارہ ۴ میں "مولانا آزاد لائبریری" کے عنوان کے تحت صـ۲۸۲ (۶۶) پر نفائس المآثر کے ضمن میں دو فروگذاشتیں قابلِ توجہ ہیں ۔

(۱) ۔ مصنّف کے نام کے ساتھ "نامی" چھپ گیا ہے جو دراصل "کامی" ہے یہ میر علاؤ الدولہ کا تخلص ہے ۔

(۲) "اس تذکرے کے کسی اور نسخہ کا بھی علم نہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مکمل نسخے کا علم نہیں ۔ آٹھ کتابخانوں میں غیر مکمل نسخے پائے جاتے ہیں ۔ امپیریل برطانیہ، ازبکستان، ادہر، لاہور، لکھنؤ، راس اور رہاتسک ۔ (تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان صـ۱۰۸)

نفائس المآثر ۔ تاریخی نام ہے ۔ یہ شروع تصنیف کی تاریخ ہے ۔ خاتمہ ۹۷۹ ھ پر ہوا ہے ۔ تاریخی حصہ ۹۷۲ ھ ۹۸۲ ھ میں ختم ہوا ہے مگر نسخے میں ۹۹۸ ھ تک کے حالات ملتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے جابجا اہم واقعات کا اضافہ بعد میں کیا ہے ۔

نسخہ مولانا آزاد لائبریری

بخط نسخ خوشخط، اوراق ۲۷۴ + ۶ = ۲۸۰، سطر ۱۹، ۲۱، سائز ۷×۹

مکتوبہ ۱۰۸۵ھ شروع میں ۶، اوراق پر فہرستِ شعراء ہے۔ ابتدائے کتاب میں دیباچہ ہے جو ۱۱، اوراق پر حمد و نعت، سببِ تالیفِ کتاب ابحاثِ متعلقہ شعر اور تعریف اکبر بادشاہ پر مشتمل ہے۔ ۲۱۳ اوراق پر ۱۸۴ شعرائے فارسی (از اوحدی تا یوسفی) کا تذکرہ اور ۵۰، اوراق پر تین شاہانِ مغلیہ (بابر و ہمایوں و اکبر) کے حالات ہیں۔

مصنّفِ کتاب

میر علاؤ الدولہ کامی قزوینی موجود ۱۰۰۴ھ، قزوین کے اہلِ علم خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس کے والد میر یحییٰ بن عبداللطیف الحسینی بڑے مؤرخ و صاحبِ تصانیف تھے۔ ہمایوں بادشاہ نے ان کی ذہانت وطبّاعی کی تعریف کی ہے۔ مصنّف کے دونوں بھائی میر عبداللطیف اور قاضی صفی الدین عیسیٰ بھی ممتاز اہلِ علم سے تھے۔ اور بھائی کی طرح یہ دونوں بھی قزوین سے آکر دربارِ اکبری سے متعلق رہے۔ مصنّف کا بھتیجا غیاث الدین علی احمد عرف نقیب خاں بن میر عبداللطیف بھی اکبر شاہ کے ندیموں میں تھا۔ اس نے ابوالفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی طرح مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا قابلِ قدر نسخہ مکتوبہ ۱۱۱۲ھ مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔

محمد عبدالشاہد خاں شروانی۔ اسسٹنٹ لائبریرین شعبہ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری

ایک تبصرہ

نثار احمد فاروقی صاحب

دیوان بیرم خاں خان خاناں

مرتبہ: ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی

سید حسام الدین راشدی

ڈاکٹر محمد صابر

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔ کراچی۔ ۱۹۷۱ء

صفحات: ۱۲۰ قیمت: پندرہ روپے

انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی نے ایران کے "جشن دوہزار پانصد سالہ شہنشاہی" کے موقع پر قدیم متون کی ترتیب و اشاعت کا قابلِ قدر کام شروع کیا تھا۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلۂ متون کی دوسری کڑی ہے۔

کتاب کے ساتھ بیس صفحات کا مقدمہ انگریزی زبان میں ہے۔ اسے ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی نے لکھا ہے۔ بیرم خاں کے فارسی دیوان کا متن سید حسام الدین راشدی نے اور ترکی دیوان کا ڈاکٹر محمد صابر نے مرتب کیا ہے۔

دیوانِ فارسی میں پانچ قصیدے ہیں: پہلا قصیدہ حضرت علی ابن ابی طالب اور دوسرا

حضرت امام رضا (علیہا السلام) کی منقبت میں ہے۔ تیسرا ہمایوں بادشاہ کی مدح میں، چوتھا جلال الدین اکبر اعظم کی ثنا میں اور پانچواں کسی شخص "دریا خاں" کی تعریف میں ہے جسے بیرم خاں "محبوب خویش" بتاتا ہے۔

ان کے علاوہ غزلیں، فردیات، قطعات اور رباعیات ہیں۔ ایک "فتح نامۂ قندھار" اور دوسری سوری خاندان پر ہمایوں کے فتح پانے کی تاریخ ہے جسے محمد عوفی نے خود ہمایوں سے منسوب کیا ہے، لیکن یہ دیوان بیرم کے مخلوطات میں پایا گیا ہے اس لیے بخوبی ممکن ہے کہ اس کا مصنّف وہی ہو۔

دیوان ترکی میں کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ غزلوں کے علاوہ چند قطعات، رباعیات اور کچھ فردیات ہیں۔ دیوان کے مرتبین نے ممکن حد تک ترتیب متن کے جدید تر تقاضوں کی تکمیل کا لحاظ کیا ہے۔ متن کی اساس وہ مطبوعہ نسخہ ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی طرف سے سر ڈینیسن راس (SAR DENISON ROSS) نے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے چھاپا تھا۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم کا ایک مخطوطہ بھی مقابلے کے لیے پیشِ نظر رہا ہے۔ کتب خانہ حبیب گنج (مسلم یونیورسٹی: علی گڑھ) میں بھی ایک بیاض ہے جس میں بیرم خاں کا کلام پایا جاتا ہے۔ اس پر ایک سیر حاصل مضمون ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا تھا جو سہ ماہی 'فکر و نظر' (جنوری ۱۹۶۳ء) میں چھپا تھا۔ مرتب نے اسی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کلام کی تصحیح اور متن کی تعیین میں معاصر تاریخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

دیوان ترکی کے متن کی تصحیح میں ڈاکٹر محمد صابر نے نسخہ کلکتہ (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) کے علاوہ دو اور مخطوطات سے مقابلہ کیا ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ کلکتہ ایڈیشن میں اشعار کی کل تعداد ۳۶۶ تھی۔ اب اس میں ۲۲ نئے اشعار کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد صابر ترکی زبان سے بخوبی واقف ہیں، انھوں نے متن کی تعیین میں ترکی زبان کے چغتائی لہجے کا اتباع کیا ہے اور حواشی میں جا بجا ایسے اشارات درج کیے ہیں جن سے کلاسیکی ترکی اور جدید زبان کے فرق کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر اس صدی میں ہونے والی تحقیقات سے بھی انھوں نے صحتِ متن کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے اس حصے کی داد بجا طور پر وہی حضرات دے سکتے ہیں جو ترکی زبان سے واقف ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس کے ساتھ ہی ترکی اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی شامل کر دیا جاتا تو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے والوں کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا۔ مثلاً سر ڈینیسن راس کو شعر نمبر ۲۰۲ اور شعر نمبر ۳۰۳ کے پڑھنے میں دشواری پیش آئی تھی اور ان کا متن مبہم رہ گیا تھا۔ اب ڈاکٹر محمد صابر نے ان اشعار کی صحیح قراءت درج کی ہے اور ان دونوں کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے مقدمے میں درج کر دیا ہے۔ اس میں ایک شعر (نمبر ۳۰۳) کا مفہوم حیرت انگیز حد تک غالب کے اس شعر سے متوارد ہے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اگر اس شعر کا انگریزی ترجمہ نہ ہوتا تو تبصرہ نگار کے لیے اس توارد کا اندازہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح اگر ترکی الفاظ کی ایک مختصر فرہنگ بھی " الفبائی ترتیب " سے شامل ہوتی تو بہت سے لوگ محض اٹکل سے بعض اشعار کا مفہوم سمجھ سکتے تھے۔

ترکی متن سے اس برصغیر میں لطف اندوز ہونے والے معدودے چند ہی ہوں گے۔ لیکن لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس دیوان کی اشاعت بہت اہم ہے۔ اس سے یہ علم ہو جاتا ہے کہ عہدِ ہمایوں و اکبر میں رائج ترکی اور فارسی زبان کا ذخیرۂ الفاظ کیا تھا اور ان میں کتنے الفاظ مشترک تھے اور پھر کون کون سے اُردو زبان کو ورثے میں ملے۔ اس طرح بہت سے الفاظ کی قدیم ترین سند دریافت ہو جاتی ہے۔

لسانیات کے طالب علموں کو بھی اس میں بہت کچھ دلچسپی کا سامان ملے گا۔ مثلاً ایک مصرع ہے:

اشجار دا ہر برگ تری حمد ینگا گویا

بظاہر یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ درختوں کا ہر پتّا تری حمد و ثنا بیان کر رہا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہاں " دا " خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ کیا پنجابی لہجے میں یہ حرف ترکی زبان سے داخل ہوا ہے؟

بیرم خاں کا انتقال بہت افسوسناک حالات میں ہوا۔ یہ تاریخ کا معلوم واقعہ ہے کہ وہ عہدِ اکبری میں معتوب ہوا تھا۔ اُسے مقامات مقدسہ کی زیارت اور حج کے بہانے ہندوستان سے باہر جانے کی رخصت دی گئی تھی اور وہ غالباً مستقل ہجرت کے ارادے سے اپنا ساز و سامان ساتھ لے کر چلا تھا۔ اس کے ہمراہ سلیم شاہ سوری کی بیوہ بھی تھی جو اپنی لڑکی کو بیرم خاں کے بیٹے سے منسوب کرنے کا ارادہ لے کر حجاز جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک افغان نے اس منصوبے کو خاک میں ملانے کے لیے بیرم خاں کو گجرات کے شہر پٹن میں قتل کر دیا۔ اس کی لاش وہاں ایک مقامی قبرستان میں دفن کر دی گئی تھی پھر اُسے دہلی منتقل کیا گیا اور سترہ سال کے بعد (۱۵۷۷ء) اس کا تابوت مشہدِ مقدس میں سپردِ خاک کرنے کے لیے دہلی سے بھیجا گیا۔

یہاں یہ تذکرہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بیرم خاں شیعی عقائد رکھتا تھا اور اسی نے ہمایوں بادشاہ کو بھی ان عقائد کی طرف مائل کیا تھا۔ یہ اس لحاظ سے ایک کامیاب ڈپلومیسی تھی کہ اس طرح ہمایوں کو شاہ طہماسپ صفوی کی پوری ہمدردی حاصل ہو سکی اور بیس سال کے بعد ایرانی فوج کی عملی مدد سے ہندوستان کو دوبارہ فتح کر کے مغل سلطنت کی نئی بنیاد گذاری ممکن ہوئی۔ اکبر اعظم نے بعد کو بیرم خاں کی بیوہ سے عقد کر لیا تھا اور اسی وجہ سے عبدالرحیم خان خاناں نے شاہی محل میں پرورش پائی تھی۔

امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے آستانے سے بیرم کو خصوصی عقیدت تھی اور وہ ہمیشہ نہایت بیش قیمت تحائف وہاں کے مجاوروں کو بھیجتا رہتا تھا۔ خود آستانِ مقدس پر اس نے جواہرات سے جڑا ہوا ایک علم چڑھایا تھا۔ اسی روضے کے جوار میں اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اور قبر کے سرہانے ایک پتھر پر بیرم خاں کا لکھا ہوا قصیدہ "در مدح حضرت علی ابن ابی طالبؓ" کندہ کر کے لگا دیا گیا جس کے یہ چند اشعار اپنے لطف و اثر اور شکوہ و جلالت کے اعتبار سے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں:

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او
اگر غلام علی نیست خاک بر سر او

در مدینۂ علم آنکہ از کمال شرف
فتادہ اندر سراں ہمچو خاک بر در او
بعہد ہیچ پیمبر کسے نبود کہ بود
برادر و خسرو ابنِ عم ـــــ پیمبر او

آخر میں بطور دعا کہتا ہے:

شہا ـ غلام تو بیرم کہ از عنایت تست
کہ گشتہ سلطنت ظاہری میسّر او
ولے بخاک جناب تو روئے خویش نسود
ازاں چہ سُود کہ بر چرخ سود افسر او

غرض دیوانِ بیرم خاں کا یہ اڈیشن بہت سلیقے سے مرتب ہوا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف برصغیر کے فارسی ترکی ادبیات کا ایک قابلِ قدر خزینہ ہے بلکہ عہدِ مغلیہ کی تاریخ، ہند ایرانی روابط اور ادبی موضوعات کے ارتقاء پر کام کرنے والوں، یا اُردو زبان کے قدیم ترین ورثے کا لسانیاتی تجزیہ کرنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

تبصرے

سیرت مبارکہ محمد رسول اللہؐ | از مولانا محمد میاں صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی۔ کتابت جلی اور طباعت بہتر۔ ضخامت ۴۳۷ صفحات۔ قیمت مجلد ۲۰/- پتہ: کتابستان: قاسم جان اسٹریٹ دہلی - ۶

یہ کتاب جو سلسلہ کی جلد اول ہے، اگرچہ موضوع اس کا سیرت مبارکہ ہی ہے لیکن اس کی ترتیب خالص تبلیغی اور دعوتی ہے۔ چنانچہ پہلے انسان۔ زندگی اور موت کی حقیقت پر ایک بے تکلف مکالمہ کی شکل میں گفتگو کرنے کے بعد مذہب اور پیغمبروں کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور اس کے بعد مشہور پیغمبروں اور کتب سماویہ کے حالات قرآن اور انجیل مقدس کے بیانات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں پھر عرب قبل اسلام پر ایک خاصا طویل باب ہے اور اس کے بعد سیرت شروع ہو جاتی ہے، اس سلسلہ میں مولانا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی۔ خاندانی اور خانگی حالات و سوانح اور آپ کی تعلیمات اور اخلاق و فضائل ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ بحیثیت ایک اعلیٰ ترین انسان کے آپ کی شخصیت کا پیکر ابھر کر ایک غیر مسلم کو بھی متاثر کر سکے، اس لحاظ سے یہ بڑی عمدہ اور مقصد میں کامیاب کتاب ہے، زبان سلیس اور انداز بیان شگفتہ و دل نشین ہے اگر مولانا کے سامنے علامہ کتانی کی التراتیب الاداریہ اور جواد علی کی المعرب قبل الاسلام ہوتیں تو وہ کتاب کو اور زیادہ بہتر بنا سکتے تھے۔ بہر حال کتاب جو متعدد مطبوعہ مقالات پر اس طرح مشتمل ہے کہ ان مقالات کے نائٹل پیج اور فہرست مضامین اور چند اشتہارات بھی درمیان میں آ گئے ہیں۔ قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے، لیکن بعض جگہ عربی عبارت کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے، مثلاً ۲۱

نوٹ صفحہ ۲۵۵ کی ترتیب بدل گئی ہے [illegible] لکھا جائے

علما بھی اس کا شکار ہوگئے، واقعہ یہ ہے کہ بہادری، سخاوت، فیاضی اور غیرت وحمیت وغیرہ جو اوصاف عرب قبل از اسلام کے بیان کئے جاتے ہیں وہ حداعتدال اور اقدار حقیقی سے متجاوز ہونے کے باعث اخلاق حمیدہ ہیں ہی نہیں اور اس بنا پر فلسفۂ اخلاق کی رو سے وہ "فضائل" میں نہیں۔ بلکہ رذائل میں شمار ہونے کے لائق! چنانچہ ان کی بہادری کو ہم فلسفۂ اخلاق کی اصطلاح میں "شجاعت" نہیں، بلکہ تہوران کی سخاوت کو جود نہیں بلکہ اسراف وتبذیر اور اُن کی غیرت کو غیرت نہیں، بلکہ کبر نفس کہیں گے وقس علیٰ ھذا۔ دوسری قسم کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کے ساتھ مل کر یہی رذائل ہیں جنھوں نے ان عربوں کو "فی ضلال مبین" کا مصداق بنا دیا تھا، آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر وفاقہ کے متعلق عام طور پر جو روایات مشہور ہیں وہ بہت زیادہ محل نظر ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں:

(۱) قرآن میں ہے: "ووجدک عائلاً فاغنیٰ" "اللہ نے آپ کو تنگ دست پایا تو آپ کو غنی بنا دیا"

(۲) ہزاروں انسان تھے جو پروانوں کی طرح آپ پر فدا تھے اور یہ سب اصحاب صفہ ہی تو نہ تھے، بلکہ ان میں ابوبکر، عثمان غنی اور عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہم) جیسے دولت مند اور ارباب ثروت بھی تو تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کاشانۂ نبوت میں فاقے پہ فاقے ہوں اور ان حضرات کو خبر بھی نہ ہو۔

(۳) اہل وعیال کے لئے نان نفقہ کا بندوبست فرض ہے، اس لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کا بندوبست ضرور کیا ہوگا، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ حضور نے ان سب کے لئے، یہ انتظام کر دیا، مگر خود بھوکے رہے۔

(۴) بھوکا رہنا اسلام میں محمود نہیں۔ مذموم ہے اور اللہ کی ناشکری ہے۔

(۵) آخر حضور کے لئے کیا چیز نہیں تھی جس کے باعث آپ کو مسلسل فاقوں کی نوبت آئے۔ درحقیقت اس طرح کی باتیں ہمارے صوفیا اور واعظوں نے مشہور کر رکھی ہیں۔ چنانچہ

این المحاموتا" کا ترجمہ: کہاں ہیں ہمارے حامی" صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ "نا" ضمیر جمع متکلم نہیں ہے، بلکہ محاموں جمع محامی کی ہے اور الف اشباع کا ہے اسی طرح اس شعر میں "معشر" کا ترجمہ "گروہ" ہونا چاہیئے نہ کہ "معاشرہ" دونوں میں بہت فرق ہے۔ ج ۱ ص ۱۶ پر "تکسب المعدوم" کا ترجمہ: "آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی" کے بجائے صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "جو لوگ کچھ آمدنی نہیں رکھتے آپ ان کے لئے آمدنی کا ذریعہ بہم پہنچاتے ہیں" علاوہ ازیں "تقری الضیف" کا بھی صحیح ترجمہ یہ ہوگا "کہ آپ مہمان کی خاطر مدارات کرتے ہیں" نہ یہ کہ "باہر کے مسافر جو بے ٹھکانہ ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں" ص ۱۱۵ پر "عصمۃ الارامل" کا ترجمہ "بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ" کی جگہ "بیوہ عورتوں کی حفاظت گاہ" زیادہ موزوں رہے گا۔ عام مفسرین کی طرح جن آیات میں حضور کو خطاب کیا گیا ہے مولانا نے بھی وہاں لفظ "تو" اور واحد مخاطب کا صیغہ استعمال کیا ہے لیکن درحقیقت دل کو یہ بڑا شاق گذرتا ہے پھر مولانا نے عرب قبل اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ص ۷۷ پر آپ نے عربوں کو اخلاق و عادات اور اوصاف و کمالات کے اعتبار سے اس زمانہ کی بے نظیر قوم قرار دیا ہے" سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مولانا کا یہ بیان صحیح ہے تو قرآن میں ان کے متعلق "وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین" کیوں فرمایا گیا چنانچہ آگے چل کر مولانا خود لکھتے ہیں جن سے سابقہ بیان کی تردید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا مقام رکھتے تھے، مگر روحِ تمدن سے وہ بھی محروم تھے ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی" ص ۲۱۴/۲۱۳، علاوہ ازیں اخلاقی معائب کی آپ نے ایک جگہ ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے "عرب ان تمام بیماریوں کے علاوہ...... ص ۲۱۲/۲۱۱ اصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں مستشرقین کے ایک طبقے نے عرب قبل از اسلام کے متعلق ایک بہت غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے پھر عرب قومیت کے علمبرداروں نے اسے اور ہوا دی اور ہمارے جدت پسند

اس سلسلہ میں ایک روایت "الفقر فخری" ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن محقق علما اور محدثین نے اس روایت کو موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب نے اس فقرونا قہ کی بات کو بڑے طمطراق سے اور بڑھا چڑھا کر کئی صفحوں میں لکھا ہے، ص ۲۴۲/۲۹۴ پر مولانا نے نجاشی کے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مگر اس کی دلیل کیا ہے؟ تاریخ سے اس کا ثبوت میرے علم میں نہیں ہے کتاب بحیثیت مجموعی بہت مفید اور معلومات افزا ہے، اس کا مطالعہ کرنا باعث ثواب ہوگا۔

(۱) غالب کی کہانی ۱۲۸ صفحات قیمت 2/50
(۲) وطنی نظمیں ۸۰ صفحات قیمت 85/-
(۳) منی کا تحفہ ۹۶ صفحات قیمت 1/20
(۴) منی کے گیت ۶۴ صفحات قیمت 75/-
(۵) گھر کا آئینہ ۳۲ صفحات قیمت 32/-
(۶) جھنگو منگو ۳۲ صفحات قیمت 50/-

از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ سائز خورد، کاغذ کتابت وطباعت سب اعلیٰ اور معیاری، گٹ اپ خوبصورت اور دل کش، پتہ :- نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

نیر صاحب بچوں کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی عمر ہی بچوں کے پڑھانے اور ان کے ساتھ رہنے سہنے اور بات چیت کرنے میں گذری ہے، اس لئے ان کی طبیعت نفسیات اور ان کی تعلیم و تربیت کے مسائل و معاملات پر ان کی نظر ایک ماہر فن کی ہے، پھر ان میں ہر بچہ کے ساتھ بے اختیار محبت کرنے کا طبعی اور فطری جذبہ اور زبان اور اس کے محاورات پر قدرت کے باعث آسان زبان میں نثر و نظم لکھنے کا ایک ایسا ملکہ اور سلیقہ بھی ہے جس نے بلا مبالغہ انھیں مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کا مثنیٰ بنا دیا ہے، مذکورہ بالا کتابوں میں سے پہلی کتاب میں غالب کے حالات اور ان کی شاعری اور ان کے اخلاق و عادات پر ایسی سہل اور شگفتہ زبان میں گفتگو کی گئی ہے کہ ساتویں آٹھویں جماعت کے بچے اس کو دل لگا کر پڑھ سکتے اور خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، غالب ایسے نغز گو شاعر کو اس طرح بچوں سے متعارف کرنا کمال صناعی ہے، دوسری کتاب میں ایسی نظمیں اور گیت ہیں جن میں وطن کا حسن و جمال باہمی اتحاد و اتفاق

اور وطن کی خدمت کے لئے بچوں کی اعلیٰ تعلیمی اور اخلاقی تربیت وغیرہ مضامین بیان کئے گئے ہیں، تیسری اور چوتھی کتاب علی الترتیب نظموں اور گیتوں کے لئے مخصوص ہیں، ان کے موضوعات بچوں کے رجحانات اور ان کے روزمرہ کے مشاہدات وتجربات کے مطابق ہیں، نظم اور گیت دونوں میں زیروبم کے ذریعہ ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بچے اور بچیاں آسانی سے یاد کرسکیں، پانچویں کتاب نثر میں چند کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں گھر کی صفائی ستھرائی عمدہ اخلاق اور رہن سہن کے طور طریق پر دلچسپ اور سبق آموز گفتگو اور آخری کتاب میں دو ریچھوں کی سرگذشت حیات دلچسپ افسانوی پیرایہ میں بیان کی گئی ہے، غرض کہ بچوں کے لٹریچر میں یہ سب کتابیں گلِ سرسبد کا حکم رکھتی ہیں، لیکن یہ دیکھ کر سخت دکھ اور افسوس ہوا کہ یہ کتابیں دس بارہ برس کی مدت میں صرف دو ہزار، اور وطنی نظمیں ۲۸ برس کی مدت میں صرف پانچ ہزار نکل سکی ہیں۔ یہ اردو زبان کی کس مپرسی وبیکسی اور اہل زبان کی بے غیرتی وبے حسی کی نہایت افسوسناک دلیل ہے، اگر اس پایہ کی کتابیں انگریزی یا ہندی یا بنگالی یا مرہٹی میں ہوتیں تو مصنف کبھی کا لکھ پتی بن گیا ہوتا اور ایک شاندار کوٹھی اور کار کا مالک ہوتا۔ لیکن آہ اردو!

جس کے تم دلبر ہو جس دل میں تمھاری یاد ہو
وہ ہمیشہ خاک چھانے اور سدا برباد ہو

برہان

جلد ۷۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء شمارہ ۶

نظرات

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی اور مسلمانوں کے لئے تو علم دین اور علم کائنات دونوں ہی ضروری ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو عظیم ادبار پڑا تھا اس سے نجات پانے اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی راہ تعلیم کے ذریعہ ہی ہموار ہوئی تھی۔ سرسید نے جب کالج قائم کیا تو ساتھ ہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی۔ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان جو تعلیم میں بہت پسماندہ تھے بلکہ اس سے نفور تھے اور علوم جدیدہ کو اپنے لئے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے، ان کو تعلیم جدید کی اہمیت وضرورت کا احساس اور اس کی طرف رغبت وشوق دلایا جائے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کے نمونہ پر پورے ملک میں جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج بنائے جائیں۔ چنانچہ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ کانفرنس نے ان دونوں میدانوں میں بڑی سرگرمی اور جوش سے کام کیا۔ علی گڑھ کالج اگر "گل" تھا تو کانفرنس نسیم چمن تھی جس نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں صور کا کام کیا اور انھیں نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی۔ لیکن تقسیم کے بعد جو حالات (خصوصاً شمالی ہند میں) پیش آئے ان کا اثر کانفرنس پر بھی پڑا اور وہ صرف زیرلب ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ فعال ومتحرک ہونے کی ضرورت تھی۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تعلیم کے معاملہ میں جنوبی ہند کے مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں

کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بیدار مغز، روشن خیال اور عملاً متحرک و فعال ہیں۔ چنانچہ وہاں ان کی کئی انجمنیں ہیں جنھوں نے اس سلسلہ میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ کیرالا کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اب تک ۳۵ ہائی اسکول، چند کالج (جن میں میڈیکل اور انجینئرنگ کالج بھی شامل ہیں) متعدد زچہ خانے، یتیم خانے، اساتذہ کے لئے ٹریننگ اسکول اور شبینہ مدارس وغیرہ قائم کرچکی ہے اور مزید برآں تین لاکھ روپیہ سالانہ کے وظائف مستحق اور ضرورتمند طلباء کو تقسیم کرتی ہے۔ مدراس میں ساؤتھ انڈین ایجوکیشنل ٹرسٹ (SIET) کے ماتحت اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا ہے برہان میں اس کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے۔

جنوبی ہند کی ان تعلیمی سوسائٹیوں کا کام ان کی چار ریاستوں تک ہی محدود تھا لیکن ملک کے حالات کا اقتضا تھا کہ آل انڈیا تحریک کی حیثیت سے اس اہم اور ضروری کام کو سرگرمی اور جوش کے ساتھ شروع کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں جب کالیکٹ میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کی ایک عظیم تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی" بھی قائم کی گئی اور رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت اسے رجسٹرڈ بھی کرالیا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کے بعد اس کا پہلا اجلاس "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں بمبئی میں ہوا اور دوسرا اجلاس گذشتہ ماہ نومبر میں پٹنہ میں ہوا جس کا افتتاح شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔ محترمہ لیڈی انیس امام نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے صدارت کی۔ ملک کے اطراف و اکناف سے آٹھ سو کے قریب نمائندوں اور مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس ۱۶ سے ۱۸ نومبر تک تین دن رہی۔ ہر اجلاسِ عام میں خواص اور عوام نے بتعداد کثیر جس جوش و خروش سے شرکت کی اس سے تحریک خلافت کے جلسوں کی یاد تازہ ہوگئی، ان تین دنوں میں متعدد سیمینار بھی تعلیم نسواں، عام تعلیم، ٹکنکل ایجوکیشن، بنیادی مذہبی تعلیم، اعلیٰ مذہبی تعلیم، اور مسلمانوں کے سماجی اور اقتصادی معاملات و مسائل

الگ الگ منعقد ہوئے جن میں مقالات پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔ مندوبین میں ایک خاصی تعداد خواتین کی بھی تھی۔ ان کا اجلاس الگ منعقد ہوا۔ تجاویز منظور کی گئیں۔ قیام و طعام کا انتظام خاطر خواہ تھا۔ پٹنہ کے باہمت مسلمان لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اتنی بڑی کانفرنس کا اہتمام و انتظام کیا، خصوصًا یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ بہار کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑی بیداری اور مخلصانہ کام کرنے کا بڑا جذبہ ہے۔ انھوں نے اپنی الگ ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کے ماتحت وہ مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاح کے سلسلہ میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن ان کو ضرورت صحیح رہنمائی کی ہے۔ ہمارے علمار کی یہ ایک بڑی افسوسناک کوتاہی اور عاقبت نااندیشی ہے کہ انھوں نے وعظ و تقریر یا پیری مریدی کی راہ سے عام مسلمانوں سے تو ربط رکھا، لیکن تعلیم جدید کے نوجوان طبقہ سے ربط پیدا کرنے اور ان کے مسائل و معاملات پر غور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمار کا دائرۂ اثر و اقتدار صرف عوام تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ ان کے اثر سے آزاد ہوتا جا رہا ہے، البتہ جماعت اسلامی نہایت منظم طریقہ پر اور دل کی لگن سے اس خلا کو پر کر رہی ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اس کا نفوذ و اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، یہ صورت حال جہاں بجائے خود خوش آیند اور امید افزا ہے وہاں علمار کے لئے بھی ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتی اور ان کو احتساب نفس کی دعوت دیتی ہے۔ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔

انھیں دنوں لکھنؤ میں اردو زبان کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی اور پھر اردو زبان کے اخبارات کے اڈیٹروں کی کانفرنسیں بھی بڑے پیمانہ پر منعقد ہوئیں اور کامیاب رہیں۔ ان دونوں کانفرنسوں سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا دن کے وقت سورج کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اور تو اور بعض مسلمان بھی مسلمانوں کے لئے لسانی اقلیت اور اردو کے لئے اقلیتی زبان کی اصطلاح استعمال کرنے

لگے ہیں چنانچہ وزارت داخلہ کے نائب وزیر جناب محسن صاحب نے بھی پچھلے دنوں اپنے ایک بیان میں اردو کو اقلیت کی زبان کہا ہے، بے شبہ مسلمان ایک مذہبی اقلیت ہیں، کیونکہ مذہب میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ لیکن وہ لسانی اقلیت کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ اسی زبان میں ان کے ساتھ ان کے برادران وطن بھی شریک ہیں، صرف یہی ایک غلط تصور ہے جو اردو کی موجودہ مشکلات کا سبب بنا ہوا ہے، اس بنا پر اردو کا مسئلہ ایک اقلیتی مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ خالص قومی اور جمہوری مسئلہ ہے اور اس کو اسی نظر سے دیکھنے اور اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

"برہان اور ندوۃ المصنفین ضعظے میں"

افسوس اور پریشانی کے عالم میں یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ ان دنوں "ندوۃ المصنفین" اور اس کا ترجمان "بُرہان" دونوں بحران کا شکار ہیں۔ قارئین برہان اور ندوۃ المصنفین کے حلقے کے احباب جانتے ہیں کہ اپنی روش نہ الحاح وزاری کی ہے نہ شکوہ اور شکایت کی۔ ۱۹۴۷ء کی قیامت سر سے گذر گئی مگر ہم نے اُف نہیں کی حالانکہ ادارہ کی جان اس قیامت خیز بربادی کے بعد ہی نکل چکی تھی۔ "برہان" کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا ۷۶ سال کی اس طویل مدت میں اس رسالہ پر ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس کی آمدنی اور مصارف کا توازن قائم نہ رہ سکا ہو۔ مگر یہ نقصان ادارہ کی مطبوعات کی فروخت سے پورا کیا جاتا رہا۔ ۱۹۶۵ء سے پاکستان سے کاروبار بند ہوا تو ادارہ کی چولیں بھی ہل گئیں اور بڑی کشاکش سے یہ وقت گزرا۔ گذشتہ تین چار مہینوں سے مصارف ناقابل برداشت ہو گئے اور اسباب ظاہری کے اعتبار سے کوئی شکل ایسی باقی نہیں رہی کہ برہان کو جاری رکھا جا سکے، قیمت میں اضافہ کتنا کیا جائے؟ اور کہاں تک کیا جائے۔ عام طور پر قارئین رسالہ غیر مستطیع ہیں "برہان" جیسے علمی اور دینی رسالوں کا حلقۂ اشاعت محدود ہی ہوتا ہے۔ ادارہ کی حالت یہ ہے کہ تمام نکلنے والی کتابوں کا میل ٹوٹ گیا ہے اور سر دست ان کے شائع ہونے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ ۱۹۳۹ء سے ادارہ کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال اپنے معاونوں کو چار جدید کتابیں دیتا رہا ہے۔ اس سال اب تک جدید کتب کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے ادارہ کے پاس کبھی کوئی محفوظ سرمایہ نہیں رہا۔ جرأت رندانہ ہی سے کام چلتا تھا افسوس ہے اب یہ جرأت بھی جواب دے رہی ہے۔ کاغذ کی قیمت پہلے ہی کیا کم تھی کہ ان دو مہینوں میں دگنی ہو گئی۔ اس وقت جو کاغذ برہان میں لگایا جاتا ہے اس کی قیمت ۸۰ روپے فی رم ہے، اسی نسبت سے کتابت، طباعت اور دوسرے مصارف میں اضافہ ہو گیا ہے ان حالات میں کیا کیا جائے! اندازہ یہ ہے کہ جنوری ۱۹۷۴ء سے برہان کی اشاعت ملتوی کرنی پڑے گی۔ اور جب ادارہ سے جدید کتابیں شائع نہیں ہوں گی تو معاونوں سے فیس کیسے وصول کی جائے گی۔ اسی لیے بحالات موجودہ نہ صرف برہان بلکہ ادارہ کا وجود بھی خطرے میں ہے یہ سطریں اس لیے تحریر کی گئی ہیں کہ قارئین حالات کی نزاکت سے باخبر رہیں۔

عہدِ نبوی کا تاریخی جائزہ

(۵)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

جنگ بدر

ساتویں مہم کے قائد رسول اللہؐ تھے، ان کے ساتھ کوئی دو ڈیڑھ سو مہاجر تھے اور سواری کے لئے کل بیس اونٹ، ان کا مقصد قریش کا تجارتی قافلہ پکڑنا تھا جو شام جا رہا تھا۔ ناکافی اونٹوں سے پیدا ہونے والی سست رفتاری کے باعث رسول اللہؐ مقررہ جگہ یعنی مکہ سے شام جانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع ذوالعُشَیرہ نامی کاروان اسٹیشن جو مدینہ سے اسی نوے میل مغرب میں تھا، اتنی دیر میں پہنچے کہ قافلہ نکل چکا تھا۔ دو ڈھائی ماہ بعد یہ قافلہ ابوسفیان کی نگرانی اعلیٰ اور بیس اکیس دوسرے بڑے قریشی تاجروں کی معیت میں حجاز کے بازاروں کے مطلب کا بہت سا سامان لے کر شام سے واپس ہوا تو رسول اللہؐ کے جاسوسوں نے خبر دی کہ قافلہ بدر سے ہو کر گزرنے والا ہے جو تجارتی شاہراہ پر مدینے سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں شاہراہ کا مدینہ سے قریب ترین اسٹیشن تھا۔ رسول اللہؐ نے ایک تقریر میں مال غنیمت کی امید دلاکر مہاجرین و انصار دونوں سے اپیل کی کہ قافلہ پکڑنے کے لئے بلاتاخیر مسلح ہوکر ان کے ساتھ چلیں۔ پے در پے ناکامیوں اور بے سروسامانی حتیٰ کہ سواری تک نہ ہونے سے پیدا ہونے والی گوناگوں تکلیفوں کے باعث مہاجرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور مزید قسمت آزمائی کی ان میں نہ ہمت تھی نہ اسے سودمند سمجھتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہؐ کے

سامنے صورت حال کا جائزہ لیکر انھیں مہم موقوف کرنے کا مشورہ دیا لیکن رسول اللہؐ ہر بار سے زیادہ پرامید تھے، ان کی مسلسل ترغیب واصرار سے کئی درجن مہاجر چلنے کے لئے تیار ہو گئے، باقی نے معذوریوں کی آڑلی۔ انصار کے اوس وخزرج قبیلوں کی اکثریت مہم لے جانے کے خلاف تھی۔ سورۂ انفال کی اس آیت میں مہاجرین وانصار کے اسی منفی رجحان کی طرف اشارہ ہے۔

وإنّ فريقاً من المسلمين لكارهون ، يجادلونك في الحق بعد ما تبيّن كأنما يساقون إلى الموت وهم ينظرون۔ مسلمانوں کی ایک جماعت قافلہ پکڑنے کیلئے نہیں جانا چاہتی تھی، یہ لوگ مہم لے جانے کی حقانیت کے بارے میں جو واضح ہو چکی تھی تم سے بحث ومباحثہ کرتے تھے اور مہم پر جانے سے ایسا ڈرتے تھے گویا سامنے کھڑی موت کی طرف لے جائے جا رہے ہوں۔ اس آیت کے اجمال پر عربی روایت نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

وتخلّف عن النبي بشر كثير من أصحابه كرهوا خروجه وكان فيه كلام كثير واختلاف[1]۔ رسول اللہؐ کے بہت سے ساتھی ان کے ساتھ نہیں گئے، وہ مہم لے جانے کے خلاف تھے اور اس باب میں ان کے درمیان خوب بحث ومباحثہ ہوا اور سخت اختلاف پایا جاتا تھا۔ انصار کی ایک چھوٹی سی جوان اور جوشیلی اقلیت جس کے دوسرے اور تیسرے درجہ کے لیڈر رسول اللہؐ کی خوشنودی حاصل کر کے اپنا رسوخ بڑھانا چاہتے تھے، مہم کے حق میں تھی۔ یہ اقلیت جس میں دو سو اکتیس آدمی تھے۔ ایک سو ستر خزرجی اور اکسٹھ اوسی، دونوں قبیلوں کے غریب وگمنام طبقہ پر مشتمل تھی جس کے پاس نہ صحیح ہتیار تھے نہ سواری کے لئے اونٹ، جسے اس کے جوان اور با امنگ لیڈروں نے تجارتی قافلہ کی غنیمت سے مالا مال ہونے کی امید میں دلا کر چلنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا، اوس وخزرج کے دونوں قبیلوں میں اس وقت گیارہ نقیب تھے جن میں سے ہر ایک اپنے زیر اثر خاندانوں کو رسول اللہؐ کی اطاعت کرانے کا ذمہ دار

---

[1] مغازی ص ۱۲

تھا لیکن چونکہ بیشتر اوسی وخزرجی لیڈر قافلہ کی گرفتاری ناقابل وقوع اور رسول اللہؐ کی دسترس سے باہر تصور کرتے تھے، اس لئے اُن کے ہم قوم اس مہم پر جانے سے کترا رہے تھے، یہی وجہ تھی کہ بلیغ کوشش کے باوجود ہر نقیب مجوزہ مہم کے لئے بیس اکیس سے زیادہ جوان فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ دوسو اکتیس انصاریوں کے مقابلہ میں مہاجرین کی تعداد ستتر[2] اور بقول بعض چالیس[1] ہی تھی، مدینہ میں ان کی آبادی سے بہت کم۔ رسول اللہؐ کی اس مختصر فوج میں صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے جن پر تین تین چار چار آدمی سوار ہوتے تھے۔ قریشی قافلہ کی طرف روانہ ہوتے وقت رسول اللہؐ کی زبان پر یہ دعا رہتی: مالک میرے ساتھیوں کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں، انھیں سواری عطا کر، ان کے پاس کپڑا نہیں، انھیں کپڑا دے، وہ بھوکے ہیں، انھیں پیٹ بھر کھانا دے، وہ مفلس ہیں، انھیں دولت عطا کر۔ أللهم إنهم حفاة فاحملهم، أللهم إنهم عراة فاكسهم، أللهم إنهم جياع فأشبعهم وعالة فأغنهم[3]

شام سے واپسی کے وقت ابوسُفیان کو جو قافلہ کا نگران اعلیٰ تھا جاسوسوں نے خبر دی کہ محمدؐ کا ارادہ قافلہ پر چھاپہ مارنے کا ہے۔ ابوسفیان نے فوراً قریشی اکابر کے پاس قاصد بھیجکر مدد طلب کی۔ اس قافلہ میں مکّہ کے ہر چھوٹے بڑے تاجر کا سامان تھا جس کی مجموعی قیمت عزّ راوی ڈھائی لاکھ روپے (پچاس ہزار دینار[4]) بتاتے ہیں۔ قریش کے تقریباً سارے اکابر لگ بھگ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، ان کی فوج میں سات سو اونٹوں، سو گھوڑوں کے علاوہ خاصی مقدار میں تجارتی سامان بھی تھا جسے بدر کے ہاٹ میں بیچنے کے لئے انھوں نے

---

[1] انساب الاشراف ۱/۲۹۰

[2] ابن سعد ۲/۲۰، مغازی ص۱۹

[3] مغازی ص۲۱

ساتھ لے لیا تھا۔ اکابر نے ابوسفیان سے کہلا بھیجا کہ ہم مدد کے لئے آرہے ہیں اور بدر کے میدان میں تم سے ملیں گے، وہاں پہنچ جاؤ۔ ابوسفیان بدر کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مکہ کی فوج ابھی نہیں آئی ہے نیز یہ کہ مدینہ کے جاسوس پوچھ گچھ کرنے بدر آئے تھے۔ ابوسفیان گھبرا گیا اور تیزی سے قافلہ بدر کے پڑوس سے نکال لے گیا۔ محفوظ جگہ پہنچکر اس نے قریشی اکابر کو مطلع کیا کہ میں بخیریت قافلہ لے کر ساحلی راستہ سے مکہ کی طرف گامزن ہوں، اب بدر جانے کی ضرورت نہیں ہے، سب لوگ مکہ واپس چلے جائیں۔ اکثر قریشی اکابر واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے لیکن ان کی ایک چھوٹی سی جماعت نے جس کی قیادت صف اول کا زعیم اور رسول اللہؐ کا سب سے بڑا مخالف عمرو بن ہشام جس کی کنیت ابوالحکم بدل کر رسول اللہؐ نے ابوجہل کا لقب دیا تھا، جانے سے انکار کر دیا، اس کی اور اس کے ہم خیال جماعت کی رائے تھی کہ محمدؐ کے ساتھیوں نے دو ماہ پہلے حج کے مقدس مہینہ رجب میں دھوکہ دیکر بطن نخلہ میں ان کا جو تجارتی قافلہ لوٹا تھا اور ان کے حلیف عمرو بن حضرمی کو قتل کیا تھا، اس کا انتقام لینا اور محمدؐ کے جارحانہ رجحانات کی روک تھام ضروری ہے تاکہ قریش کے تجارتی قافلوں پر آئندہ ہاتھ ڈالنے کی انھیں جرأت نہ ہو۔ قریشی اکابر میں پھوٹ پڑ گئی، ان کی اکثریت واپسی و ترک جنگ کے حق میں تھی، اقلیت انتقام اور آئندہ اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لئے جنگ ضروری قرار دیتی تھی، قریشی اکابر آپس میں رد و قدح کرتے بڑھتے چلے گئے۔ اُن کے دو بارسوخ لیڈر انتقام اور جنگ کو قریش کے بڑے مفادات کے لئے مُضر تصور کر کے اپنے اپنے خاندانوں۔ زُہرہ اور عَدِی کے تین سو سے اوپر آدمیوں کو لیکر مکہ چلے گئے۔ اس اثنا میں ابوسفیان بھی اکابر سے آملا، اس نے کہا کہ جس مقصد کے لئے تم لوگ نکلے تھے وہ پورا ہو چکا ہے اور قافلہ بخیریت اپنی منزل جا پہنچا ہے لہٰذا گھر لوٹ چلو اور محمدؐ سے بلاضرورت الجھکر اپنی قیمتی جانیں مت گنواؤ۔ جنگ کے حامیوں نے ابوسفیان کا مشورہ بھی مسترد کر دیا۔ قریشی اکابر اپنی قوم کے ساتھ بدر کے وسیع میدان میں ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں خیمہ زن ہوئے۔ جب دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہونے لگیں تو جنگ کے مخالف اکابر نے پھر ایک بھرپور کوشش

کی کہ ابوجہل اور اس کے ہم خیال بغیر لڑے مکہ لوٹ جائیں لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی، ان کے معمر، پختہ کار، مالدار اور معزز لیڈر عتبہ بن ربیعہ نے جو اکثریت کا ترجمان تھا ایک پرزور اپیل میں کہا کہ میں بطن نخلہ میں لٹنے والے قافلے کا معاوضہ اور مقتول قرشی حلیف عمرو بن حضرمی کی دیت اپنے پاس سے ادا کرنے کو تیار ہوں، محمدؐ اور ان کے بہت سے ساتھی ہمارے رشتے دار ہیں، وہ ہمیں قتل کریں یا ہم انھیں بہرحال اس سے ایک دوسرے کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور ایک دوسرے کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگے گی، محمدؐ سے لڑنا ہمیں زیب نہیں دیتا، عربوں کو ان سے لڑنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے، اگر محمدؐ نے حکومت حاصل کرلی تو اس سے بحیثیت رشتہ دار ہماری اپنی شان بھی بڑھے گی اور اگر وہ مارے گئے تو بغیر لڑے بھڑے ہمارے پہلو کا کانٹا نکل جائے گا[1] .... ابوجہل اور اس کے ہمنوا ساتھیوں پر اس اپیل کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، ابوجہل نے عتبہ کو آڑے ہاتھوں لیا، اسے طعنہ دیا کہ تم ڈر کر بھاگنا چاہتے ہو، محمدؐ تمہارا چچازاد بھائی ہے اور تمہارا لڑکا (ابوحذیفہ) اس کے ساتھ ہے اس لئے تم دونوں کی سلامتی کی خاطر جنگ سے گریز کر رہے ہو، محمدؐ کی چھوٹی سی فوج دیکھ کر تمہارے ہاتھ پیر پھولے جا رہے ہیں، جبکہ دشمن سامنے کھڑا ہے تم ہمیں چھوڑ کر فرار ہونا چاہتے ہو اور ہمارے حوصلے پست کر رہے ہو، بخدا ہم بغیر لڑے نہیں جائیں گے[2]۔ اپنے ہم قوموں کو میدان جنگ میں چھوڑنے کی عار اور اس کے قبائلی وخاندانی برے نتائج کے پیش نظر جنگ کے مخالف اکابر قریش جنگ میں شرکت کے لئے مجبور ہو گئے لیکن ان کے اور ان کے زیر اثر سیکڑوں سپاہیوں کے حوصلے پست تھے۔ رمضان ۲ھ کے اواسط میں جنگ شروع ہوئی تو رسول اللہؐ کے جوان اور جوشیلے سپاہیوں نے چن چن کر بہت سے پیرانہ سال اور مضمحل قوی اکابر کو قتل کر ڈالا،

---

[1] مغازی ص۵۸

[2] ایضاً ص۵۶

ان میں عُتبہ اور ابوجہل بھی شامل تھے۔ قریشی فوج کے حوصلے پہلے ہی مخالفین جنگ کی موثر اپیلوں سے پست ہو چکے تھے، اپنے صف اول کے لیڈروں کی موت سے ان کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی، عالم مایوسی میں وہ جان بچانے کے لئے میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مکہ کا رُخ کیا۔ قریش کے ستر سے کچھ اوپر آدمی مارے گئے، اتنی ہی تعداد میں گرفتار ہوئے۔ رسول اللہؐ کے چھ مہاجر اور آٹھ انصاری کام آئے۔ رسول اللہؐ کے ساتھی دشمن کے خیمہ میں گھس گئے اور جو چیز جس کے ہاتھ آئی اس نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ سے چیزیں چھیننے اور جھپٹنے کے بہت سے قضیے پیدا ہو گئے، جو لوگ لڑے تھے انھوں نے ان لوگوں کو مال غنیمت دینے سے انکار کر دیا جو رسول اللہؐ کے آس پاس چوکیداری کر رہے تھے یا جن کی تلوار سے دشمن کا کوئی آدمی قتل نہیں ہوا تھا یا جو دشمن کی صفوں سے دور رہے تھے[1]۔ رسول اللہؐ کو یہ باتیں سخت ناگوار ہوئیں، وہ چاہتے تھے کہ سارا مال غنیمت ان کے پاس لایا جائے اور وہ اپنی صوابدید سے اسے تقسیم کرائیں، اس وقت وحی کے ذریعہ مال غنیمت تقسیم کرنے کا یہ ضابطہ مقرر ہوا کہ اس کے پانچ حصوں میں سے چار مساویانہ فوج میں تقسیم کر دئے جائیں اور پانچواں حصہ رسول اللہؐ کو دیدیا جائے۔ دو ماہ پہلے بطن نخلہ میں حاصل ہونے والے اولین مال غنیمت کی تقسیم اسی طرح ہوئی تھی لیکن اس وقت وحی سے اس کی توثیق نہیں ہوئی تھی اس ضابطہ کی روشنی میں بدر کا سارا مال غنیمت قبضہ کرنے والوں کو رسول اللہؐ کے پاس جمع کرنا پڑا اور حسب ضابطہ ان میں تقسیم کیا گیا[2]۔ ابو اُمامہ باہلی نے عُبادہ بن صامت (انصاری) سے مال غنیمت سے متعلق قرآنی آیتوں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا یہ آیتیں ہمارے یعنی اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جب ہم مال غنیمت کے استحقاق اور تقسیم کے بارے میں

---

[1] ابن کثیر ۲/۳۰۲، طبری ۲/۲۸۶

[2] ابن ہشام ص ۴۵۶

جھگڑنے لگے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آئے تھے، اس کے نتیجہ میں خدا نے مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ سے نکال لیا اور رسول اللہؐ کے حوالے کر دیا اور انھوں نے اسے ہمارے درمیان مساویانہ تقسیم کر دیا۔ سألت عبادة بن الصامت عن الأنفال، فقال فینا معشرَ أصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساءت فیه اخلاقنا فنزعه الله من أیدینا فجعله إلی رسوله فقسمه بین المسلمین عن بواء[1]۔ مالِ غنیمت میں ایک سو پچاس اونٹ، تیس گھوڑے، بہت سے ہتھیار، بڑی مقداریں کھانے کی چیزیں، لباس اور چرمی سامان کا وہ ذخیرہ شامل تھا جو اکابر قریش بدر کے ہاٹ میں بیچنے کے لئے ساتھ لائے تھے[2]۔ خمس کے علاوہ جو قرآنی ضابطہ کے مطابق رسول اللہؐ کو ملا۔ انھوں نے سہم صفی بھی لیا۔ عرب دستور کے مطابق ہر قبائلی رئیس مالِ غنیمت سے کوئی عمدہ چیز اپنے لئے پسند کر لیتا تھا۔ گھوڑا، اونٹ، تلوار، غلام، کنیز۔ رسول اللہؐ نے دو چیزیں پسند کیں۔ قرشی رئیس منبہ بن حجاج کی تلوار ذوالفقار اور ابوجہل کی تیز رو اونٹنی جس پر آگے دو تین برس تک وہ لڑنے جایا کرتے تھے[3]۔ رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی جب بدر سے لوٹے تو ان کی مالی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی، ہر شخص کے پاس ایک یا دو بنڈل سامان کے تھے، جسموں پر اچھا لباس تھا اور بیشتر کے پاس سواری کے اونٹ تھے[4]۔

زرِ مخلصی

قریش کے شر سے اوپر قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں مسلمان مختلف الرائے تھے، ایک

---

[1] ابن ہشام ص۴۵۶

[2] مغازی ص۹۹، انساب الاشراف ۱/۲۹۰

[3] ابن سعد ۲/۱۸، ۱۹

[4] ایضاً ۲/۲۰

جماعت کی جس کے سرگرم ترجمان مہاجرین میں عمر فاروق اور انصار میں سعد بن معاذ تھے، رائے یہ تھی کہ اِن سب کو اسلام اور رسول اللہؐ کی مخالفت کی پاداش میں قتل کر دینا چاہئے، دوسری جماعت جس کے پرجوش وکیل ابوبکر صدیق تھے سب کو چھوڑنے کے حق میں تھی، ان کی دلیل یہ تھی کہ قیدی رشتے دار ہیں، اُن میں سے کوئی رشتہ کا باپ ہے، کوئی چچا، کوئی تایا، کوئی بھائی اور کوئی بھتیجا، اس لئے مارنے کی بجائے اِن سے زرِ مخلصی لے لیا جائے اور یہ روپیہ نادار مہاجروں اور غریب نومسلموں نیز رسول اللہؐ کے مخالفوں کی سرکوبی کے لئے اسلحہ اور دوسرا جنگی سامان فراہم کرنے پر صرف کیا جائے۔ رسول اللہؐ نے اس تجویز پر جو ان کی مرضی کے مطابق بھی تھی، عمل کیا۔ زرِ مخلصی کے چار گریڈ مقرر ہوئے۔ دو ہزار روپے (چار ہزار درہم)، ڈیڑھ ہزار، ہزار اور پانچسو[1]، جس حیثیت کا آدمی ہوتا اس سے اسی حیثیت کا زرِ مخلصی لیا جاتا، اس کے عزیز و اقارب مکہ سے آکر مقررہ رقم ادا کر کے اسے لے جاتے تھے۔ ستّر سے اوپر ان قیدیوں میں سے تین کو رسول اللہؐ نے قتل کرا دیا۔ عقبہ بن ابی مُعَیط، نضر بن حارث اور طُعیمہ بن عَدِی، ان کی ذات سے مکہ میں رسول اللہؐ کو زیادہ اذیت پہنچی تھی، دو آدمیوں[2] کو جو اُن کے مطلبی رشتہ دار تھے اور زرِ مخلصی ادا کرنے سے قاصر، رہا کر دیا[3]، معدودے چند جو زرِ مخلصی ادا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے دس دس[3] انصاری بچوں کو لکھنا سکھا کر آزاد کر دئے گئے۔ زرِ مخلصی کی مجموعی مقدار کے بارے میں ہمارے ماخذوں نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اندازاً اسے چالیس پچاس ہزار قرار دیا جا سکتا ہے۔

فتح کی خبر کا اہل مدینہ پر اثر

فتحیاب ہوتے ہی رسول اللہؐ نے بلاتاخیر خوشخبری دینے کے لئے دو[1] قاصد مدینہ بھیجے،

---

[1] ابن سعد ۲/ ۱۸، ۲۲

[2] مغازی ص ۱۳۴

[3] ابن سعد ۲/ ۲۲

ایک شہر کے بالائی محلوں اور دوسرا زیریں محلوں میں، ان میں سے ایک قاصد رسول اللہ کے لے پالک زید بن حارثہ اُن کی اونٹنی قصوا، پر سوار ہو کر آئے تھے، انھوں نے فتح کا اعلان کر کے قریش اکابر کے نام لے لیکر کہا کہ یہ سب جنگ میں مارے گئے۔ مدینہ کے مہاجر، انصار، اوس وخزرج کے غیر مسلم، عبداللہ بن اُبَیّ کے تبع نمائشی مسلمان اور یہودیوں کے لئے یہ خبر اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ اُسے باور کرنے کو تیار نہیں ہوئے، عام خیال یہ تھا کہ رسول اللہؐ کو شکست ہوئی ہے، زید بن حارثہ ان کی اونٹنی قصوا پر میدان جنگ سے بھاگ کر آئے ہیں اور باقی ہزیمت خوردہ مسلمان عنقریب ان کے پیچھے پیچھے آتے ہوں گے۔ اوس وخزرج کے غیر مسلم، متذبذب نمائشی مسلمان اور یہودی اس خیال سے بہت خوش تھے اور گلی کوچوں اور بازاروں میں اس کا چرچا کرتے پھرتے تھے۔ نمائشی مسلمانوں کے لیڈر اس تصور سے محظوظ ہو رہے تھے کہ رسول اللہؐ میں نبوت کا زُعم کم ہو جائے گا، وہ اپنی بے چون وچرا اطاعت پر اصرار نہیں کریں گے اور ان کی رائے کا پہلے سے زیادہ احترام کرنے لگیں گے، یہودی اکابر یہ سوچ کر مسرور ہو رہے تھے کہ شکست کے بعد رسول اللہؐ کی دھاک نبوت ختم ہو جائے گی، اوس وخزرج کے قبیلے ان سے بدظن ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور یہودی آزادی وسالمیت کو لاحق وہ خطرہ ٹل جائے گا جو رسول اللہؐ کی ہجرت سے یہودیوں کے دل ودماغ پر چھایا ہوا تھا۔[1]

بنو قَینُقاع کی جلا وطنی

نوید فتح پا کر بیشتر اہل مدینہ کے تاثرات کا بدر سے واپسی پر رسول اللہؐ کو علم ہوا تو ان کی طبیعت سخت مکدر ہوئی، ان کی رائے میں مدینہ کے غیر مسلم، متذبذب اور نمائشی مسلمانوں میں اپنی نبوت کے عدم اعتراف یا بے چون وچرا اطاعت سے انحراف کی ساری ذمہ داری یہودیوں

---

[1] انساب الاشراف ۲۹۳/۱

پرتھی جنھوں نے انھیں نبی ماننے سے انکار کر دیا تھا، جو قرآنی آیتوں کا مذاق اڑاتے تھے، یہودی وعیسائی مذاہب اور انبیاء کے بارے میں قرآن کی بیان کردہ تصریحات غلط قرار دیتے تھے، جو رسول اللہؐ کے کاموں پر نقد کرتے، ان کے قول وفعل میں تناقض دکھاتے تھے، انھیں جھوٹا اور طالب حکومت بتاتے تھے اور اوس وخزرج کے اکابر سے ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔ فتح بدر کو شکست تصور کر کے یہودیوں کی حالیہ شادمانی نے رسول اللہؐ کو بے حد مشتعل کر دیا۔ مدینہ کے تین یہودی قبیلوں میں سے دو۔ نُضیر اور قریظہ جن کے پاس وسیع زراعتی فارم اور نخلستان تھے، شہر سے باہر رہتے تھے اور تیسرا قبیلہ قینُقاع جس کے پاس فارم اور نخلستان بہت کم تھے، مدینہ کے جنوب مشرق میں شہر سے بالکل متصل آباد تھا، قینقاعی یہودی تجارت اور دستکاری کے ذریعہ روزی کماتے تھے، رسول اللہؐ نے قینقاع کے اکابر کو بلا کر کہا کہ میری نبوت کا اقرار کر کے اسلام لے آؤ ورنہ تمھارا انجام اس سے کہیں زیادہ برا ہوگا جیسا کہ بدر میں قریش کا ہوا ہے[1]۔ اکابر نے کہا کہ ہم اپنے مذہب سے ہر طرح مطمئن ہیں اور کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑ سکتے، کسی کو زبردستی دوسروں کا مذہب بدلوانے کا کیا حق ہے۔ تمھاری یہ دھمکی کہ قریش سے زیادہ ہمیں نقصان پہنچاؤ گے تو یہ محض تمھاری خوش گمانی ہے، قریش کی نسبت ہمیں لڑائی کی زیادہ بصیرت اور تجربہ ہے۔ اس ملاقات سے رسول اللہؐ اور یہودیوں کے تعلقات اور زیادہ تلخ ہو گئے، چند دن بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ قینقاع کو اپنا گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا۔ کوئی انصاری عورت ایک قینقاعی سنار کے پاس بیٹھی ہوئی زیور کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی کہ ایک یہودی نے نکیلی لکڑی لیکر پیچھے سے اس کی قمیص کا بند ڈھیلا کر دیا، جب وہ اٹھی تو بند کھل گیا اور اس کا سینہ عیاں ہو گیا، یہودی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ عورت نے شور مچایا، انصاری مسلمان آ گئے اور ان میں سے ایک نے طیش میں آ کر بند ڈھیلا کرنے والے یہودی کو قتل کر دیا، اس کی چیخ پکار سے آس پاس کے یہودی

---

[1] مغازی ص۱۷۷، انساب الاشراف ۱/ ۳۰۸

جمع ہو گئے اور انھوں نے مسلمان قاتل کو مار ڈالا۔ دونوں طرف بھیڑ لگ گئی اور بدکلامی ہونے لگی مسلمان یہودیوں کو دھمکی دیتے اور یہودی مسلمانوں کو۔ بیعت عقبہ کے بعد جس کا دوسرا نام بیعت حرب بھی تھا، رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہودی قبیلوں (قینقاع، نضیر اور قریظہ) کو خطرہ لاحق ہوا کہ جب وہ رسول اللہؐ کو نبی ماننے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں گے تو رسول اللہؐ انھیں قریش کی طرح اپنا دشمن قرار دے کر موقع پاتے ہی اوس و خزرج کی مدد سے ان پر حملہ کر دیں گے، اس لئے انھوں نے رسول اللہؐ سے معاہدہ کر لیا کہ یہودی ان کے خلاف اور وہ یہودیوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کریں گے، نہ ایک دوسرے کے دشمنوں سے کسی جارحانہ کارروائی کے لئے سازباز کریں گے[1]۔ اپنے ہم مذہب کے قتل کے بعد یہودیوں نے مسلمانوں کو دھمکی دی تو رسول اللہؐ نے محسوس کیا کہ قینقاع کے اکابر کی نیت خراب ہے اور وہ کسی وقت شہر کے غیر مسلم، متذبذب اور نمائشی مسلمانوں کا سہارا لے کر یا قریش کی مدد سے ان پر حملہ کر سکتے ہیں، رسول اللہؐ نے یہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے بنو قینقاع کا استیصال ضروری خیال کیا، ان کی صوابدید کی توثیق بذریعۂ وحی ان الفاظ میں ہو گئی۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (انفال) اگر تمھیں کسی معاہد قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تم بھی عہد و پیمان توڑ دو۔ رسول اللہؐ نے قینقاع کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، قبیلہ کے سب لوگ اپنی گڑھیوں میں جہاں خطرہ کے وقت پناہ لی جاتی تھی، بغیر لڑے محصور ہو گئے، اس کے بعد بھی انھوں نے کوئی فوجی کارروائی نہیں کی، بنو قینقاع کا خزرج کے اکابر سے باہمی مدد کا معاہدہ تھا، با اثر خزرجی لیڈر اور نمائشی مسلمانوں کے سرگروہ عبداللہ بن اُبی بن سلول سے قینقاعی اکابر کے خوشگوار تعلقات تھے، اس نے مصالحت کی کوشش کی لیکن رسول اللہؐ اور انصار کا جوان، جوشیلا اور ابھرنے کا آرزومند طبقہ جو جنگ بدر میں رسول اللہ کے ساتھ لڑا تھا، مصالحت کے لئے تیار نہیں ہوا، دونوں کا مطالبہ تھا کہ بنو قینقاع غیر مشروط طور پر ہتیار

---

[1] مغازی ص۱۷۷

ڈالیں، ان کے بالغوں کو قتل کر دیا جائے، بال بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی منقولہ و غیر منقولہ دولت آپس میں بانٹ لی جائے۔ قینقاعی اکابر کو بھروسہ تھا کہ ان کے حلیف و ہمدرد غیر مسلم خاندان، نمائشی مسلمان نیز ان کے ہم مذہب نضیر و قریظہ ان کی مسلح مدد کریں گے لیکن ان میں سے کسی نے بھی جان اور ہتیاروں سے ان کی مدد نہیں کی، غیر مسلم اور نمائشی مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے مسلح مدد کی تو شہر کی مسلمان اکثریت ان کا قلع قمع کر دے گی، نضیر و قریظہ کو معاہدہ توڑ کر مسلح مدد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، دس بارہ دن تک جب قینقاع کی مدد کے لئے ان کا کوئی حلیف، ہمدرد اور ہم مذہب نہیں آیا تو ان پر مایوسی چھا گئی، انھوں نے رسول اللہؐ کو مطلع کیا کہ ہم گھر بار چھوڑ کر جانے کو تیار ہیں، ہمیں بلا تعرض جلا وطن ہونے کی ضمانت دی جائے۔ رسول اللہؐ نے کہلا بھیجا کہ بلا شرط ہتیار ڈالنے کے سوا تمھاری کوئی تجویز نہیں مانی جاسکتی۔ قینقاع کے حلیف اور بارسوخ خزرجی لیڈر عبداللہ بن اُبی نے قینقاعی اکابر کو بلا شرط ہتیار ڈالنے کا مشورہ دیا اور اطمینان دلایا کہ وہ محمدؐ کے ہاتھوں انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے، قینقاعی اکابر نے گڑھیوں کے دروازے کھولدئے، ان کے بالغ مردوں کو جو سات سو تھے، گرفتار کرکے ہاتھ کندھوں کے پیچھے باندھ دئے گئے، رسول اللہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، عبداللہ بن اُبیؔ نے رسول اللہؐ سے سفارش کی کہ قینقاع کے بالغوں کو چھوڑ دیں، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے، عبداللہ نے پیچھے سے ان کی زرہ بکتر کے کالر میں ہاتھ ڈال کر انھیں روکا اور کہا: محمدؐ میرے حلیفوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، رسول اللہؐ کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، انھوں نے مڑ کر کہا: چھوڑو مجھے، تمھارا برا ہو۔ عبداللہ: میں اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم میرے حلیفوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا وعدہ نہیں کر لوگے، یہ سات سو آدمی ہیں، تین سو زرہ پوش اور چار سو بغیر زرہ، انھوں نے حدایق اور بُعاث کی جنگوں میں ہر کالے گورے کے مقابلہ میں میری مدد کی تھی، تم بیک وقت ان سب کی گردن اڑانا چاہتے ہو، محمدؐ اس کا انجام برا ہوگا[1]۔ رسول اللہؐ: چھوڑ دو قیدیوں کو اُن پر اور اِس پر

---

[1] انساب الاشراف ۱/ ۳۰۹، مغازی ص ۱۸۱

خدا کی لعنت۔ جلا وطن ہونے کے لئے رسول اللہ نے قینقاع کو تین دن کی مہلت دی، شہر کے لوگوں کے پاس ان کے قرضے تھے جن کی وصولی کے لئے قینقاعی اکابر نے مہلت میں توسیع چاہی جو منظور نہیں کی گئی۔ تین دن کی مقررہ میعاد ختم ہونے پر انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔ رسول اللہ نے انھیں اپنے ہتیار، زر و سیم اور بیشتر سامان لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس دولت کا خمس لے کر مابقی رسول اللہ نے محاصرہ کرنے والوں میں تقسیم کر دیا، مال و دولت کی تقسیم سے پہلے انھوں نے سہم صفی کے نام سے .... چیزیں اپنے لئے منتخب کیں۔ تین کمانیں، دو زرہیں، تین تلواریں اور تین نیزے[1]۔ بنو قینقاع کا قافلہ مدینہ سے چل کر ستراسی میل شمال مغرب میں وادی القریٰ کی یہودی بستی میں اترا، مقامی یہودیوں نے چندہ کر کے ان کے ضرورتمندوں کے لئے سواری اور زاد راہ کا انتظام کیا، کچھ دن ٹھہرنے کے بعد بنو قینقاع اپنے آبائی وطن شام چلے گئے۔

(باقی)

---

[1] مغازی صفحہ ۲۸

ڈراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت

اور

صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقاء

(۱)

از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہاپوری

ہند قدیم نے تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور صنعت و تجارت میں جو تدریجی ارتقاحاصل کیا اس کو متعدد ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ابتدائی اور بنیادی دور، ڈراوڑی دور کے نام سے موسوم ہے۔ مغربی مورخین کی اکثریت نے دنیا کو یہ باور کرانے میں پورا زورِ قلم صرف کر دیا کہ ایرین سے پہلے یہاں کی فضا میں جہل و بربریت کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف صحرائیت و بدویت کے آثار نمایاں تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی کی کھدائیوں نے ان کے سوچے سمجھے مقصد کی تکذیب کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ایرین سے پہلے ڈراوڑ نام کی ایک متمدن قوم یہاں آباد تھی جس کا معیاری تمدن ایرین تمدن سے بھی بعض صورتوں میں ارفع اور اعلیٰ تھا اسی بنا پر بعد کی ہمہ گیر ترقیوں کا سلسلہ انہی خطوط پر قائم ہوا جن کی بنیاد، تمدن دوست ڈراوڑوں نے ڈالی تھی، یا یوں سمجھئے کہ ان کا ذوق صنعت و تجارت اور رجحاناتِ تہذیب و ثقافت آنے والوں کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

قدیم ڈراوڑوں یا اہل تامل کے تہذیب و تمدن اور علوم، فنون سے دلچسپی کے جو تھوڑے بہت حالات، ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق و تلاش کے علاوہ یونانی و رومی مورخین کے اشارات و حوالہ جات

اور خصوصاً جنوبی ہند کی بعض دستیاب شدہ کتابوں سے ہم تک پہونچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑ قوم ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کی مالک تھی، ان کے تاجر سمیریہ، بابل اور مصر وغیرہ سے تجارت کرتے تھے اور اُن کے شہر و قصبات بارونق اور خوب صورت تھے[1]، مصنفؔ "تاریخ گجرات" پروفیسر مولانا سید ابوظفر ندوی کے الفاظ میں "یہ مہذب قوم جس نے ایرین کی آمد سے بہت قبل گجرات، سوراشٹرا اور ملک کے دوسرے ساحلی مقامات کی بندرگاہوں سے اپنا تجارتی سلسلہ دور دور تک پھیلا رکھا تھا اگرچہ ہر لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم تھی لیکن ایرین کی سماجی ناانصافیوں کے دباؤ کی وجہ سے یہ خود اپنے کو ذلیل و خوار سمجھنے لگی تھی۔" ڈاکٹر لوبلر کی تحقیق کے بموجب جس وقت ہندی علاقوں کے موتی، مرجان اور گرم مسالے وغیرہ اقطاعِ عالم کے تاجروں کو ہند آنے کی دعوت دے رہے تھے اس وقت یہ قوم تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہونچی ہوئی تھی، اس کے یہاں علمی، فنی اور ادبی تصانیف کا گراں بہا ذخیرہ موجود تھا اور بقول موصوف اگر آج وہ کتابیں موجود ہوتیں تو ظن و تخمین کے بجائے اُس قوم کے تمدن کا پتہ اُسی آسانی سے لگایا جاسکتا تھا جیسے رگ وید کے مطالعہ سے ایرین تمدن کا حال معلوم کیا گیا ہے، چونکہ قدیم تامل زبان معدوم ہوچکی تھی اس لئے اس زبان کی کتابوں کا معدوم ہوجانا بھی ایک فطری امر تھا لیکن آج اس تمدن کے مدفون خزانے زمین اگل رہی ہے جن سے اُس برباد شدہ تمدن کے صحیح خدو خال نظروں کے سامنے آجانے کی پختہ امید کی جاسکتی ہے۔ دراوڑوں کی آبادیاں وادیٔ سندھ سے لے کر ہند کے تقریباً سب ہی حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں جو متفق علیہ طور پر ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی مالک تھیں اُن کے تمدنی آثار، اور تہذیبی نشانیاں ایرین کی آمد کے کافی عرصہ بعد تک موجود رہیں لیکن دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ایرین نے بھی اُن کی تہذیبی عمارت منہدم کرکے ایک نئی تہذیبی عمارت کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں پیشرو کے تمام تہذیبی آثار نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ دنیا کو یقین آگیا کہ ایرین سے پہلے یہاں تمدن آشنا اور تہذیب دوست قوم آباد ہی نہ تھی

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

اس مغالطہ دہی میں مغربی ممالک خصوصاً برطانوی دور کی درسیہ تاریخوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک پوری دنیا مذکورہ مغالطہ پر قائم رہی حتی کہ یہ مغالطہ ایک حقیقت سا بن گیا۔ خدا بھلا کرے ماہرین آثار قدیمہ کا جنھوں نے کھدائیوں کے نتائج سے اس طلسم باطل کا پردہ چاک کرکے حقیقت کی رونمائی کی لیکن برطانوی دور کی تاریخوں کا پھیلایا ہوا زہر ذہن وشعور کو اتنا ماؤف کر چکا تھا کہ ابتدائً ان انکشافات ونتائج سے بھی صرف نظر کیا گیا مگر کھدائیوں کا تسلسل اور ان سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار، ان زہریلے اثرات کو زائل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور آخر میں ان منکرین کو بھی اصل حقیقت واصلیت کا اقرار واعتراف کرنا پڑا۔

اس قدیم تہذیب کی دریافت کا اولیں سہرا سرجان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ اور ان کے متعدد ملکی اور غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی ان تھک کوششوں کے سر ہے جن میں سرالگزنڈر کنگھم، ایچ ایس، والس، کے این ڈکشٹ، دیارام ساہنی اور مذمدار کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ڈراوڑی تہذیب وتمدن کی بیش بہا دولت ہنوز زیر زمین مدفون ہے، کھدائیوں کی تکمیل اور مدفون آثار برآمد ہونے کے بعد ہی کوئی جچا تلا فیصلہ منظر عام پر آسکتا ہے، بہرحال کھدائیاں مکمل ہوں یا نامکمل لیکن اس حقیقت سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ آریین کی آمد سے صدیوں پہلے فضائے ہند پر ڈراوڑی تہذیب وتمدن کا مہر منور پوری تابناکی سے روشن ہو چکا تھا بلکہ اس نے ایک نوع کی ارتقائی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔

ہند کے یہ قدیم ترین باشندے یعنی دراوڑ کون تھے، کہاں سے آئے، کب آئے، کس نسل وقبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ ان سوالوں کے جواب ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں، صرف اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آریین سے ان کا کوئی سابقہ قبائلی رشتہ اور تعلق نہ تھا، ان کی قدیم تاریخ کا صحت مندانہ حال معلوم کرنا اسی قدر مشکل ہے جس قدر خود ہند کی تاریخ کا پتہ چلانا۔ لیکن انسان کی تلاش وجستجو، فکر وطلب اور چھان بین کا تسلسل بہت سے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی کر چکا ہے بنابریں اس میں بھی اس نے بہت کچھ ایسی معلومات حاصل کرلیں جو ظن وتخمین

کے تنگ دائرہ سے نکل کر یقین و اذعان کی وسیع حدود میں آچکی ہیں بقول مصنف تاریخ گجرات مولانا سید ابوظفر ندوی پتھر اور لوہے کے زمانہ کے بعد اس ملک کی غالب اکثریت ڈراویڈ کی تھی۔ مصنف مذکور نے غالب اکثریت کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ موصوف کے نزدیک ڈراوڑ کے علاوہ اس ملک کے صحرائی اور پہاڑی خطوں میں اور بھی متعدد قومیں اقلیتی صورت میں موجود تھیں جن میں بھیل، گونڈ وا ور سنتھال نام کی اقلیتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی جو ڈراوڑوں کے مقابلہ میں ہر نہج سے پس ماندہ، تہذیب و تمدن سے ناآشنا، علوم وفنون سے بے بہرہ تھیں لیکن اکثر مورخین کے نزدیک یہ سب قبائلی سلسلے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے یعنی نسلاً یہ سب ڈراوڑ ہی تھے لیکن اپنی معاشرتی پس ماندگی کی بنا پر دسوں طبقوں میں منقسم ہو گئے تھے، چونکہ یہ زیادہ تر دشت وجبل میں بود و باش رکھتے تھے، زیور تعلیم سے عاری اور عقل وشعور میں کم مایہ اور خستہ حالی میں اپنی نظیر آپ تھے اس لئے ساحلی اور شاداب میدانی خطوں میں رہنے والے باشعور ڈراوڑوں نے خود ہی اپنے نسل وقبیلہ کے لاکھوں افراد کو از راہ تحقیر مذکورہ ناموں سے پکارنا شروع کر دیا تھا اور بعض کے خیال میں ان کی بدویت اور پس ماندگی کی بنا پر زمانۂ مابعد میں یہ نام رکھے گئے، مذکورہ برتری اور پس ماندگی کے فرق کو آج کے آئینہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، اول الذکر زیور تعلیم سے آراستگی کے باعث بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور موخر الذکر ہنوز پس ماندگی اور جہالت وغربت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس صحرائیت اور جہالت کی منہ بولتی تصویر مدھیہ پردیش اور بندھیاچل کے پہاڑی دامن میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈراوڑوں کی صحیح تاریخ کا علم تو دور کی بات رہی، یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اُس عہد میں یہ حسن بدامان ملک کس نام سے موسوم تھا، تاریخ کی زبان بھی اس سلسلے میں ساکت وخاموش ہے اور نہ کھدائیوں نے اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی کی ہاں کچھ صوبہ جاتی اور علاقائی ناموں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایرین ڈراوڑوں کی بود و باش کی جگہوں کو از راہ تمسخر "ارنی" کہتے تھے جس کے معنی جنگل اور صحرا کے ہیں چونکہ یہ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے میدانی اور مرغزاری علاقوں کو چھوڑ کر غیر آباد کوہستانی علاقوں

میں جابسے تھے اس لیے ایرین نے معنویت کے لحاظ سے ان کے علاقوں کا یہ نام رکھ چھوڑا تھا۔[1] چنانچہ آج بھی بعض ریاستوں کے سررشتہ مال کے کچھ کاغذات سے اس کی تصدیق ہوتی یعنی صحرائی اور غیر زرخیز زمینوں کو "ادی محال" کہا جاتا ہے۔ ایرین کی اس علاقائی تقسیم سے اس ملک کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایرین نے اپنے مفتوحہ علاقہ کا کیا نام دے رکھا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں جو سیر حاصل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"عربوں کی آمد سے قبل اس پورے ملک کا کوئی نام نہ تھا بلکہ ہر صوبہ کا نام الگ تھا اور بیرون ملک ہر ریاست کا نام اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا، اہل فارس نے جب سندھ پر قبضہ کیا تو دریائے سندھ کی موجودگی کی وجہ سے اس صوبہ کا نام سندھو رکھا۔ موصوف کے نزدیک سندھو کے بجائے ہندھو نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قدیم فارسی اور سنسکرت میں حرف س اور ہ کو آپس میں بدل لیتے ہیں اس لئے انھوں نے اس کو ہندھو کہہ کر پکارا، لیکن عربوں نے دریائے سندھ کی مناسبت سے اس صوبہ کو سندھ ہی کہا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا اور آخر میں یہی نام پورے ملک کیلئے تمام دنیا میں مختلف صورتوں سے پھیل گیا اور ہ کا حرف الف ہوکر فرنچ میں انڈا، اور اس کی مختلف صورتیں ہوکر تمام دنیا میں مشہور ہوگیا اور خیبر سے آنے والی قوموں نے ہندواستھان نام سے اس کو پکارا جو فارسی تلفظ میں ہندوستان ہوگیا۔"[2]

تیج بہادر سنہا ایڈیٹر روہیلکھنڈ اخبار نے بھی جو کچھ سپرد قلم کیا ہے اس سے بھی مذکورہ سطور کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ ایڈیٹر موصوف لکھتے ہیں کہ

"اس ملک کو یہ نام عربوں ہی کا دیا ہوا ہے اگر وہ اس ملک میں نہ آئے ہوتے تو یہ ملک

---

[1] تاریخ گجرات از مولانا ابوظفر ندوی

[2] عرب و ہند کے تعلقات

ہندوستان کے بجائے جنوبی ایشیا یا ایسے ہی کسی نام سے پکارا جاتا اور اس میں بے شمار
خودمختار اور آزاد ریاستیں ہوتیں۔"

تاریخی حیثیت کے ساتھ ڈراوڑوں کی اصلیت اور وطنیت کے بارے میں بھی علمائے تحقیق متفق الرائے نہیں، کچھ محققین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں پائے جانے والے دروں سے یہاں آئے اور بعد کو جنوبی ہند پہونچے اس خیال وفکر کے سب سے بڑے مویّد ڈاکٹر ہنٹر ہیں بعض کے نزدیک یہ ہندوستان ہی کے اصل اور قدیم ترین باشندے ہیں اور جنوبی ہند ان کا اصل اور بنیادی وطن ہے اور یہیں سے سندھ ویلی، بلوچستان اور شمالی ہند میں پھیلے، دلیل یہ ہے کہ ڈراوڑ یا ڈراوڈ جنوبی ہند کے تامل علاقہ کا قدیم نام ہے جہاں کے رہنے والے تامل تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانیں بولتے ہیں۔ ایک اور نظریہ کے مطابق ان کی اصل آبادیاں خصوصی طور پر وادی سندھ، پنجاب اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک مخصوص تہذیب کی مالک تھیں لیکن ایرین فتوحات کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے تحفظ کی خاطر مذکورہ علاقوں سے نقل مکانی کرکے جنوبی ہند کے تمام علاقہ کو اپنا مسکن بنالیا اور اس جگہ چیرا، چولا اور پانڈیہ نام کی تین طاقتور حکومتیں بھی قائم کرلیں، یہ تجارتی میدان میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ روم، مصر اور مشرق وسطیٰ کے علاقوں سے ان کا تجارتی رابطہ بھی قائم ہوگیا تھا اور اس رابطہ کو مستحکم بنانے کے لئے انھوں نے ایک مضبوط تجارتی بیڑہ بھی تیار کرلیا تھا۔ اشوک کے زمانہ تک ان حکومتوں کا وجود ملتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ نہ جنوبی ہند سے سندھ ویلی اور بلوچستان وغیرہ پہونچے اور نہ شمال مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے بلکہ یہ ایک ہی قوم ونسل تھی جو ہند کے دوسرے میدانی، کوہستانی اور ساحلی مقامات کی طرح سندھ ویلی، بلوچستان، پنجاب اور کاٹھیاواڑ میں قدیم سے آباد تھی، چونکہ ہر حصہ کے باشندوں کے مذہبی تصورات اور طرز معاشرت وغیرہ میں یکسانیت اور ہم آہنگی کارفرما تھی اس لئے مجموعی طور پر اس قوم کا نام ڈراوڑ رکھدیا گیا اس نظریہ اور خیال کے بہت سے علمائے تحقیق مویّد نظر آتے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی حالیہ علاقائی

کھدائیوں سے مختلف قسم کے انسانی ڈھانچوں کی دستیابی نے علمائے تحقیق کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اس سلسلہ میں انھوں نے جو اندازے قائم کئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف جنوبی ہند کے بسنے والے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے ڈراوڑ، رومی اور آسٹریلین نسلوں کا مرکب ہیں کیونکہ دستیاب شدہ ڈھانچے علامات کے اعتبار سے بحر روم کے علاقائی خطوں کے باشندوں سے ملتے جلتے ہیں اور بعض آسٹریلین نسل کے باشندوں کی علامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کچھ اہل فکر و نظر نے اس سے ملتا جلتا مگر زیادہ صاف اور واضح نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بحر روم کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی نسل نے آسٹریلوی نسل پر حاکمانہ قبضہ و اقتدار حاصل کر لیا بعد کو یہ نسل جو اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی لائی تھی پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور آخر میں ان دونوں نسلوں کے باہمی اختلاط سے جو نسل عالم وجود میں آئی وہ ڈراوڑ نسل کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی[1]، اس نظریہ کے ساتھ دستیاب شدہ ڈھانچوں سے بعض مفکرین کا یہ فیصلہ بھی نظر کے سامنے آجاتا ہے کہ ہڑپا، موہنجوڈارو، ڈراڈا اور جھٹ پٹ کے وسیع علاقوں کے رہنے والے آسٹریلین نسل سے اور وادیٔ سندھ کے باشندے بحر رومی علاقوں کے باشندوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان تمام ظنی تفصیلات اور تخمینی کاوشوں کے مقابلہ میں اکثریت کا یہ فیصلہ زیادہ صحت مندانہ اور قرین عقل ہے کہ ڈراوڑ ہند کے اصل باشندے ہیں اور جنوبی ہند کا علاقہ ان کا بنیادی وطن ہے اور یہیں سے ہند کے تمام علاقوں میں پھیل کر انھوں نے تہذیب و تمدن اور صنعت و تجارت کے تمام ارتقائی منازل طے کئے اور ڈاکٹر ہنٹر کا یہ نظریہ کہ ڈراوڑ تورانی النسل ہیں اور آرین سے ہزاروں سال پہلے وہ شمالی مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے قطعاً غلط تصورات پر مبنی ہے اور اسی کے ساتھ اس نظریہ کا بھی بطلان ہو جاتا ہے کہ قدیم آسٹریلین اور بحر رومی علاقوں کی سندھ ویلی میں آباد نسل کے باہمی اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی۔

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

ڈراوڑی تہذیب وتمدن کی قدامت اور تقابل | تہذیب وتمدن کی خشت اول اسی وقت رکھی گئی تھی جب انسان نے اس عالم رنگ وبو میں قدم رکھا اور زندگی گزارنے کے مختلف اقدامات کئے جوں جوں انسانی شعور آگے بڑھتا گیا تہذیبی پودے کی نشوونما میں تیزی آتی گئی۔

جدید حجریاتی دور کی تدریجی ترقی میں ہر ملک نے یکساں پیش رفت نہیں کی، کوئی ملک ذہنی شعور میں آگے بڑھ گیا اور کوئی پس ماندہ رہ گیا۔ مصر و بابل، چین وایران اور یونان وروما میں سے ہر ایک اولیت کا مدعی ہے لیکن اہل ہند کا اصرار ہے کہ عقل وشعور کی دنیا میں ان کے قدم سب سے آگے ہیں یعنی تہذیب وتمدن کا مہر منور سب سے پہلے مطلع ہند پر نمودار ہوا۔ تہذیب کشمکش حیات میں ایک مستقل جدوجہد کا نام بھی ہے جس طرح زندگی بڑھاپے سے نبرد آزمائی کے لئے اپنے میں خاص توانائی وتازگی بہم پہونچانے کی کوشش کرتی ہے اسی طرح تہذیب کو بھی اپنے بقاواستحکام کے لئے نئے خون اور نئے مکان کی ضرورت پیش آتی ہے اگر وہ ایک جگہ سے مٹتی ہے تو دوسری جگہ ابھرتی ہے، اگر حوادث ایک جگہ سے اس کو ظلمت وتاریکی کے گھرے بادلوں میں چھپادیتے ہیں تو دوسری جگہ وہ اپنا حسین ودلکش چہرہ بے نقاب کردیتی ہے، غرض اس کے ابھرنے اور مٹنے کا چکر دنیا کی گردش کے ساتھ قائم رہا ہے، یہ آغوش محبت میں پرورش پاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے، دشمنی اور عناد کی گود میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اس کا نظر نواز چہرہ جب گرد کدورت سے متغیر ہوجاتا ہے تو یہ خوش آمدید کہنے والی آغوش کی زینت بن جاتی ہے، جب اہل مصر کی نااہلیت اس کی طبع نازک پر گراں گزری تو یہ اہل بابل کی زینت آغوش بنی، جب یہاں قدر ناشناسی کا اظہار ہوا تو یہ کبیدہ خاطر ہوکر آشوریوں کی محبت بھری آغوش میں جابیٹھی، انھوں نے جب تک اس کی نازبرداری کی تو اس نے ارض آشوریہ کو اپنی سدابہار رنگینیوں سے کف گل فروش اور دامن باغباں بنادیا۔ اسی طرح یہ دنیا کے ہر ملک میں پہونچی اور قدر دانی کے وقت تک موجود رہی اور ناقدری کا شکار ہوتے دیکھ کر اس نے اپنا روشن اور مسکراتا ہوا چہرہ چھپالیا۔ غرض یہ عروس ہزار عشوہ بڑی تنگ مزاج واقع ہوئی ہے، اس کی تنگ مزاجی کے

ناز و غمزے جس نے خندہ پیشانی سے اٹھالئے اس سے وفاداری کا تعلق اس نے کبھی نہ توڑا اور جس جانب سے ناقدری کا ذرا سا بھی اشارہ پایا اس طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دراوڑوں نے اس سے جو رشتۂ الفت جوڑا تھا اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہوتا گیا۔ ایرین نے اس تنک مزاج ہزار عشوہ کو محبوبیت کے سارے انداز بخشے جس سے اس کے رخِ زیبا میں ہزاروں اندازِ دل ربائی پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ یہ اسی قدر شناسی اور محبت کا نتیجہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے اثراتِ بد سے تہذیب ہندی کی عمارت نہ صرف محفوظ و مصئون رہی بلکہ ہر دور میں اس عمارت کے نقش و نگار اور آراستگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

دراوڑی تہذیب و تمدن کے آغاز کا زمانہ آثار تہذیبی کے مبصرین نے تین ہزار سے پانچ ہزار قبل مسیح تک لگایا ہے، چونکہ دراوڑوں نے جدید حجری دور کے ختم ہی سے اس طرف عنانِ توجہ منعطف کر دی تھی اس لئے ہند میں تہذیب و تمدن کا آغاز چھ ہزار قبل مسیح متعین کیا گیا ہے غالباً انہی شواہد کی بنا پر پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم نے ۱۹۶۱ء کے ایک شائع شدہ مضمون میں ہندی تہذیب کا بنیادی دور چھ ہزار قبل مسیح قرار دیا ہے، پروفیسر موصوف کی اس رائے کو دیگر اہل الرائے نے بھی جس میں سابق صدر جمہوریہ راجندر پرشاد آنجہانی بھی شامل ہیں حقیقت سے تعبیر کیا ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ جس وقت مصر کے شہنشاہ زوسر نے سب سے پہلے اہرام اور شہنشاہ خوفو نے جزہ میں بڑے اہرام کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت یہاں تہذیبی پیش روی نقطۂ عروج پر تھی اور صنعتی و تجارتی ترقی شباب پر تھی[1]۔

علمی اور ثقافتی پیش رفت

ثقافت بنیادی طور پر ایک ذہنی صفت ہے اور اسی کے ساتھ معاشرت و تہذیب سے بشری فکر کا جو ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اسے بھی ثقافت کا نام دیا جا سکتا ہے، تہذیب و معاشرت کا مرکز مادی اشیا سے اور ثقافت کا مرکز ذہن و دماغ کی

---

[1] عہد قدیم شرق و مغرب

فکری قوتوں سے ہے اور ان فکری قوتوں کے بطون سے شاعری، مصوری، نقاشی، ادب وتنقید، تلاش وتحقیق، سائنس وفلسفہ اور موسیقی وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔ ثقافت قوم کی تہذیبی اور نظریاتی بنیادوں کی مکمل عکاس ہوتی ہے حقیقت میں ثقافت ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں قوم کی اخلاقی کیفیت کا صحیح عکس نمایاں ہوتا ہے ثقافت کی تنظیم اگرچہ خود ریاست کی مقررہ حکمت عملی کے تحت ہوتی ہے لیکن اخلاقی اقدار کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اخلاقی اقدار کا فقدان کسی نظام حیات کو برباد کر سکتا ہے تو ثقافت کو بھی تباہی میں ڈال سکتا ہے کیونکہ قوم کے اخلاقی بگاڑ سے سب سے پہلے اس کی ثقافتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

ڈراوڑوں کی ثقافتی اور علمی پیش رفت کا پتہ کھدائیوں کے نتائج، ظن وتخمین، زمانہ مابعد کے نوشتہ جات، قدیم یونانی ورومی اور عرب محققین کی تحقیق وتلاش کے علاوہ ڈراوڑوں کی قدیم ترین علمی تصانیف کی دستیابی سے بھی لگایا گیا ہے۔ بدیہی قرائن سے رسم الخط کی موجودگی کے ساتھ ان کی عام تحریری واقفیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ قرائن ان مہروں کی دستیابی سے یقین و اذعان سے بدل جاتے ہیں جو ڈراوڑ برآمد ہونے والے کپڑوں پر اپنے ناموں کے بجائے لگایا کرتے تھے لیکن رسم الخط کی نوعیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا[1]۔ اس وقت کے ترقی یافتہ تہذیبی ملکوں میں دو قسم کے رسم الخط جاری تھے، تصاویری اور علامتی، اس لئے قیاس کہتا ہے کہ انہی دو میں سے کوئی ایک ہوگا، حروف تہجی پر مبنی رسم الخط کے بانی یا موجد فینیقی عرب کہے جاتے ہیں جو فلسطین اور شام ولبنان کے سواحل پر آباد تھے اور اپنی بحری تجارت کے اعتبار سے ایک طرف وہ افریشیائی علاقوں پر اثر انداز ہوتے تھے اور دوسری طرف ان کا تہذیبی رنگ یونان تک پھیلا ہوا تھا، بدیں وجہ اہل قیاس کے نزدیک ڈراوڑی رسم الخط بھی ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ ان کے حروف تہجی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے حروف

---

[1] عہد قدیم شرق ومغرب

تہجی کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی اس لئے آر ڈی بنرجی اور سرجان مارشل کے متفقہ قیاس کے بموجب بابلیوں کے حروف تہجی کی طرح ڈراوڑی حروف تہجی کی تعداد بھی ڈھائی سو سے کم نہ تھی بابلیوں کا خط میخی بھی اسی تعداد کے ساتھ حمورابی کے زمانہ تک جاری رہا۔ اس سے ان دونوں ماہرینِ آثار قدیمہ نے یہ رائے قائم کی ہے جو بڑی حد تک قرین عقل ہے۔ وادیٔ سندھ، گجرات، جنوبی ہند اور بنگال کی حالیہ کھدائیوں سے جو مہریں دستیاب ہوئی ہیں ان سے علامتی اور ابجدی دونوں رسم الخطوں کی نشاندہی ہوتی ہے اس سے بعض اہل قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ ابتدا میں علامتی رسم الخط مروج ہوگا اور بعد کو ابجدی سلسلہ شروع ہوا۔ فادر ایچ ایس ہیراس نے مختلف حصوں سے دستیاب شدہ مہروں کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ ڈراوڑی رسم الخط ابتدا ہی سے حروف تہجی پر مبنی تھا اور ان کی زبان موجودہ تامل زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ڈاکٹر بوہلر نے بڑی تحقیق کے بعد جو مبصرانہ رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "آرین کی آمد سے تین سو سال قبل تک ڈراوڑوں کی اصل زبان پھوٹ کر تامل، تلیگو، کنڑا اور ملیالم وغیرہ میں منقسم نہیں ہوئی تھی بلکہ سارے جنوبی ہند میں اس وقت صرف ایک ڈراوڑی زبان بولی جاتی تھی جسے ہم سہولت کی خاطر تامل کہہ سکتے ہیں۔"

بعض مبصرین کے نزدیک ڈراوڑوں کی اصل زبانیں جغرافیائی حد بندیوں کے فرق کے ساتھ یہی تھیں جو آج ترقی یافتہ شکل میں جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں لیکن مبصرین کی اکثریت ڈاکٹر بوہلر کے ہم خیال و ہم رائے ہے۔ چنانچہ فادر ایچ۔ ایس ہیراس نے ہڑپا کی مہروں کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہڑپا کے وسیع علاقہ اور سندھ ویلی کی عام زبان صرف تامل تھی، ساتھ ہی موصوف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ سنسکرت میں ڈراوڑی زبان کے متعدد حروف کی آوازیں شامل ہیں چنانچہ زمانہ مابعد کے علمائے تحقیق نے ٹ، ڈ اور ڑ کی آوازوں کو متعین و مشخص بھی کر دیا ہے کہ یہ اصلاً ڈراویڑی آوازیں ہیں۔ اس تمام تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ فینقیوں کی مسلسل آمد و شد سے بہت پہلے ڈراوڑ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو چکے تھے اگرچہ تمام دستیاب شدہ اشیاء میں کسی

تصنیف کے دستیاب ہونے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن مختلف علمائے تحقیق کی جو کاوشیں نظروں کے سامنے آئی ہیں ان کو ترتیب دینے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ فطرت کی صحیح بخشی کی بنا پر تصنیف کا آغاز اسی سرزمینِ علم و حکمت میں ہوا یعنی دنیا کی پہلی کتاب ارضِ ہند میں عالم تصنیف میں آئی چنانچہ مولانا غلام آزاد بلگرامی نے مشہور تصنیف "غزلان ہند" میں شیخ علی رومی کی تصنیف "محاضر الاوائل ومسائر الاواخر" سے یہ فقرہ نقل کیا ہے[1]:

"اول موضع وضعت فیہ الکتب وانفجرت منہ ینابیع الحکمۃ کان الھند۔"

یعنی سب سے پہلے جس سرزمین پر کتاب لکھی گئی اور جہاں سے علم و حکمت کا چشمہ پھوٹا وہ ہندوستان ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں علمی اور ایجادی اولیت کے بیان میں تصنیفی اولیت کا سہرا اہلِ ہند کے سر باندھا ہے۔ تاریخی اوراق میں حضرت علی سے بھی منسوب ایک ایسا فقرہ ملتا ہے جس میں ہند کو اولیں تصنیف کا گھر کہا گیا ہے۔ عرب کے مشہور متکلم اور مشہور فلاسفر ابن جاحظ نے اپنے مرتبہ رسالہ "ساکنانِ عالم کے ذہن و دماغ کی کیفیات" میں دلائل عقلیہ کی روشنی میں ذہن ہندی کی ایجادی اور تخلیقی قوتوں کو ترجیح ثابت کیا ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں پہلی تصنیف کا دعوی ایرین نہیں کر سکتے کیونکہ ایرین اپنے وسطی دور کے بعد ہی فن تحریر سے واقف ہو کر اپنے کاروباری کھاتے لکھنے کے قابل ہو سکے تھے[2]۔ ایرین اور یونانی تہذیب کا نقطۂ آغاز وعروج ایک ہی ہے اور ان دونوں تہذیبوں سے پہلے دجلہ وفرات کی شاداب وادی میں بابل نام کی ایک تمدن آشنا حکومت قائم تھی جس کے ایک مشہور حکمراں حمورابی کا دو سو پچاسی دفعات پر مشتمل ایک دستوری اور قانونی مسودہ تصنیفی سلسلہ کی موجودگی

---

[1] بحوالہ مقالات شبلی

[2] عہد قدیم شرق و مغرب

ظاہر کرتا ہے اور اس سے بھی قبل پادری مان تھیو "MANTHEW" کی تصنیف اور قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان سے سرزمین فراعنہ میں متعدد علوم دفنون پر تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ان تمام شواہد سے اہل فکر نے اندازہ لگایا ہے کہ ایرین دور سے بہت پہلے دنیا کے مختلف متمدن ممالک میں تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہو چکا تھا اس کے باوصف ان تمدن آشنا ممالک کی کسی تصنیف کو اہل تحقیق نے دنیا کی اولین تصنیف میں شمار نہیں کیا اس سے بدیہی طور پر یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کی پہلی کتاب ڈراوڑی عہد میں تصنیف ہوئی لیکن اس کے موضوعِ فکر کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈراوڑوں کے علمی ذوق کا صحیح اندازہ جنوبی ہند کی مختلف ریاستوں کی علمی پیش رفت اور فنی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے ڈراوڑ جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں جمع ہو گئے تھے جہاں انھوں نے ایک زبردست شہنشاہیت کے بجائے متعدد حکومتیں قائم کر لی تھیں جن میں چولا، چیرا، پانڈیا، کرالا، کرناٹک اور کنٹالا ریار زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ ایرین کی حکمت عملی کی بنا پر یہ باہم دست و گریباں رہ کر اپنی تمام قوتیں برباد کرتی رہیں لیکن اس انتشار کے باوصف ان میں سے ہر ایک نے علوم وفنون کی پیش روی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیا۔ پانڈیہ ریاست کا دارالحکومت علم و ہنر کا مرکز تھا یہاں مختلف ادوار میں زبان و ادب اور دیگر علوم دفنون کی پیش روی کیلئے علماء و مصنفین کے تین علمی مرکز قائم تھے خصوصاً مدورا کے علمی مرکز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اس عظیم الشان علمی ادارہ کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اور اس کی سفارش پر مصنفین کو شاہی خزانہ سے انعام واکرام سے نوازا بھی جاتا تھا۔ شعر وسخن کے سلسلہ میں بھی ڈراوڑوں کا پایہ بہت بلند کہا گیا ہے اور اس میں زبان و ادب کی پوری چاشنی اور اندازِ بیان کی پوری کشش بیان کی گئی ہے۔ تامل زبان کی عروضی بحور سنسکرت بحور سے بالکل مختلف تھے ان کی اثریت کے مقابلہ میں سنسکرت کے عروضی بحور کو بے اثر کہا گیا ہے۔ چنانچہ اہاول وِنبا، کَلِپا اور ونجپا نام کی بحور کو تامل زبان کی ایسی نشانیاں کہا جاتا ہے جن کی مثال سنسکرت زبان میں نہیں ملتی۔

رزمیہ نظموں کے لحاظ سے بھی قدیم تامل ادبیات کو مالا مال کہا گیا ہے چنانچہ پانچ رزمیہ نظموں

کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی تھی جن میں سلپا تھیکارم اور منی میکلائی کو اثریت اور تخاطب کے لحاظ سے راماین اور مہابھارت کے ہم پلہ بتایا گیا ہے۔ اول الذکر میں مختلف ذاتوں اور پیشہ وروں کی ایک صحیح تصویر الفاظ کے ذریعہ کھینچی گئی تھی۔ اس تصویر کشی کے علاوہ اس خصوصیت نے اس کو قدیم ہندوستانی ادبیات میں ایک گونہ ممتاز بنا دیا تھا کہ یہ حزنیہ جذبات وعناصر سے معمور تھی، اس کے ہر فقرہ کو درد و اضطراب کی منہ بولتی تصویر کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے یونانی ٹریجیڈی کی اثریت کی طرح دل و دماغ پر ایک کرب آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رزمیہ نظموں کے پہلو بہ پہلو بزمیہ نظموں کی بھی قدیم تامل زبان میں کوئی کمی نہیں بتائی جاتی اس سلسلہ میں بہت سی کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں جن میں پورا نالوزرو، کلتھوکائی اور پاتھوپتو وغیرہ نامی تصانیف کو بزمیہ شاعری کی جان کہا گیا ہے۔ نظمیہ تاریخی تخلیقات کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں قدیم ترین تامل فرماں رواؤں کے کارناموں کے ساتھ ملکی تہذیب و معاشرت، رسوم و رواج کی بھی مکمل عکاسی بتائی گئی ہے، ان میں دو کتابوں نالابار اور کورلکا ذکر قدیم تذکروں میں پایا جاتا ہے، نالابار کو ایسی بے نظیر ذہنی تخلیق بتایا گیا ہے کہ سنسکرت زبان کے مفکر شعرا بھی اس کے طائر تخیل کی پرواز اور جذباتِ لطیفہ کی گہرائی تک نہ پہونچ سکے، اسی بنا پر تامل زبان کی قدیم شعری ادبیات میں اس کو چوٹی کی تخلیق کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہ نظم تین حصوں پر مشتمل بتائی جاتی ہے۔ حصہ اول نیکی، دوسرا دولت، تیسرا سچی مسرت۔ قدیم مبصرین کے نزدیک الفاظ کی شیرینی، طرز ادا کی دل آویزی، فکر و تخیل کی رفعت اور جذبات کی لطافت نے مل کر شاعر کے کلام میں تاثر کی ایک ایسی روح پھونکدی تھی کہ قاری و سامع کے دل و دماغ پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک یہ خوبی بھی اس تخلیق کی بتائی جاتی ہے کہ شاعر کا مستانہ تخاطب قوم و فرقہ اور رنگ و نسل سے ہٹ کر تمام نوع بشری کے لیے تھا۔

علم ہیئت و نجوم اور جوتش کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے بانی اور موجد ایرین ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایرین اثر قبول کرنے سے پیشتر ہی ڈراوڑوں نے عملی ہیئت مرتب

کر لی تھی، ڈاکٹر میک لین کے خیال کے مطابق جنوبی ہند کے دراوڑ ماہی گیروں نے چاند کے بڑھنے گھٹنے کا مشاہدہ کر کے وقت کی تقسیم کا قمری حساب مرتب کر لیا تھا اور میدانی علاقوں کے مغاروں نے آفتاب کی حرکت سے مختلف فصلوں اور موسموں کا تعین بھی کر لیا تھا اسی کے ساتھ ڈاکٹر سلیٹر کا یہ بیان بھی شامل کر لیا جائے تو حقیقت کی تصویر اور بھی صاف نظر آنے لگتی یعنی تاملوں کی تقسیم بالکل شمسی تھی، ان کے مہینہ کے دن مقرر نہ تھے انھوں نے فلک کے بارہ حصے قائم کئے تھے جس وقت بھی آفتاب ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں داخل ہوتا تھا اسی وقت سے دوسرا مہینہ شروع ہو جاتا تھا۔ غرض مختلف علمائے ہیئت نے تامل تقویم کو مروجہ تقاویم سے زیادہ صحیح اور درست مانا ہے[1]۔ فن موسیقی اور راگ راگنیوں کی ایجاد میں بھی ڈراوڑوں کو خاص درجہ دیا گیا ہے اگرچہ اس فن پر دسوں تصانیف حوادث روزگار کی نذر ہو چکی ہیں پھر بھی ان کے کچھ دھندلے سے نقوش سلپا تھیکارم میں محفوظ بتائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کا وہ حصہ بہت ہی مقبول کہا جاتا ہے جس میں "الینگو اڈیکل" جیسے مشہور شاعر اور ماہر موسیقی نے مختلف سُروں، دھنوں یا راگ راگنیوں کی تشریح و توضیح کی ہے۔

مذہبی تصورات چونکہ ڈراوڑی تہذیب کا ارتقا تدریجاً اور منزل بہ منزل عمل میں آیا اس لئے ان کے مذہبی معتقدات میں اوہام پرستی سے لے کر شائستہ تصورات کے تمام ارتقائی شواہد پائے جاتے ہیں، تمدن کے ابتدائی مراحل میں شجر و حجر، مہر و ماہ، بھوت پریت اور مختلف حیوانات کی پوجا پاٹ مذہبی تصورات کے جز تھے لیکن ذہن و شعور کے ارتقا کے ساتھ مذہبی تصورات میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں اور ان کے مذہبی دیو مالا میں ایسے پرشوکت دیوتا شامل ہو گئے کہ ایرین بھی نوامیس فطرت کے پرستار ہونے کے باعث ان کے دیو مالا میں شریک ہو گئے۔ ڈراوڑوں کے خاص دیوتا رودرا، اور کوروائی نام کے ہیں۔ سیو دیوتا بھی جزیرہ نما ہند

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

کے ڈراوڑوں کا بھی ایک قدیم الایام دیوتا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کے نزدیک بھی یہ ڈراوڑوں کا ایک علاقی ودسن یعنی پہاڑی دیوتا تھا۔ ایرین کی بعض قدیم کتابوں میں سید کو وکشنا مورتی کا نام دیا گیا ہے۔ لنگ پوجا بھی ڈراوڑوں کی خاص پوجا تھی، حالیہ کھدائیوں سے بہت سے غیر تراشیدہ پتھر کے لنگم برآمد ہوئے ہیں جن سے قدیم ڈراوڑوں میں لنگ پوجا کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ جنوبی ہند کی حالیہ کھدائیوں سے بھی کچھ مخروطی شکل کے چکنے پتھر دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس پوجا کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لنکا کا راجہ راون سیو لنگ کی پوجا بڑے اہتمام سے کرتا تھا حتیٰ کہ یہ ڈراوڑ راجہ سونے کا ایک لنگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تاریخی اشاروں کی بنیاد پر سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل نے اس پوجا کو ڈراوڑوں کی قدیم ترین پوجا میں شمار کیا ہے۔ تناسخ یا آواگون کا عقیدہ بھی ڈراوڑوں کا خاص عقیدہ تھا۔ تلا سوامی پلے کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ڈراوڑ تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ دوسرے مفکرین کی نظر میں تناسخ ہند کا قدیم ترین تخیل ضرور ہے لیکن ایرین بھی اس تخیل کو اپنے ساتھ لائے تھے اس لئے یہاں کی متعدد سوسائٹی اور سماج کے اثر نے اس تخیل کو ایک عقیدہ کی شکل دے دی۔

اوتار کا عقیدہ ڈراوڑوں میں اکابر پرستی کا طریقہ قدیم الایام سے مروج تھا وہ اپنے بزرگوں کی روحوں کو نذر و نیاز سے خوش کرتے تھے اور ان کی شاندار یادگاریں قائم کر کے ان کے روشن کارناموں کو ہر قیمت پر زندہ رکھتے تھے۔ ان قومی ہیروں کے یادگاری سلسلوں سے تجسیم الوہیت یعنی اوتار کے عقیدہ کا آغاز ہوا۔

کثرت میں وحدت کا تخیل اگرچہ اکابر پرستی کے نتیجہ میں ڈراوڑوں میں تکثیر الوہیت شباب پر تھی۔ بظاہر ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں بھی خدائے واحد کا ہلکا سا تصور بھی نہ تھا لیکن عوامی ذہن سے ہٹ کر ایک ایسا باشعور طبقہ بھی ان میں نظر آتا ہے جس کو تکثیر الوہیت میں ذات واحد کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے اور ان سب پر ذات کن فکاں کا ہاتھ غالب اور بالا معلوم ہوتا ہے اس شعوری طبقہ کے تصور میں خالقِ ارض و سما کائنات کے ہر ذرہ میں جلوہ نما تھا بلکہ کائنات سے ہٹ کر

اُس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اس طبقہ کا یہ تخیل یقین و ایمان کی حد تک پہونچ گیا تھا کہ دنیائے محسوسات کے ہر ذرہ میں اس روح اعظم کی تجلیات پرتو فگن ہیں یا روح اعظم نے اپنی صورت کی جلوہ گری کے لئے کائنات میں ظہور کیا ہے یعنی ہر رنگ میں اسی شاہد حسن کا جلوہ، ہر پھول میں اسی کی مہک اور اسی کے رُخ رنگین کی نمائش ہے، بلکہ فلسفیانہ تخیل نے اس راہ میں مزید کشادگی اس طبقہ کے دلوں میں پیدا کر دی تھی جس نے اس تصور کو عقیدہ کی شکل دیدی کہ وحدت مطلق کے سوا سب اعتبار محض ہے اور وحدت مطلق ایک حقیقت ثابتہ ہے باقی سب مجاز یا حقیقت کا پرتو ہیں اور یہ عالم ظاہر ذات وجوب کا مظہر ہی نہیں بلکہ اشیاء عالم اس کی مجازی صورتیں ہیں اور ساتھ ہی اشیاء عالم اور ذات واجب میں سورج اور کرنوں کا تعلق ہے، ذات واجب آفتاب ہے اور شعاعیں اشیاء عالم۔ اس کثرت الوہیت میں ذات واجب کے تصور کو کثرت میں وحدت کی جلوہ گری کا نام دینا غلط نہ ہوگا۔

ذات واحد اور ہستیٔ وجوب کے لئے تامل زبان میں "کدول" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے ایک ایسی قادر مطلق ہستی مراد لی گئی ہے جو تمام کائنات کی اصل مالک و مختار ہے اور اسی کے ساتھ انسانی فہم و ادراک سے بالاتر اور عقل و شعور کی رسائیوں سے ماوریٰ ہی نہیں بلکہ اس کے آستانۂ عالیہ تک طائر تخیل اور مرغ تصور کی پرواز بھی ناممکن ہے تامل زبان کی قدیم تصنیف "تول کاپیم" میں کدول (خدا) کی یہ حقیقت بھی بالتصریح بیان کی گئی ہے کہ وہ "نرکار" یعنی صورت تجسیم سے مبرہ اور منزہ ہے اور ساتھ ہی حاضر و ناظر اور قادر علیٰ کل شیٔ ہے اس کی تجلیات ہر چیز میں اس طرح جلوہ نما ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں اس سے جدا نہیں کی جا سکتیں، ذات واحد کے لئے "کدول" کے علاوہ ایک لفظ کنتھائی بھی تامل زبان میں ملتا ہے جس سے وہ قوی اور توانا تر ہستی مراد لی گئی ہے جو "تنتوؤں" سے بالاتر ہے۔ مُلّا سوامی پلے کی متصوفانہ تشریح و توضیح کے مطابق "تنتوا" سے وہ بے شمار لباس مراد ہیں جن سے روح انسانی اپنے ارتقا کے دوران بار وقات مختلفہ ملبوس رہتی ہے تا آنکہ حیات و ممات کے لامتناہی چکر سے آزاد ہو کر روح اعظم یعنی اس قوی اور توانا ہستی میں جذب ہو جاتی ہے جسے کدول یا کنتھائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(باقی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
تقسیم کے بعد
(۱۵)

از سعید احمد اکبر آبادی

بدرالدین طیب جی کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ ان کا گورنمنٹ میں عمل دخل کافی تھا اور خصوصاً پنڈت جی کو ان پر بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کی قدر کرتے تھے اس بنا پر انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کی کوشش کی کہ علی گڑھ کے نوجوان سرکاری ملازمتوں میں لئے جائیں اس کے علاوہ کمپنیوں سے خط و کتابت کر کے بہت سے نوجوانوں کو وہاں بھی بھیجا۔ پنڈت جی سے کہہ سن کر سرکاری طور پر اس کی تحقیق کرائی کہ مسلمان ملازمتوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے کیوں بہت کم ہیں۔ مجھے خود اپنے ایک عزیز شاگرد کا واقعہ یاد ہے، یہ نہایت ذہین اور طباع۔ ساتھ ہی بہت نیک اور صالح نوجوان تھا۔ یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا امتحان بی ٹی۔ ایچ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ میں نے اپنے ہاں اس کو تھیالوجیکل سوسائٹی کا سکرٹری بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر ایک آل انڈیا مقابلہ کے سخت امتحان میں شریک ہوا اور اس شان سے کامیاب ہوا کہ نو سو کامیاب امیدواروں میں یہ اکیلا مسلمان تھا۔ اس کے بعد نو مہینہ کی ٹریننگ تھی اس میں بھی اعلیٰ درجہ میں کامیاب،

حاصل کی، تمام افسران متعلقہ اسے بہت پسند کرتے تھے، لیکن جب تقرر کا وقت آیا تو پولس رپورٹ اس کے خلاف ہوگئی اور اس کا نام خارج ہوگیا، یہ سخت پریشان اور بدحواس ہوکر میرے پاس پہونچا۔ میں نے بدرالدین طیب جی سے ملایا تو انھوں نے پہلے یونیورسٹی کے کیرکٹر سرٹیفکٹ کی روشنی میں مجھ سے اور پرووسٹ اور پراکٹر سے یہ تحقیق کی کہ پولس کی رپورٹ غلط تھی اور اس نوجوان کا تعلق کبھی کسی فرقہ وارانہ جماعت سے نہیں رہا۔ بدرالدین طیب جی کو جب اس بارہ میں اطمینان ہوگیا تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون اٹھایا اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بات چیت کرکے ان کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ پنڈت جی نے فوراً فائل منگوالیا۔ جب پولس رپوٹ سامنے آئی تو حکم دیا کہ اس کا ثبوت فراہم کیا جائے، پولس کو دن میں تارے نظر آنے لگے، علی گڑھ آئی، کئی روز تک یہاں پڑی رہی لیکن اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور وہ اپنی رپورٹ کو صحیح ثابت نہ کرسکی، اس کے بعد پولس کے ان ذمہ دار افسروں کا حشر کیا ہوا؟ اس کا علم تو نہ ہوسکا لیکن یہ نوجوان اللہ کے فضل وکرم سے آج ایک بڑے عہدہ پر فائز ہے اور بڑی نیک نامی سے اپنے فرائض مفوضہ انجام دے رہا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ آج مسلمانوں کی دکھ کوئی مشکل ہے جو دور نہیں ہوسکتی، بس ضرورت اس کی ہے کہ ان کی قیادت صحیح ہو۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو بدرالدین طیب جی کی طرح خالص تعمیری ذہن رکھتے ہوں، مخلص اور تجربہ کار ہوں اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ بیدار مغز اور نہایت جری وبیباک ہوں۔

نواب علی یاور جنگ

جب یہ طے ہوگیا کہ بدرالدین طیب جی علی گڑھ میں نہیں رہیں گے تو ایک روز نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری نے ہم چند اکزکٹو کونسل کے مقامی ممبروں کو شام کی چائے پر مدعو کیا اور وہاں بتایا کہ اب علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کے لئے نواب علی یاور جنگ کا نام درپیش ہے اور پھر موصوف کے تعارف میں بتایا کہ بڑے لائق اور قابل ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر اور گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے بڑے سفارتی عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ تو سب درست اور بجا! لیکن آپ

کا حیدر آباد سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے یہ بھی فرمائیے کہ نواب علی یاور جنگ کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی پاس اور لحاظ رہے گا! نواب صاحب چھتاری میرا یہ سوال سنتے ہی جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے، لیکن جلد ہی سنبھل کر بولے: "میں ذاتی طور پر خوب واقف ہوں، بہت شریف اور مسلمان آدمی ہیں"۔ مجکو لیچڑ پن اور خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنے سے سخت نفرت ہے، اس لئے جب کسی شخص کی گفتگو کے بین السطور سے میں اس کا اصل مقصد تاڑ لیتا ہوں تو اب اپنی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں اور مزید بحث و تکرار نہیں کرتا۔ چنانچہ اس وقت بھی میں خاموش ہو گیا دوسرے حضرات کچھ کہتے سنتے رہے اور مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد مجلس منتشر ہو گئی ؛ اس کے بعد ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مطابق اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میں تین آدمیوں کا ایک پنیل بنا اور صدر جمہوریہ نے وزیٹر کی حیثیت سے اس پنیل سے نواب علی یاور جنگ کا نام منتخب کر کے وائس چانسلر مقرر کر دیا۔

یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے زیادہ المناک واقعہ

نواب صاحب نے مارچ ۱۹۶۵ء میں اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۲۵ اپریل کو یونیورسٹی کی تاریخ کا وہ سب سے زیادہ المناک واقعہ پیش آیا جس نے یونیورسٹی کی ہیئت ہی بدل دی اور اس کو ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جن کے اثرات و نتائج سے یونیورسٹی کو اب تک نجات نہیں ملی۔

حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ مشہور اور نہایت بدنام واقعہ ہے اور مختلف لوگوں نے اس کی تعبیر و تشریح میں مختلف باتیں کہی ہیں، لیکن چونکہ میں خود اس وقت موجود تھا اس لئے اپنے مشاہدات و احساسات کی روشنی میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، بدرالدین طیب جی نے انجینرنگ کالج میں داخلہ کے لئے خود یونیورسٹی کے طلبا کے لئے ۷۵ فی صد کا کوٹہ مقرر کر دیا

تھا اور اس کی منظوری پہلے اکاڈمک کونسل اور پھر اگزکٹو کونسل اور کورٹ سے لے لی تھی۔
نواب علی یاور جنگ نے چارج لینے کے بعد ہی اس چیز کو قومی مفاد کے خلاف سمجھا اور اسے
ختم کرنے کے لئے انھوں نے اکاڈمک کونسل میں اس کی تحریک کی کہ اندرونی اور بیرونی
طلبہ کے لئے ۷۵ اور ۲۵ کا تناسب ختم کر دیا جائے اور اسے یونیورسٹی کی صوابدید
پر چھوڑ دیا جائے۔ اکاڈمک کونسل نے اسے منظور کر لیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ
نواب صاحب کا یہ اقدام مسلمان طلبا کے مفاد کے خلاف تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال
صحیح نہیں ہے، کیونکہ اندرونی اور بیرونی طلبا میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں تھی،
اس لئے اگر اندرونی طلبا کے لئے ۷۵ فی صد کا کوٹہ مقرر ہوتا ہے تو اس سے مسلم اور
غیر مسلم دونوں قسم کے طلبا کو فائدہ پہونچتا ہے اور بیرونی طلبا کے لئے ۲۵ فی صد کے
کوٹہ سے اگر ان کو نقصان پہونچتا ہے تو اس میں دوسری یونیورسٹیوں سے آنے والے
مسلم اور غیر مسلم دونوں طلبا شریک ہیں، چنانچہ مجھے معلوم ہے نواب صاحب نے
اکاڈمک کونسل میں اپنی تجویز پیش کرنے سے قبل انجینیرنگ کالج کے پرنسپل جناب ضیاالدین
صاحب انصاری اور کالج کے سینئر پروفیسروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور پوچھا
کہ کیا ان کی اس تجویز سے مسلمان طلبا کے داخلہ پر اثر پڑے گا تو ان حضرات نے
کافی غور و خوض اور گذشتہ رکارڈ کو دیکھنے اور اس کے مطابق اندازے لگانے
کے بعد بتایا کہ مسلمان طلبا کے داخلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اندرونی طلبا
کی تعداد کم کرنے سے بیرونی طلبا کی جو تعداد بڑھے گی اس میں مسلمان طلبا بھی ہوں
گے، اس بنا پر میرے نزدیک نواب صاحب کی تجویز کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے
دیکھنا درست نہیں ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر یہ معاملہ
مقامی اور یونیورسٹی کے اپنے طلبا کے حق کا تھا، ہر یونیورسٹی کے طلبا اپنا یہ ذاتی حق

سمجھتے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج اور دوسرے پروفیشنل تعلیم کے اداروں اور کالجوں میں داخلہ کے معاملہ میں ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے، چنانچہ اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں ایسا ہوتا بھی ہے، اس بنا پر اکاڈمک کونسل میں جب نواب صاحب کی تجویز منظور ہوئی تو طلبا میں اس سے بیزاری اور ناراضگی کا پیدا ہونا ایک امر طبعی تھا، چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن یہ احتجاج نہایت پرامن تھا۔ ۲۴ر اپریل کو اکزکٹو کونسل کی میٹنگ تھی۔ میں خود اس میں شریک تھا، جب میٹنگ ہو رہی تھی تو طلبار نے ایک جلوس نکالا اس وقت پراکٹر پالٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے ریڈر ناصر علی صاحب تھے، یہ نہایت مستعد، بیدار مغز اور طلبار کے ہمدرد تھے، یہ ڈیوٹی پر تھے اور نگرانی کر رہے تھے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ انھوں نے طلبار کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا اور میٹنگ چلتی رہی، میٹنگ میں نواب صاحب نے اپنی تجویز پر تقریر کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اس سے مسلم مفاد پر کوئی اثر نہ ہوگا، لیکن جسٹس بشیر احمد سعید اور دوسرے حضرات کو اس معاملہ میں اطمینان نہیں تھا اور وہ انجینئرنگ کالج میں گذشتہ چند برس کے داخلوں کی روئداد وغیرہ کی روشنی میں اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہتے تھے اس لئے محض غیر رسمی گفتگو کے بعد اس کو ملتوی کر دیا گیا اور اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۲۵ر اپریل کو کورٹ کی میٹنگ تھی جو حسب معمول و دستور حامد ہال (یا طلبار کی یونین کے ہال) میں منعقد ہوئی، قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق میٹنگ کا افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد نئے وائس چانسلر کے خیر مقدم میں تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا عبدالوہاب بخاری، سید کلب عباس صاحب اور بعض اور حضرات نے حصہ لیا۔ ان سب کے جواب میں وائس چانسلر نے مختصر تقریر کی جس میں شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ انھیں اس کا احساس ہے کہ اس یونیورسٹی کی تاریخی عظمت کیا ہے، اس کی روایات کیا ہیں، وہ کوشش کریں گے کہ اس کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں، اور اسی جذبہ سے وہ یہاں آئے ہیں۔

اس کے بعد ایجنڈے پر کارروائی شروع ہوئی۔ ابھی چند ہی آئیٹم ہوئے تھے کہ طلبار کا ایک بڑا جلوس یونین کے صدر کے زیر قیادت وہاں پہونچ گیا اور اس نے یونین ہال کے شمالی دروازے کے سامنے دھرنا جما دیا۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ تھا کہ کورٹ اپنی اس میٹنگ میں اکاڈمک کونسل کی منظور کردہ تجویز متعلقہ کو رد کردے اور اس کا اعلان کرے کہ سابقہ پوزیشن بحال رہے گی۔ طلبار کا یہ جلوس مسلم اور غیر مسلم دونوں طلبار پر مشتمل تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے اس جلوس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کرسی پر ممبران کورٹ کی طرف رخ کئے جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ حد یہ ہے کہ طلبار کی طرف گردن موڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کتنے طلبار ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بعض اساتذہ نے ہال سے باہر نکل کر ان سے گفتگو کی۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ آخر کار جب شور وغل زیادہ بڑھا تو وائس چانسلر صاحب نے پراکٹر کو بلا کر پولس کو طلب کر لینے کی ہدایت کی اور میٹنگ ملتوی کر دی گئی، میٹنگ کے ملتوی ہوتے ہی ممبر حضرات منتشر ہو گئے اور جس کا جدھر سینگ سمایا چل دیا۔ لیکن وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، نواب صاحب چھتاری اور چند پروفیسر اور دوسرے ممبر ہال میں ہی رہے اور میں بھی انہیں حضرات میں شامل تھا۔

پراکٹر کے ٹیلیفون کرنے پر دس پندرہ منٹ کے اندر اندر پولس پہونچ گئی، طلبار نے کورٹ کی طرف سے مایوس ہو کر ہال کے اندر گھس کر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ جب اس میں شدت ہوئی تو میں اپنی حفاظت کے لئے ہال کے پچھلے حصہ میں بازو کے کمرہ کے قریب ایک اونچی سی میز رکھی تھی اس کے نیچے گھس گیا لیکن جب دیکھا کہ پتھراؤ بڑھتا ہی جاتا ہے اور طلبار آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو میں میز کے نیچے ہی نیچے رینگتا ہوا بازو کے کمرہ میں گھس گیا۔ یہاں دیکھا کہ پروفیسر نورالحسن، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محیب الرحمن اور چند اور حضرات بھی اسی کمرہ میں پناہ گزین تھے۔ ادھر ہم لوگ یہ جمناسٹک کر رہے تھے اور اُدھر ہوا یہ کہ طلبا نے پولیس کو دیکھا تو اس پر بھی پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولس نے فوراً گولی چلا دی جس سے بعض طالب علم زخمی ہوئے لیکن مشہور یہ ہو گیا کہ دو طالب علم جاں بحق ہو گئے۔ اس خبر کا اڑنا تھا کہ طلبار آپے سے باہر ہو گئے اور اب انھوں

نے ہال کا یہ مشرقی بازو والا کمرہ جس میں ہم پناہ گزیں تھے اس کو اپنا نشانہ بنایا۔ کمرہ اندر سے بند تھا اس لئے اس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اس زور شور سے پتھراؤ کیا کہ ان کے شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر ہم لوگوں کے اِدھر اُدھر تابڑ توڑ گرنے لگے اور بچنا مشکل ہو گیا۔ اب میں نے یہ کیا کہ جن دو کھڑکیوں سے پتھر اندر آرہے تھے میں ان دونوں کھڑکیوں کے بیچ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ میرے بعض ساتھی شیشہ یا پتھر لگنے سے زخمی ہو گئے اور میں محفوظ رہا، لیکن پتھراؤ میں لمحہ بہ لمحہ جو شدت مزید سے مزید تر پیدا ہوتی جا رہی تھی اور لڑکے غصہ میں بھرے ہوئے جو چیخ پکار کر رہے تھے اس کی وجہ سے یقین تھا کہ آج اگر جان بچ بھی گئی تو صحیح سلامت گھر پہونچنا ناممکن ہے، خیال تھا کہ کھڑکیوں کے شیشے تو ٹوٹ ہی گئے ہیں، اب لڑکے ان میں سے پھاند کر اندر گھس آئیں گے، اور اپنا غصہ ہم پر اتاریں گے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یکایک لڑکوں کا شور و غل ختم ہو گیا اور وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف چلے گئے، میں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور کمرہ سے نکل کر پھر ہال میں داخل ہوا۔ اس وقت ہال میں بالکل سناٹا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور حیرت بھی کہ مسٹر پی۔ این سپرو جو ملک کی ایک مشہور اور بلند پایہ شخصیت تھے اور جو کورٹ کے ممبر تھے اپنی سن رسیدگی اور ضعیف کے باوجود کورٹ کی میٹنگ میں جہاں بیٹھے تھے اب بھی تن تنہا اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ہال میں پتھراؤ ہوتا رہا۔ سب تتر بتر ہو گئے، لیکن سپرو صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، میں نے اس وقت ان کو صحیح سلامت دیکھا تو دل ہی دل میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا ورنہ خدانخواستہ اگر ان کا بال بیکا ہو جاتا تو معلوم نہیں کیا قیامت برپا ہو جاتی، بہرحال اس وقت پروفیسر آل احمد سرور میرے ساتھ تھے، ہم دونوں نے ہال سے باہر نکل کر دیکھا تو اس وقت لڑکوں کی بھیڑ تھی، اسے غنیمت جانا اور ہم دونوں لپک کر ایس ایس ہال کے ڈائننگ ہال میں گھس گئے، باہر پہلے شور و غل کی آواز آئی اس کے بعد یہ آواز مدھم پڑ گئی اندر سے ہمیں کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ باہر کیا ہو رہا ہے، دس پندرہ منٹ اسی امید و بیم کے

کے عالم میں گذرے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا تو راستہ صاف نظر آیا۔ ہم دونوں کی رائے ہوئی کہ اب نکل چلنا چاہئے۔ چنانچہ مرور صاحب اپنے گھر کی طرف چلے اور راستہ میں زخمی ہو گئے۔ میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی سڑک پر آیا تھا کہ ایک چپراسی سائیکل پر وہاں سے گذر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو فوراً سائیکل سے اتر کر مجھے اس پر بٹھا لیا اور بڑی تیزی سے سائیکل چلا کر مجھے میرے گھر پہونچا دیا۔ یہاں گھر کے لوگ سخت پریشان تھے، مجھے بخیریت و عافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

وائس چانسلر صاحب کے ساتھ نہایت افسوسناک معاملہ

یہ تو اس واقعہ کی آپ بیتی ہے جو خود پر گذری، شام کے وقت جو دوست احباب میری خیریت طلبی کے لئے آئے ان سے یہ معلوم کر کے سخت دکھ اور صدمہ ہوا کہ نواب علی یاور جنگ شدید زخمی ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے بھی شدید چوٹیں آئیں۔ میں نے یونین ہال میں پتھراؤ کے وقت اپنا بچاؤ کرتے ہوئے نواب صاحب کو اس حالت میں چھوڑا تھا کہ وہ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور شاید نواب چھتاری بھی، کے ساتھ ہال کے پیچھے کی جانب کھڑے ہوئے تھے، اس وقت نہایت اعلیٰ قسم کے سوٹ میں ملبوس تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پیتے جا رہے تھے غالباً ان کو خیال یہ تھا کہ پولیس یہاں پہونچے گی اور ان کو سلامتی کے ساتھ اپنی حفاظت میں نکال کر لے جائے گی، اور واقعہ یہ ہے کہ پولس کو ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ لیکن پولیس خود اپنی خیر منانے لگی اور فیعن گیٹ کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی، پولس کی فائرنگ سے دو لڑکوں کے مرجانے کی جب شہرت عام ہوئی تو لڑکوں میں اشتعال بڑھا اور وہ نواب صاحب کو زد و کوب کرتے ہوئے ایس۔ ایس ہال کی طرف لے گئے اور وہاں ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ مقصد مجبور کر کے ان سے اکاڈمک کونسل کے منظور کردہ رزولیشن کو منسوخ کرنے کی ایک تحریر کا حاصل کرنا تھا۔ جب انھوں نے یہ تحریر حاصل کر لی تو چونکہ کمرہ کے باہر طلباء کا بڑا ہجوم تھا اور اندیشہ

تھا کہ کون کیا کرے، اس بنا پر کرہ کے اندر جو طلبا رہتے تھے انھوں نے کرہ کی پشت کے جانب سے جہاں یونیورسٹی ہسپتال کی ایمبولنس پہلے سے کھڑی تھی۔ ایک کھڑکی کی سلاخیں ہٹا کر نواب صاحب کو کمرہ سے باہر کردیا اور نواب صاحب ایمبولنس میں لیٹ کر اپنی کوٹھی پہونچ گئے۔ نواب صاحب کو ضربات شدید آئی تھیں، تمام کپڑے خون سے تربتر ہو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے نواب صاحب کو اس عالم میں دیکھا تو ہوش وحواس اڑگئے، پھر بھی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اتنے میں سول سرجن اور بعض اور ڈاکٹر پہونچ گئے انھوں نے مرہم پٹی کی، دوسرے دن صبح کے وقت نواب صاحب دہلی آکر ڈاکٹر سین کے مشہور نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے، کم وبیش دو مہینہ یہاں قیام رہا۔ اس عرصہ میں میں بھی وقتاً فوقتاً مزاج پرسی کی غرض سے نرسنگ ہوم میں آتا رہا۔ رجسٹرار اور پرا کٹر وغیرہ بھی دفتری کاغذات اور فائلوں کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے نواب صاحب ان سے گفتگو کرتے، فائل دیکھتے اور ان پر نوٹ لکھتے تھے۔ یعنی دفتری کام یہیں سے انجام دیتے تھے۔

واقعہ کا تجزیاتی مطالعہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا اور اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اگر پورے واقعہ کا مطالعہ تجزیاتی طور پر کیا جائے تو اس کے مختلف پہلو اور گوشے ایسے نظر آتے ہیں جو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور عبرت آموز بھی ہیں۔ ذیل میں ان کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے!

(۱) یہ تسلیم ہے کہ نواب صاحب کا جو منصوبہ تھا اس کا مقصد مسلم مفاد کو نقصان پہونچانا نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کونسا اہم امر تھا کہ نواب صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس کو سرانجام کرنا ضروری خیال فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ اکزکٹو کونسل کی میٹنگ میں جب اس معاملہ پر غیر رسمی گفتگو ہو رہی تھی تو نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے ان سے چند ممبران پارلیمنٹ نے کہا تھا: "نواب صاحب! اس جمہوریت کے دور میں یہ کیسے مناسب ہے کہ علی گڑھ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے پچھتر فی صد نشستیں خود علی گڑھ کے طلبا کے لئے

مخصوص کر دی جائیں اور باہر کے طلباء کے لئے خواہ وہ کیسے ہی قابل اور مستحق ہوں صرف پچیس نشستیں رکھی جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود نواب صاحب کے ذہن میں اُن کے اس منصوبہ کی کوئی واضح اہمیت نہیں تھی، اور انھوں نے صرف معترضین کی زبان بند کرنے کے لئے یہ اقدام کیا تھا، لیکن نواب صاحب کو اول تو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ جس چیز کو ان کے پیش رو (بدرالدین طیب جی) ابھی دو برس پہلے کر چکے ہیں اُس کو آتے ہی اس قدر جلد منسوخ کر دینا کس طرح قرین مصلحت یا دستوری آداب وضوابط کے مطابق ہو سکتا ہے اور پھر ان کو یہ نفسیاتی حقیقت بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے تھی کہ جب آپ کسی کو کوئی حق دیں تو اس وقت خوب اچھی طرح سوچ بچار کر لیجئے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپ نے کسی کو ایک حق دے دیا تو اب اس سے بحث نہیں کہ یہ حق اُس شخص کا واجبی تھا یا نہیں۔ بہرحال اب اس کا واپس لینا آسان نہیں ہے، اور اگر آپ نے اس پر اصرار کیا تو لڑائی جھگڑے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس موقع پر مجھے خود اپنا ایک واقعہ یاد آیا آپ بھی سن لیجئے، جب فروری ۱۹۲۹ء میں میں نے کلکتہ مدرسہ کا چارج لیا اور مدرسہ کی گورننگ باڈی کی میٹنگ بلائی اور اس کے سامنے دوسری باتوں کے ساتھ سال بھر کی تعطیلات کی فہرست بھی پیش کی جس میں میں نے آخری چہارشنبہ کی تعطیل جو پہلے ہمیشہ ہوتی آئی تھی حذف کر دی تھی تو خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد موسیٰ چیرمین گورننگ باڈی نے اس فہرست پر نگاہ ڈال کر حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے: "پرنسپل صاحب! سچ بتائیے، آپ یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں یا جلد ہی واپس ہو جانے کا ارادہ ہے"۔ میں نے عرض کیا: "میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں" فرمایا "آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کے نزدیک آخری چہارشنبہ کے دن کی کیا اہمیت ہے! آپ نے آتے ہی اسے ختم کر دیا۔ اگر آپ نے اس دن تعطیل نہیں کی تو میں بتائے دیتا ہوں کہ پبلک میں آپ کے خلاف اس قدر ایجی ٹیشن ہوگا کہ آپ کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے فوراً خان بہادر صاحب کی بات مان لی اور اس دن کو بھی تعطیلات کی فہرست میں شامل کر لیا، لیکن ایک کانگرسی مسلمان ممبر اسمبلی

نے یہ خبر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کو بھی پہونچادی انھوں نے مجھ سے فون پر کہا: آپ اتر پردیش سے آئے ہیں اور بنگالی مسلمانوں کی روایات اور جذبات سے واقف نہیں ہیں، اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ ذرا سنبھل کر چلئے، جلد بازی نہ کیجئے، اور اب تک جیسا کچھ ہوتا آیا ہے اس میں تغیر تبدل نہ کیجئے۔

خان بہادر صاحب نے جو بات کہی تھی اُس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب چند برسوں کے بعد سر ڈینی سن راس، جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل رہے تھے، ان کی خود نوشت سوانح عمری میری نظر سے گذری، اس میں موصوف نے ایک جگہ لکھا: "میں نے ایک مرتبہ کلکتہ مدرسہ میں بعض غیر ضروری چھٹیاں کم کردیں تو نواب عبداللطیف (بنگال کی ایک نامور شخصیت) کو اس درجہ ناگواری ہوئی کہ انھوں کے اکسانے پر ایک گروہ نے میرے مکان پر حملہ کر دیا اور مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔" نواب علی یاور جنگ سے یہ حقیقت اس لئے اوجھل ہو گئی تھی کہ وہ نواب آدمی تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے، عوام سے ان کا ربط ضبط نہ رہا تھا۔

(۲) ۲۴ر اپریل کو جب اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ طلبار نے ایک جلوس نکالا، لیکن پرامن رہے اور پرآکٹر کے سمجھانے بجھانے پر منتشر ہو گئے، پھر جب ۲۵ر اپریل کو کورٹ کی میٹنگ کے وقت یہ پھر جلوس کی شکل میں آئے تو اب بھی یہ پرامن تھے، اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ وائس چانسلر صاحب خود اٹھ کر آتے، ان لڑکوں سے خطاب کرتے، ان کی سنتے اور اپنی کہتے۔ ہم تمام ممبران کورٹ وائس چانسلر صاحب کی مدد کے لئے موجود تھے، لیکن وائس چانسلر صاحب نے گویا طلبار کے آنے اور بیٹھنے کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ جب طلبار کا شور وغل زیادہ بڑھا تو میٹنگ کی کارروائی روک دی، لیکن اب بھی کرسی پر سامنے کی طرف رُخ کئے تشریف فرما رہے اور سگریٹ پیتے رہے، میرے نزدیک یہ دوسری نامناسب بات تھی جو نواب صاحب صاحب کی طرف سے پیش آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر زیدی صاحب یا بدرالدین طیب جی

ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔

(۳) اس میں شبہ نہیں کہ یونیورسٹی میں بعض اوقات حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ پولس کا طلب کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن تعلیم گاہوں کا تقدس اس امر کا مقتضی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو پولس کو ان معاملات میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے، نواب صاحب نے جس وقت پراکٹر کو پولس طلب کرنے کا حکم دیا ہے، میرے نزدیک ان کا یہ حکم قبل از وقت تھا، کیونکہ اب تک طلبار کی طرف سے تشدد کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا اور موقع تھا کہ باہم گفت وشنید سے معاملہ ختم ہو جاتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جب کہ امرِ زیر بحث پر اکزکٹو کونسل نے کوئی گفتگو ہی نہ کی تھی اور اس بنا پر یہ معاملہ کورٹ کے سامنے آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اکاڈمک کونسل نے بیشک ایک تجویز منظور کر لی تھی، لیکن اکزکٹو کونسل اور پھر کورٹ کی منظوری کے بغیر تو اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں چونکہ ہال کے اندر تھا، اس لئے باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ لڑکوں نے تشدد پولس کو دیکھکر اور اس سے مشتعل ہو کر شروع کیا تھا۔ اور جب تشدد شروع ہی کر دیا تو پولس بھی اس کی لپیٹ میں آگئی اور پولس نے اپنے دفاع میں گولی چلا دی[1]۔

---

[1] ملک اظہار الحق جو آج کل یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں میرے زمانہ میں کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ کلرک اور اس حیثیت سے میرے اسسٹنٹ تھے ان سے اور کلکتہ کے باخبر حضرات سے دریافت کیجئے کہ میرے دہ سالہ قیام کلکتہ کے زمانہ میں کتنی مرتبہ لڑکوں نے میرے خلاف اسٹرائک کی، سخت ایجی ٹیشن کیا۔ جلوس نکالے اور میرے خلاف نعرے لگائے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ بنگالی لڑکوں نے مجھ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا، لیکن میں نے کبھی پولس کی مدد طلب نہیں کی، اور خود ہی طلبار سے گفت وشنید کر کے مگر اپنے فیصلہ پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے تمام ہنگامے ختم کئے۔ بلکہ ایک مرتبہ میرے چارج لینے کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴) اچھا! اگر پولس کو طلب کیا گیا بھی تھا تو اس کو بتانا چاہئے تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے؟ اسے کیا کرنا ہے؟ اور اسے کہاں کھڑا ہونا ہے؟ اس کو طلب کرکے یونہی چھوڑ دینے اور اس سے تعلق نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر وغیرہ مجروح ہوتے رہے اور ادھر پولس خود اپنی حفاظت میں لگ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولس ہی یونیورسٹی کے لئے قیامت صغریٰ بن گئی۔

ہم نے اوپر واقعہ کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کا مقصد طلبا کے جرم کو ہلکا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اُن بعض چیزوں کو بھی منظر عام پر لانا ہے جن سے اس واقعہ کے پیش آنے میں مدد ملی۔ خلیل جبران نے اپنے ایک ناول میں بڑا بلیغ فقرہ لکھا ہے:

Not a single leaf falls down without the silent consent of the whole tree.

یعنی ایک پتہ بھی پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر نہیں گرتا۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر یہ فقرہ صادق آتا ہے اور اس بنا پر جب تک حالات کا جائزہ اس وسعتِ نظر اور دقّتِ نگاہ سے نہیں لیا جائے گا اس وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دو ماہ کے بعد ہی ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء کو جب کلکتہ مدرسہ میں ایک بہت بڑا فساد ہو گیا جس میں بنگالی اور بہاری (اردو بولنے والے) طلبا میں لاٹھیوں اور چاقوؤں سے کھلی جنگ ہوئی اور اس کی خبر پاکر پولس کے بڑے بڑے افسر خود آ گئے تو ان کے سخت اصرار کے باوجود نہ میں نے ان کو دخل دینے کی اجازت دی اور نہ کسی طالب علم کو گرفتار ہونے دیا، اور خود طلباء کے مجمع میں ایک پرزور تقریر کرکے اس ہنگامہ کو اس طرح ختم کیا کہ گورنمنٹ نے داد دی، اخبارات نے شذرے لکھے، پبلک نے تعریف کی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک ملاقات میں مسرت کا اظہار فرمایا۔

تک مشکلات کا کامیاب اور پائدار حل دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ کے اثراتِ مابعد

واقعہ تو ایک ارشدنی تھا جو یونیورسٹی کی بدقسمتی سے پیش آکر رہا لیکن یونیورسٹی کی کایاپلٹ کرکے رکھ گیا۔ جہاں تک نواب صاحب کی ذات کا تعلق ہے۔ مجکو ان کی شرافت اور علو اخلاق میں شبہ نہیں ہے، چنانچہ جب طلبار نے اس پر اپنے رنج وغم اور افسوس کا اظہار کیا تو انھوں نے ان کو معاف کربھی دیا، لیکن انھوں نے جو بیان دیا تھا اس کی اور خفیہ پولس کی رپورٹ کی بنیاد پر گورنمنٹ نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اس سلسلہ میں مسٹر چھاگلہ جو وزیر تعلیم تھے انھوں نے فوراً یہ کیا کہ یونیورسٹی کا ایکٹ ۱۹۵۱ء منسوخ کرکے ایک آرڈیننس نافذ کردیا۔ اس آرڈیننس کے ماتحت کورٹ اور اکزکٹو کونسل کی وہ ہیئت ترکیبی ختم ہوگئی جو ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ماتحت انھیں حاصل تھی اور آرڈیننس کی رو سے اور نامزدگی کے ذریعہ کورٹ اور اکزکٹو کونسل کی تشکیل کی گئی، ایک شخص یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا تھی؟ یونیورسٹیوں میں آج کیا کچھ نہیں ہورہا ہے، لاکھوں روپیہ کی گورنمنٹ پراپرٹی دیکھتے دیکھتے خاک کا ڈھیر کردی جاتی ہے۔ اور قتل اور زنا بالجبر تک کے واقعات پیش آتے ہیں لیکن کیا یونیورسٹی ایکٹ وہاں بھی منسوخ ہوتا ہے؟ پھر کیا ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے ماتحت کورٹ کے اور اکزکٹو کونسل کے جو ممبر منتخب کردہ یا نامزد کردہ تھے ان کی مدد سے یا کسی قسم کے ان کے ایما یا اشارہ پر یہ فتنہ برپا ہوا تھا، یا اس فتنہ کا سبب ایکٹ تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس واقعہ کا ایکٹ سے تعلق ہی کیا تھا؟ اس کی توجیہ وتعلیل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یونیورسٹی کا اسلامی کردار جو کچھ بھی تھا اور اس بنا پر یونیورسٹی کو دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں جو امتیاز تھا۔ وزیر تعلیم اُس پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، اس لئے انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ ایکٹ کی منسوخی اور آرڈیننس کے نفاذ کا حکم صادر کردیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انھوں نے بارہا اپنے بیانات میں یہ بھی کہا کہ "مسلم" کا لفظ یونیورسٹی سے خارج کردیا جائے گا۔ مجکو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کو اس طرح کا اقدام کرنے اور

بڑھ بڑھکر اس قسم کی بے سروپا اور لایعنی باتیں کرنے کی جرأت صرف اس لئے ہوئی کہ جانتے تھے کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں پر تقسیم کی وہ مار پڑی ہے کہ خدا دشمن کو نصیب نہ کرے، تو پھر وہ بھی ان پر وار کرکے شاہ مدار کا اعزاز حاصل کیوں نہ کریں چنانچہ اپنے موقف کو مبنی برانصاف ثابت کرنے کی غرض سے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کی نسبت بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا لیکن جب ان لوگوں نے آنکھیں دکھائیں تو چپ سادھ کر بیٹھ گئے، اور آخر انجام یہ ہوا کہ وزارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جیا گلہ صاحب نے جس وقت مسلم یونیورسٹی کے متعلق یہ اقدام کیا ہے اس وقت لال بہادر شاستری جی دہلی میں موجود نہیں تھے۔ جب وہ واپس آئے اور انھیں ان سب چیزوں کا علم ہوا تو انھوں نے چھاگلہ صاحب کے اقدام کے خلاف سخت ناراضگی اور بیزاری کا اظہار فرمایا۔ لیکن ہر گورنمنٹ کو اپنے وقار کا لحاظ ہوتا ہے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس لئے جو آرڈیننس نافذ ہوگیا تھا وہ تقضائے مبرم ہوکر یونیورسٹی پر مسلط ہوگیا۔

گرفتاریاں اور مقدمات یوپی گورنمنٹ نے یہ کیا کہ یونیورسٹی میں بڑی تعداد میں پولس متعین کردی جو فیض گیٹ اور مولانا آزاد لائبریری کے پیچھے ڈیڑھ دو برس فروکش رہی، اور جب دو ماہ تک سین نرسنگ ہوم میں قیام کے بعد جناب وائس چانسلر صاحب علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی قیام گاہ پر بھی گارڈ مقرر کردیا۔ علاوہ ازیں طلبار کی یونین کی پوری کیبنٹ گرفتار ہوگئی، ان کے ساتھ شاید کچھ اور لڑکے بھی گرفتار ہوئے جو کافی مدت تک حوالات میں رہے۔ آخر گورنمنٹ نے مقدمات واپس لے لئے اور یہ سب بغیر سزا کے رہا ہوگئے، لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک جو بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جسٹس بشیر احمد سعید صاحب اور مجتبیٰ حسن صاحب جو واقعہ کے پیش آنے کے وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے یہ دونوں حضرات بھی گرفتار ہوئے مگر ان کی ضمانتیں منظور ہوگئیں اور مقدمات چلنے لگے۔ یہ دونوں حضرات ذاتی طور پر میرے بڑے کرم فرما اور مہربان دوست تھے لیکن اس کے باوجود جب یہ دونوں مقدمہ کی پیشی کے سلسلہ میں علی گڑھ آئے

یا لائے گئے ہیں تو یہ منظر اس درجہ حسرت آفریں اور رقت انگیز تھا کہ میں نے ہر چند کوشش کی۔ لیکن ان دونوں کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ نے آخر ان پر سے بھی مقدمات اٹھا لیئے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گورنمنٹ نے اپنی خفیہ پولیس کے اُن افسروں کے خلاف کیا کارروائی کی جن کی رپورٹ کی اساس پر بلک کے ان دو معزز اشخاص پر مقدمات قائم کئے گئے اور جن کے باعث ان کو ہر قسم کی ذہنی، روحانی اور جسمانی اذیت اور کرب و اضطراب سے گزرنا پڑا۔ والی اللہ المشتکی

ڈاکٹر عبدالبصیر مرحوم

کوئی زخم خواہ کتنا ہی گہرا اور حوادث زمانہ کا دیا ہوا کوئی داغ کیسا ہی اجاگر ہو امتداد روزگار کا یہ کرشمہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ زخم مندمل اور داغ بھی دھندلا ہونے لگتا ہے۔ لیکن اتنے برس بیت جانے پر بھی ہیں جس غم کو اب تک نہیں بھلا سکا ہوں وہ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالبصیر کا غم ہے جن کی زندگی اس واقعہ کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اس کی وجہ سے پورا ایک گھرانہ تباہ ہو گیا۔ موصوف کی عمر چالیس پینتالیس برس کے درمیان ہوگی۔ یونیورسٹی میں شعبۂ علم الحیوانات (Zoology) کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے، جس روز یہ واقعہ پیش آیا ہے اُس سے دو تین ماہ قبل انھوں نے مجھکو امریکہ کی مشہور ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک خط دکھایا تھا جس میں ان کو دو ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ پر پروفیسر شپ کی پیش کش کی گئی تھی، میں نے اصرار کیا کہ آپ اسے ضرور قبول کر لیجے، لیکن انھوں نے اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہنے لگے: سوچوں گا۔ گھر کے دولتمند اور خوش حال تھے دودھ پور میں اُن کی نہایت وسیع و عریض اور شاندار کوٹھی "نور منزل" کے نام سے تھی اُس میں رہتے تھے، اپنے فن میں غیر معمولی قابلیت اور شہرت کے ساتھ اخلاق و عادات اور کردار کے اعتبار سے بھی پکے اور سچے مسلمان تھے، زیدی صاحب کے زمانہ میں پراکٹر بھی رہے تھے۔ اپنے علمی و عملی اوصاف و کمالات کے باعث طلبار میں بڑے ہر دلعزیز تھے

اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی پکڑے گئے اور آگرہ جیل میں رکھے گئے، اگرچہ بعد میں یہ بھی

رہا ہوگئے اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ لیکن مرحوم نہایت ذکی الحس (Sensitive) اور بیحد منفعل طبیعت کے انسان تھے، سینکڑوں انسانوں کی طرح ان کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس معاملہ میں قطعاً بے گناہ اور بے خطا ہی نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر نواب صاحب کی حفاظت کی اور اُن کی جان بچائی تھی، ....

.... لیکن اس واقعہ نے ایک عجیب صورت یہ اختیار کرلی تھی کہ ہر ترقی پسند اور سکولرزم کا پرستار آج معصوم و بے گناہ اور ہر پختہ عقیدہ اور عمل کا مسلمان حکومت کی نظر میں مجرم! اور اگر مجرم نہیں تو مشتبہ ضرور! اس بنا پر ڈاکٹر عبدالبصیر کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ صرف پکے سچے مسلمان اور طلبا میں بیحد ہر دلعزیز ہونے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں:

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

پھر گرفتاری کے وقت اور حوالات میں ان کو جو ذہنی اور روحانی سخت تکالیف پہونچیں ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ غم ان کے دل میں بیٹھ گیا اور (ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق) یہی غم کینسر بن کر آخر انھیں کھا گیا۔ جب معلوم ہوا کہ انھیں کینسر ہے تو رہا کردیا گیا، لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کا واپس آنا انہونی بات تھی۔ علاج کے لئے وہ بمبئی بار بار گئے، مہینوں پڑے رہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہا۔ سب ہی کچھ ہوا۔ لیکن جو اچھا ہوجائے وہ کینسر ہی کیوں ہونے لگا۔ قسمت کا لکھا پورا ہوکر رہا۔ آخری مرتبہ جب بمبئی سے آئے اور میں ان سے ملا تو اگرچہ وہ کچھ خوش امید تھے، لیکن میں نے ان کا چہرہ دیکھتے اور ان کے حالات سنتے ہی تاڑ لیا تھا کہ اب وقت قریب ہے۔ چنانچہ میں قاہرہ میں تھا کہ وہاں کے اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور جی دھک سے ہوکر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اَدَبی رَوایت سے بغاوت تک

از جناب عنوان چشتی صاحب لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

روایت سے بغاوت تک کا سفر ایک طویل اور مسلسل سفر ہے۔ اس میں درمیانی سنگِ میل بھی آتے ہیں۔ روایت فن اور تجربہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ روایت کے بعد انفرادیت کی منزل آتی ہے۔ انفرادیت کے بعد جدّت، اور جدّت کے بعد بغاوت کا دائرۂ عمل شروع ہوتا ہے اس طرح اگرچہ شعری تجربہ کی اساس روایت پر ہے مگر اس کو بغاوت اور اس کے بعد نئی ہیئت کی تعمیر تک کئی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

'روایت' ادبی تنقید میں دو متضاد معانی کی حامل ہے۔ یعنی اس سے تنقیص اور تحسین دونوں کام لئے جاتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں اس کو صفت کے طور پر برتا جاتا ہے۔ مثلاً "روایتی شاعر"۔ "روایتی اسلوب" یا "روایت پرستی" کی اصطلاحیں تنقیص کے مفہوم میں مستعمل ہیں۔ اس طرح کے فقرے کہ "اقبال شاعری کی عظیم روایتوں کے امین ہیں"۔ یا فلاں شخص عظیم انسانی روایات کا محافظ ہے۔ تحسین کا مفہوم رکھتے ہیں۔ دراصل لفظ روایت اپنی جگہ تحسین کا مفہوم رکھتا ہے نہ تنقیص کا بلکہ اس کا مفہوم محلِ استعمال پر منحصر ہے۔ یہ محض ایک مغالطہ ہے کہ روایت کا لفظ محض "تنقیص" کا مفہوم رکھتا ہے۔

روایت اپنے محدود تصور میں محض رسم پرستی، خارجی تقلید یا بندھے ٹکے اصولوں اور اسالیب کی پیروی کو کہتے ہیں۔ لیکن وسیع مفہوم میں یہ زندگی کے بہت بڑے دائرہ پر محیط ہے

اور اس کی جڑیں ماضی کے اندھیرے میں دور تک بڑھ گئی ہیں۔ اس میں مذہبی اور غیر مذہبی اعتقاد
انسان کے عادات و اطوار، طور طریق، رسم و رواج، ممنوعات ذہنی (Taboos) تجربے
اور ان کا تواتر، ردِ عمل کے انداز، غرض انسان کے ایسے تمام فکری و عملی نشانات ہیں جنھیں وہ
زندہ کرنے کے فن کے لئے بار بار کام میں لاتا ہے۔ اور جو عام انسانوں کا معمول بن جاتے
ہیں، روایت کہلاتے ہیں۔ جان لیونگسٹن لویز (John Livingston Lowes) نے
روایت کے دو اہم عناصر کا ذکر کیا ہے جس کو اس نے قبولیت (acceptance)
اور واہمہ (illusion) کا نام دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنیادی طور پر ہر لفظ ایک
آواز ہے مگر ہم ہر آواز کو ایک معنی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ روایت کے لئے یہ قبولیت
بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ معنوی طور پر کسی توہم کی قبولیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً ایک
ڈرامہ جو کسی شخص کی پوری زندگی پر مشتمل ہے محض تین گھنٹے میں دکھایا جاتا ہے۔ دیکھنے والے
تین گھنٹے وقفہ کو اس کی زندگی کا کل وقت اور ڈرامہ کے واقعات کو اس کی زندگی کے
کل واقعات سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ قبولیت کا یہ انداز واہمہ کی قبولیت ہے(۱) یہ
صورتِ حال ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی واقع ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام
روایت ہے۔

روایت کا سرچشمہ تہذیب و تمدن ہے۔ اور تہذیب و تمدن سماج سے وابستہ
ہے۔ اس لئے روایت پر سماج کی تحریکوں، رجحانوں، عمل اور ردِ عمل کا گہرا اثر ہوتا ہے
اور روایات بھی سماج کے ارتقا اور ابتلا سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی اپنی
مخصوص روایات ہوتی ہیں۔ جن پر اس عہد کے مخصوص معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی
اور سیاسی حالات کا اثر ہوتا ہے۔ روایت، قبولیت کی عام سند حاصل کر کے دو
راستوں میں سے کوئی ایک اختیار کر لیتی ہے۔ ایک راستہ جمود کا ہے۔ اور دوسرا حرکت کا
جو روایتیں زندگی کے دھارے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ وہ جامد اور فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ اور

خشک پتوں کی طرح زندگی کے درخت سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتی ہیں۔ بعض روایتیں زندگی کے سرچشمہ سے وابستہ رہتی ہیں۔ ان میں لچک ہوتی ہے۔ ان کی بعض خارجی تفصیلات میں کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی اصلی اور بنیادی لہر زندہ رہتی ہے۔ اسی طرح مقصد کے اعتبار سے جو روایات زندگی کی بڑھتی پھیلتی حقیقت کا ساتھ دیتی ہیں وہ مثبت اور جو زندگی کے دھارے کی مخالفت کرتی ہیں اور تعمیر سے زیادہ تخریب کرتی ہیں منفی روایات کہلاتی ہیں۔

ادبی روایت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خارجی دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو میں ہیئتیں صنعتیں صنفیں۔ اسالیب۔ تراکیب۔ ذریعۂ اظہار وغیرہ شامل ہیں۔ داخلی پہلو میں موضوعات۔ ماضی کا شعور اور تخلیق کے محرکات شامل ہیں۔ روایت کا خارجی پہلو محدود اور داخلی پہلو وسیع ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن

"روایت" ماضی کا وہ حصہ ہے جو آج بھی شاداب اور توانا شکل میں ہمارے ادبی مزاج میں زندہ ہے۔ (۲)

ماضی کا زندہ توانا اور شاداب حصہ داخلی زیادہ اور خارجی کم ہوتا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ (T. S. ELIOT) نے روایت پر بڑی دلکش بحث کی ہے۔ اس کا مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" اس وقت منظرِ عام پر آیا۔ جب ادبی و شعری تجربات کا طوفان برپا تھا۔ ایلیٹ کا خیال ہے کہ روایت وراثتی طور پر نہیں ملتی بلکہ اس کو سخت محنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخی شعور کیلئے ادراک اور ماضی کی ماضیت کی موجودگی کا احساس ناگزیر ہے۔

ماضی کی ماضیت کی موجودگی سے ایلیٹ کی مُراد ہے کہ ماضی کا سارا ادبی سرمایہ ایک ادبی کل ہے۔ اور وہ ربط و تسلسل کی ایک کڑی سے منسلک ہے اور زندہ ہے۔ اس

کی نگاہ میں ماضی سے وابستگی اور آگاہی کی تین صورتیں ہیں۔ (الف) ماضی کو بہتر سمجھکر قبول کرنا۔ (ب) ایک دو فنکاروں کا اتباع کرنا۔ (ج)۔ کسی ایک پسندیدہ دور کے سانچے میں خود کو ڈھال کر۔ لیکن وہ اِن تینوں راستوں کو بہت زیادہ وقعت نہیں دیتا بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ فنکار کو ادب وفن کی مرکزی روح اور بنیادی میلان سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اور ادب کی مکمل ذہنی زندگی کو جذب کر لینا چاہیئے۔ اِس کے نزدیک یہی تاریخی شعور ہے۔ جسے روایت کی آگہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایلیٹ نے روایت کے تصور کو ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کی۔ اور وہ بنیاد ماضی کی ماہیت کی موجودگی کا متحرک شعور ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ آج کی بنیاد گزرے ہوئے کل تھی اور آنے والے کل کی بنیاد آج پہ ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل میں گہرا اور اٹوٹ ربط ہے اس ربط اور تسلسل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ماضی کو ایک جامد چیز کی طرح قبول کرنا درست نہیں۔ یہ راستہ غیر شعوری اور غیر تخلیقی ہے۔ بلکہ ماضی کے اثاثے کو ایک زندہ کل کی حیثیت دیکھنا چاہیئے۔ روایت میں خوب اور خراب دونوں قسم کے عناصر ہوتے ہیں۔ شاعر کو ان دو قسم کے عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ اور ان عناصر کو قبول کرنا چاہیئے جو صحت مند، لچکدار اور مثبت ہوں۔ اور یہ تخلیقی قبولیت اسکو اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ بقول ایلیٹ

> "وہ فنکار اس لمحہ میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحہ موجود کہتے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ اس کا عرفان بھی رکھتا ہو کہ کون کون سی چیزیں مردہ اور کون کون سی چیزیں زندہ ہیں" (۴)

اس گہرے شعور کے بغیر زندہ اور مردہ عناصر میں تمیز نہیں کی جا سکتی۔ اِس لئے روایت کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں ماضی کا شعور، حال کا عرفان اور ان دونوں کی عضوی تسلسل کا احساس شامل ہے۔ روایت ایک ایسی متحرک اور مسلسل

لہر ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک لڑی میں پروتی ہے ۔ یہ ایک بہتا ہوا دریا ہے
جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف چلا جاتا ہے ۔ جس طرح ایک بچے کے
چہرے کے نقوش میں اُس کے باپ کے خدوخال جھلکتے ہیں ۔ اور اس کے کردار اور
خصوصیات میں اس کے باپ کے کردار کی جھلک ہوتی ہے ۔ اسی طرح حال میں ماضی
کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں ۔ روایت میں ماضی کی ادبی بصیرت، تاریخی شعور، تخلیقی محرکات
سب کچھ شامل ہے ۔ ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش اور ماضی کے
تجربات کی روشنی میں حال کے مسائل کو حل کرنے اور مستقبل کی تعمیر کرنے کی کوشش کو
روایت کہتے ہیں ۔

اس طرح روایت ایک ایسا اصول یا معمول ہے جس سے فن میں معنویت پیدا ہوتی
ہے ۔ اور اس کو بعض اہم خصوصیات سے متصف کر کے ترقی دیتی ہے ۔

ادبی روایت کے سلسلے میں چند باتیں اور ضروری ہیں ۔ ہر فنکار اپنے فنکارانہ
سفر کے آغاز میں روائت کا سہارا لیتا ہے ۔ اپنے خیالات کے اظہار کے سلسلے میں
بنے بنائے سانچے اور اپنے پیش رو فنکاروں کی تخلیقات کی پیروی کرتا ہے ۔
اسکی ابتدائی تخلیقات بڑی حد تک قدیم یا ہم عصر فنکاروں کی صدائے بازگشت
ہوتی ہیں ۔ اسکے بعد فنکار میں ایک مخصوص اعتماد اور شعور جاگتا ہے جو اُسے کو
محض تقلیدی ہونے سے روکتا ہے ۔ اُسکی تخلیقی صلاحیت زیادہ توانا ہو کر روایت
کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی ہے یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آتا
ہے جب فنکار کی تخلیقات میں انفرادیت کی جھلک آنے لگتی ہے ۔ اس طرح
ہر فنکار بیک وقت پرانا بھی ہوتا ہے ۔ اور نیا بھی ۔ فنکار کتنا بھی نیا ہو اور اس کی انفرادیت
کتنی بھی مسلم ہو ۔ وہ بُت شکن اور باغی ہی کیوں نہ ہو ۔ روایت سے سو فیصدی دامن نہیں
چھڑا سکتا ۔ اس کی تخلیقات میں ماضی یعنی روایت کے زندہ عناصر ضرور شامل ہوتے

ہیں۔

ادبی روایات کے سلسلے میں فنکاروں میں تین رویّے پائے جاتے ہیں۔ (الف) روایات کو جوں کا توں اپنانے کا (ب)۔ روایتوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کے منفی اور مثبت عناصر کو الگ الگ کرنے اور مثبت عناصر کو قبول کرنے کا (ج)، تمام ادبی روایات سے انحراف کا رویّہ۔ پہلا رویّہ تقلیدی اور غیر تخلیقی ہے۔ ہر دور میں ایسے روایتی اور روایت پرست شاعروں کی کثیر تعداد رہی ہے۔ ایسے فنکاروں کے یہاں تازگی و توانائی کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کے فن کا انحصار محض مشق و مزاولت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دوسرا رویّہ شعوری ہے مگر نیم تخلیقی ہے۔ روایت کے تجزیے اور اس کے مثبت و منفی عناصر کے ردوقبول کے عمل کے دوران پرانی روایتوں کا رنگ و روغن بدل جاتا ہے۔ اس عمل سے روایت کے زندہ عناصر کو حال کی آگہی سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرانی روایت میں تبدیلی کے ساتھ توسیع ہو جاتی ہے۔ یہ توسیع داخلی سطح پر زیادہ اور خارجی سطح پر کم ہوتی ہے۔ اس کو توسیع روایت کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا رویّہ خالص انقلابی ہے۔ اس میں ادبی روایتوں سے یکسر انحراف اور ان کی شکست و ریخت دونوں شامل ہیں۔ پہلے رویّہ کو تقلیدی دوسرے کو تعمیری اور تیسرے کو انقلابی اور تخریبی بھی کہہ سکتے ہیں۔

روایت اور بغاوت کے درمیان دو سنگِ میل اور ہیں۔ پہلا انفرادیت اور دوسرا جدت۔ اس لئے بغاوت کے عمل پر گفتگو کرنے سے بیشتر انفرادیت و جدت کے حدود و امکانات کا تعین کر لینا چاہیئے۔ شعری تخلیق میں دو قسم کے عناصر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس فن کی تمام قدیم و جدید تخلیقات میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو کسی تخلیق کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انہیں عرفِ عام میں روایتی عناصر کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ عناصر غیر اہم نظر آتے ہیں۔ مگر یہ عناصر ہر تخلیق میں پس منظر

خاکے اور ربطِ باہمی کا کام کرتے ہیں ۔ دوسرے وہ عناصر جوان روایتی عناصر سے مختلف ہوتے ہیں ۔ اور اس تخلیق کا مخصوص ، بنیادی اور لازمی حصہ ہوتے ہیں ۔ اور جو اس تخلیق کے مزاج ، تاثر ، حسن ، تازگی اور توانائی کو نیا انداز بخشتے ہیں ۔ انھیں منفرد عناصر بھی کہہ سکتے ہیں ۔ کسی فنکار کی انفرادیت کا انحصار انہیں عناصر کی بالیدگی ، فراوانی اور توانائی پر ہے ۔ ہر تخلیق میں دونوں قسم کے عناصر کا امتزاج ہوتا ہے ۔ مگر منفرد تخلیق میں انفرادی عناصر کی تعداد ، حسن اور تاثیر زیادہ ہوتی ہے ۔

انفرادیت کا سرچشمہ کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر انفرادیت پر بات چیت مکمل نہیں ہوسکتی کرسٹوفر کاڈول کے مطابق ہر فنکار بحیثیت فرد اپنے معاشرہ کا ایک حصہ ہوتا ہے اور زمان و مکان کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرمِ کار رہتا ہے ۔ ماحول سے اسکے تعلق کی نوعیت دو قسم کی ہوتی ہے انفعالی اور فعال انفعالی نوعیت میں انسان اپنے ماحول کے جبر کا اسیر ہوجاتا ہے ۔ اور اس کے اندر تبدیلی کی خواہش مرجاتی ہے یا پیدا ہی نہیں ہوتی ۔ فعال نوعیت میں وہ اپنے ماحول سے نبرد آزما ہوکر اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ فرد اور ماحول یا سماج کی کشمکش میں انسان ماحول کو بدلتا ہے ۔ اور خود بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے ۔ اس طرح عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ دوطرفہ ہوتا ہے ۔ اور مسلسل جاری رہتا ہے ۔ اسی کشمکش میں فرد کی شخصیت پروان چڑھتی ہے شخصیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے ماحول پر کس قدر مثبت یا منفی طریقہ پر اثر انداز ہوئی ہے ۔

ہر فنکار کی اپنی شخصیت ہوتی ہے ۔ اس کے خارجی اور داخلی دو پہلو ہوتے ہیں ۔ خارجی پہلو میں فنکار کا قد و قامت ، چہرہ مہرہ ، رفتار و گفتار ، انداز و اسلوب شامل ہے ۔ داخلی پہلو میں اس کا طرزِ فکر و عمل ، قوتِ کار و افکار ، اصول و نظریات ، داخلی رجحانات نیز دیگر بہت سی خصوصیات شامل ہیں ۔ شخصیت محض ظاہری وجاہت کا نام نہیں صرف داخلی خصوصیات

کا نام بھی نہیں۔ بلکہ دونوں کے حسین ترین امتزاج کا نام ہے۔ فنکار کی شخصیت کی بالیدگی اور روئیدگی سے فن میں جان پیدا ہوتی ہے۔ فنکار کی شخصیت دوہری ہوتی ہے۔ ایک اسکی فنکارانہ اور تخلیقی شخصیت دوسرے اسکی غیر فنکارانہ اور غیر تخلیقی شخصیت۔ فنکارانہ شخصیت میں اسکی تخلیقی صلاحیت اور طرزِ فکر و احساس کو اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت جس درجہ کی ہوتی ہے۔ فنکارانہ شخصیت بھی اسی مرتبہ کی ہوتی ہے۔ فنکارانہ شخصیت کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کے مادی تجربات کو کتنی واقعیت اور حسن کاری سے جمالیاتی تجربہ بناتی اور اسکا فنکارانہ اظہار کرلیتی ہے، جو لوگ روایت کے اسیر ہوتے ہیں یا زندگی کے معمولی تجربوں سے غیر معمولی قدروں کے نایاب حسن کو اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا زبان و بیان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ کمزور فنکارانہ شخصیت کے مالک ہیں فنکار اپنی شخصیت کو تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ فن میں تحلیل کر دیتا ہے فن اور شخصیت لازم و ملزوم ہیں۔ کروچے نے اسی مفہوم میں فن کو اظہارِ ذات کہا تھا جو فنکار اپنی سالم شخصیت کو فن میں سمونے میں جس حد تک کامیاب ہوتا ہے اسی حد تک اس کے فن میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

انسان کی شخصیت واضح طور پر دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک کامل شخصیت دوسری ناقص شخصیت۔ کامل شخصیت اپنے فکر و کار سے دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور نفسیاتی الجھنوں سے بڑی حد تک آزاد ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص شخصیت خود سے نفسیاتی طور پر دست و گریباں رہتی ہے اور کوئی اہم کام کرنے سے قاصر ہوتی ہے کرسٹوفر کاڈویل کا خیال درست ہے کہ ہر فنکار زمان و مکاں کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرم کار رہتا ہے۔ اسکی شخصیت کی تشکیل میں نفسیاتی عناصر کے علاوہ بعض خارجی اسباب و محرکات کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے۔ خارجیت کا جبر بہت سخت ہوتا ہے اس لئے اکثر افراد اپنے ماحول کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ جو نامساعد حالات سے لڑتے ہیں۔ انہیں ایک طویل آزمائش

اور ابتلا سے گزرنا پڑتا ہے ۔ اس آویزش میں فرد کچھ کھوتا اور بہت کچھ پاتا ہے چونکہ انسان زندگی کا سب سے زیادہ با شعور مظہر ہے اس لئے وہ ماحول پر فتح پانے کی کوشش بھی کرتا ہے ۔ اسکی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ اس میں ادب و تہذیب کی تمام دولتیں شامل ہیں

فرد سماج کا ایک حصّہ ہے وہ سماج سے وابستہ بھی ہے اور اس سے علیحدہ بھی۔ علیحدہ اس لئے ہے کہ ہر فرد کی اپنی جُداگانہ شخصیت ہوتی ہے ۔ فکر و احساس اپنے طریقے اور فکر و عمل کے اپنے پیمانے ہیں ۔ وابستہ اس لئے کہ ہر فرد سماج ہی میں رہتا ہے اور جزو کی حیثیت سے کل کی تشکیل کرتا ہے ۔ سماج کا ڈھانچہ معاشی نظام سے وابستہ ہے ۔ پیداوار اور طریقہ پیداوار کی تبدیلیوں سے سماج کی تبدیلیاں وابستہ ہیں ۔ سماج کے ایک انگ کی حیثیت سے فرد بھی تبدیلیوں کا مظہر ہے ۔ فرد کے رجحانات ، عقائد اور اعمال نجی ہوتے ہوئے بھی سماج کے مجموعی عقائد اور اعمال کا ہی حصّہ ہوتے ہیں ۔ اس لئے کرسٹوفر کاڈول نے ٹھیک کہا ہے کہ

" فن سماج کی اسی طرح پیداوار ہے جس طرح کوئی موتی کسی سیپی کی پیداوار ہے " (۹)

اسی طرح ہر فنکار کی تخلیق انفرادی کارنامہ ہوتے ہوئے بھی اجتماعی آہنگ کا حصّہ بھی ہوتی ہے

فنکار کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں ۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی ۔ انفرادی پہلو وہ پہلو ہے جو اسکو ان مخصوص عناصر سے آراستہ کرتا ہے جو دوسروں کے حصّہ میں نہیں ہوتے ۔ اجتماعی پہلو وہ پہلو ہے جو اس کی شخصیت کو ایسے عناصر سے مزیّن کرتا ہے جو سب کا مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں ۔ اور اس کے طبقاتی کردار کا تعیّن کرتے ہیں ۔

فنکار اپنے فن میں ان دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے ۔ ایک طرف وہ اپنے ماحول کا مطالعہ و مشاہدہ انفرادی نقطۂ نظر سے کرتا ہے ۔ اور دوسری طرف ان عقائد اور رجحانات کی روشنی میں دیکھتا ہے جو اس کے طبقاتی شعور کی دین ہوتے ہیں اس طرح جب وہ اپنے فکر و فن کی ترسیل کرتا ہے تو وہ بظاہر خالص ذاتی اور

انفرادی ہوتے ہیں مگر بیاطن اجتماعی اور سماجی افکار و اعمال کا حصہ ہوتے ہیں ۔ یہ پیشکش جتنی بھرپور اور مکمل ہوتی ہے شخصیت کی ترسیل بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہے ۔

شخصیت کے اظہار کے نقطۂ نظر سے ادب میں کئی نظریے ہیں ۔ ایک خیال یہ ہے کہ فنکار محض اپنی داخلی شخصیت کا ادب کے وسیلہ سے اظہار کرتا ہے ۔ اسکی پیشکش خالص انفرادی ذاتی بلکہ لاشعوری ہوتی ہے ۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ فنکار اپنے محض طبقاتی افکار و عقائد کا مبلغ ہوتا ہے ۔ چونکہ زندگی کے کارزار میں فنکار اپنی طبقاتی وابستگی کی وجہ سے فریق ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ طبقاتی افکار کی پیشکش سے بیگانہ نہیں ہو سکتا پہلا نظریہ نفسیاتی ہے ۔ اس نظریہ میں شاعری کے رشتے لاشعور سے مل جاتے ہیں ۔ اور شاعری حتمی طور پر بنیادی جبلتوں کی رقص گاہ ، اجتماعی لاشعور کا اظہار یا احساسِ کمتری کو دور کرنے کا ذریعہ قرار پاتی ہے ۔ دوسرا نظریہ سماجی ہے ۔ اس کے تحت شاعری میں روحِ عصر کی جھلک ہی نہیں بلکہ عصری زندگی کا مجموعی آہنگ ہوتا ہے ۔ زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح ادب کی مادی بنیاد فراہم ہوتی ہے ۔ اور یہ معاشی رشتوں اور سماجی تبدیلیوں کا آئینہ قرار پاتا ہے ۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے متضاد ہیں ۔ مگر دونوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ فن شخصیت کی مجموعی اور موثر آواز ہوتا ہے ایک ایسی آواز جو نفسیاتی عناصر اور خارجی عوامل کے سچے تال میل سے فنکار کی شخصیت کے نہاں خانوں سے گذرتی ہے ۔

ایلیٹ اظہارِ ذات یا ترسیلِ شخصیت کا قائل نہیں ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ شاعری جذبات کے آزادانہ اظہار کا نام نہیں بلکہ جذبات سے گریز کا نام ہے ۔ وہ اپنے اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک انسان کے لئے جو تجربات اہمیت رکھتے ہوں یہ ممکن ہے کہ وہ شاعری میں بالکل غیر اہم ہوں ۔ یا انہیں سرے سے شاعری میں کوئی جگہ ہی نہ ملے ۔ اور شاعری میں جن تجربات کی اہمیت ہو

ممکن ہے کہ عملی زندگی میں ان کا کوئی مقام نہ ہو یا بہت ہی معمولی ہو۔ ایلیٹ، کروچے کے متضاد خیال کا اظہار کرتا ہے۔ کروچے کا خیال ہے کہ انسان کا تجربہ شعری تجربہ بن سکتا ہے مگر ایلیٹ شعری تجربات اور مادّی تجربات میں فرق کرتا ہے۔ اسلئے وہ فن کے تاثرات اور دیگر تاثرات میں خطِ فاصل کھینچ دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مادّی تجربہ اور شعری تجربہ میں فرق ہوتا ہے۔ مگر ہر شعری تجربہ مادّی تجربہ سے ہی جنم لیتا ہے۔ یا اسکی اعلیٰ جمالیاتی شکل ہوتا ہے۔ شاعر بحیثیت فرد صبح وشام تک سیکڑوں تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے جو تجربہ شاعر کو جذباتی طور پر مشتعل کر دے وہی جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ شاعر کا جذباتی تجربہ ہی جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے اور یہی شعری تجربہ ہے۔ ایلیٹ شعری اور غیر شعری تجربوں میں فرق کر کے فنکار کی غیر فنکارانہ اور فنکارانہ شخصیت کا فرق واضح کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جوں جوں فنکار کی معمولی یعنی غیر فنکارانہ شخصیت معدوم ہوتی جاتی ہے ویسے ہی اس کی غیر معمولی یعنی فنکارانہ شخصیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اس طرح وہ فنکار کی غیر فنکارانہ شخصیت کی نفی کر کے کہتا ہے کہ

"نظم ذاتی جذبات کا اظہار نہیں ہوتی۔ بلکہ فن پارہ میں جو خیال یا جذبہ ہوتا ہے وہ غیر شخصی ہوتا ہے۔" (۵)

یہ غیر شخصی جذبات فرد کے جذبات نہیں بلکہ فنکار کے جذبات ہیں۔ جو خالص فنکارانہ اور جمالیاتی انداز کے ہیں۔ ایلیٹ نے واضح طور پر شخصی جذبات اور شعری جذبات میں بھی امتیاز کیا ہے۔ شخصی جذبات سے مُراد وہی غیر فنکارانہ شخصیت کے جذبات اور شعری جذبات سے مُراد فنکارانہ شخصیت کے جذبات ہیں۔ اس طرح ایلیٹ نے بظاہر شاعری کو جذبات سے گریز کا نام دیا ہے مگر دراصل اس نے رُخ بدل کر شعری، جمالیاتی اور فنکارانہ جذبات کے اظہار کو شاعری تسلیم کیا ہے۔ ایلیٹ کا

یہی نقطۂ نظر شخصیت کے سلسلے میں ہے۔ وہ فنکار کی خالص فنکارانہ شخصیت کے اظہار کو شاعری تصور کرتا ہے۔

ایلیٹ فن کے جذبات اور شخصی جذبات میں فرق کرتا ہے۔ وہ عام جذبات کو غیر فنی اور مخصوص جذبات کو فنی تصور کرتا ہے۔ فنی جذبات خالص جمالیاتی اور منفرد ہوتے ہیں۔ شخصیت سے گریز کا مفہوم یہ ہے کہ فنکار کو اپنی غیر فنکارانہ شخصیت کو خیرباد کہنا چاہئے اور فنکارانہ شخصیت کی تکمیل پر زور دینا چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب بقول ایلیٹ، فنکار کو اپنی ذات کو ایسی چیز کے سپرد کر دے جو اسکی ذات سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہو۔ اس طرح فنکار اپنی غیر فنکارانہ شخصیت کی مسلسل قربانی سے اپنی شخصیت کو معدوم کر سکتا ہے۔ اور اصل فنکارانہ شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اسطرح نہ وہ صرف یہ کہ قربانیٔ ذات اور اپنی شخصیت کو کسی بالاتر مقصد کے حصول کے لئے سپردگی پر زور دیتا ہے بلکہ شعور کو پروان چڑھانے، تبدیلیوں سے باخبر رہنے اور تمام شاعری کو ایک زندہ وحدت تصور کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ شاعروں کو غم ذات کا نوحہ گر یا خارجی مظاہر کا مصور نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس سے بالاتر ہوکر زیادہ اہم گمبھیر اور خالص جذبات کو فن میں جگہ دینی چاہئے ——

شخصیت سے گریز کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ فنکار کی شخصیت کو تجربات اور ان کے اظہار میں مزاحم نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ جو تجربہ جس انداز سے ذہن پر مرتسم ہو، اس کو پوری شدت توانائی اور اصلیت کے ساتھ معرض وجود میں آنا چاہئے۔ اس طرح یہ دونوں نظریے یعنی فن میں شخصیت کا اظہار اور شخصیت سے گریز شاعر کی انفرادیت کی تشکیل کیلئے بہت ضروری ہیں۔ اور دونوں کا منطقی نتیجہ ایک ہی ہے۔

فن شخصیت کا اظہار ہو یا شخصیت سے گریز مگر اس میں کلام نہیں کہ شخصیت ہی واسطۂ درمیانی ہے۔ اور فن میں کسی طرح اس سے مفر نہیں۔ اس لئے فن میں فنکار کی

شخصیت کے جملہ عناصر شامل ہوتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے اولین لمحے سے اس کے لمحۂ آخر تک فن شخصیت کے پراسرار نہاں خانوں سے گزرتا ہے۔ اور اس میں شخصیت کا رنگ رس شامل ہوتا رہتا ہے۔ فنکار کا ذہن، وجدان، شعور ولاشعور، تخیل اور دوسری تمام صلاحیتیں فن کی تکمیل میں صرف ہوتی ہیں۔ اس لئے فن میں دو قسم کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ایک خالص شخصی عناصر اور دوسرے آفاقی عناصر۔ شخصی عناصر میں ذاتی خصوصیات اور انفرادی اوصاف شامل ہیں۔ آفاقی عناصر میں روایتوں کی بنیادی لہر۔ عالمگیر قدریں اجتماعی انداز و اسالیب وغیرہ شامل ہیں۔ فن میں شخصی یا ذاتی عناصر انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے انفرادیت کو شخصیت کا نقش قرار دینا صحیح ہے۔ یہ نقش جتنا نمایاں ممتاز اور دلکش ہوگا تخلیق اتنی ہی انفرادی ہوگی۔ میر کی خستگی و برگشتگی۔ درد کی صوفیانہ آگہی، غالب کی ندرتِ تخیل اور اقبال کے سوچتے جذبے سے انکی انفرادیت کی شناخت ہوتی ہے۔ اگرچہ انفرادیت، مواد اور ہیئت کے حسین ترین امتزاج سے وجود سے آتی ہے مگر اسکی شناخت فن کے مجموعی آہنگ اور اسلوب سے ہوتی ہے۔ بعض نئے شاعر بھی انفرادیت کی تکمیل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔

روایت اور انفرادیت کے بعد جدت پر غور کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر جدت کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ شاعری میں جدید مسائل، موضوعات، رجحانات اور عصری آگہی کو سمونا۔ دوسرے روایت کی ڈگر سے ہٹ کر نئے اسالیب و انداز کا سہارا لینا۔ مگر جدت میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ پہلا مفہوم جدت کا داخلی پہلو اور دوسرا خارجی پہلو ہے اس لئے ہر ایسی شاعری کو جدید شاعری کہا جاتا ہے جس میں تجربے اور تازگی کی جھلک ملتی ہے۔ اور جس میں روایت سے گریز کا احساس ہوتا ہے۔

بعض لوگ جدت برائے جدت کے قائل ہیں۔ ایسی جدت بدعت ہے۔ اگر جدت موضوع مواد اور اسلوب کی ہم آہنگی سے وجود میں نہیں آتی اور شعری تجربے کے

لطن سے جنم نہیں لیتی تو جدت نہیں بلکہ فیشن ہے۔ بے معنی جدت اور غیر ضروری جدت اتنی ہی بری بات ہے جتنی روایت پرستی ——— جدت محض نئی چیز کا اختراع بھی نہیں ہے۔ فن کی سطح پر نئی چیزیں اسطرح وجود میں نہیں آتیں جسطرح صنعتی دنیا میں وجود میں آتی ہیں۔ شاعری چند چیزوں کو ملا کر ایک نئی چیز بنانے کا نام نہیں۔ بلکہ ایک محدود مفہوم میں توسیعِ روایت کا نام ہے۔ جدت خارجی سطح پر پرانی ہیئتوں، تکنیکوں اور اسالیب کو نئے انداز سے برتنے کا فن ہے۔ عام طور پر مانوس اشیاء کو یہ سمجھکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ ان میں کوئی نیا یا دلکش گوشہ نہیں ہوتا۔ دراصل جدت مانوس اشیاء کے ہمدردانہ مطالعہ اور ان کے مخفی گوشوں اور نئے امکانات کی تلاش کا نام ہے مانوس چیزیں لگاتار استعمال میں آنے کی وجہ سے اپنی تازگی کھودیتی ہیں۔ اور اجنبی چیزیں غیر مانوس ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے دلکش نہیں ہوتیں۔ اسلئے مانوس اشیاء کے مخفی گوشے کی نقاب کشائی ضروری ہے اور دلکش عمل بھی۔ اس عمل سے ہم نئے استعجاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ استعجاب پرانی چیزوں میں نئے امکانات کی تلاش اور ان کے حصول سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح جدت اشیاء کی روحانی آشنائی کا عمل ہے۔ اشیاء کی اس روحانی آشنائی کو اپنی گرفت میں لینے اور اس کو از سرِ نو ترتیب دینے کا نام جدت ہے۔

جدت میں روایت سے گریز، مانوس اشیاء کے مخفی امکانات کی تلاش اور اشیاء کی آشنائی کا عمل ہی جدت نہیں۔ بلکہ اسمیں کسی قدر انفرادیت اور اختراع بھی شامل ہے مگر دونوں میں ذرا سا فرق ہے۔ انفرادیت غیر روایتی عناصر کی فراوانی اور ان کی دلکش ترتیب سے ظہور میں آتی ہے۔ جدت روایتی عناصر کی نئی ترتیب اور پرانی روایتوں کے نئے امکانات کی جلوہ گری سے وجود میں آتی ہے۔ جسطرح انفرادیت کلیتاً روایتی عناصر سے پاک نہیں ہوتی اسی طرح جدت بھی انفرادی یا غیر روایتی

عناصر سے بے نیاز اور محروم نہیں ہوتی۔ جدت روایتی عناصر کو از سر نو منظم کرنے میں غیر روایتی عناصر کو نہ صرف کام میں لاتی ہے بلکہ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کرتی ہے مگر جس طرح انفرادیت میں غیر روایتی عناصر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جدت میں غیر روایتی عناصر کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ مگر دونوں قسم کے عناصر اپنی اپنی حدود میں اہم ہوتے ہیں۔

چونکہ جدت مانوس اشیاء کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل ہے اسلئے یہ عمل کسی نئی چیز کی تخلیق سے کم نہیں ہوتا۔ اختراع میں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے اور زندگی کے ایک نئے پہلو کو سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح مانوس اشیاء کا مخفی گوشہ بھی زندگی کا ایک نیا پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے جدت میں اختراع کی ہلکی سی جھلک بھی شامل ہے

مانوس اشیاء کے مخفی امکانات کا انکشاف دو سطحوں پر ہو سکتا ہے۔ پہلی سطح خارجی سطح ہے جسمیں ہیئت، تکنیک، اسلوب اور شعری زبان شامل ہے۔ اس سطح پر قدیم سانچوں اور اظہار کے ذریعوں کے مخفی امکانات کی دریافت ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ کس کس نئے موضوع کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے یہاں یہ واضح رہے کہ یہ عمل محض روایتی سطح پر نہیں ہوتا۔ بلکہ حسب ضرورت ہیئت و اسلوب زبان اور تکنیک میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں۔ دوسری سطح پر پرانے موضوعات اور مواد کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں ایسے کون کون سے گوشے ہیں جنکو ابھی تک چھوا نہیں گیا ہے۔ اسطرح جدت کا عمل فن کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے مخفی گوشوں اور نئے امکانات کی دریافت کا عمل ہے۔ اور اس دریافت کو نئی صورت گری بخشنے کا فن ہے

جدت محض سرسری تلاش سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے سرگرم جستجو اور ذہنی خلاقی کی ضرورت ہے۔ کسی نئی چیز کا اختراع جتنا مشکل ہے پرانی چیز کو نئی زندگی عطا کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ اس عمل کے لئے بھی فنی شعور، تخلیقی ذہن اور

فنکارانہ چابکدستی کی ضرورت ہے۔ جدت کے عمل کی دو سطحیں ہیں پہلی سطح پر فنکار پرانی چیزوں میں نئے گوشوں کی تلاش کرتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک مہم جو کی سی ہوتی ہے۔ اور دوسری سطح پر وہ اپنی دریافت کو استعمال کرتا ہے۔ اور اُس کی حیثیت ایک صناع کی سی ہوتی ہے۔ اس لئے جدت میں جستجو اور صناعی کی خصوصیات ہوتی ہیں جستجو کا حاصل استعجاب عطا کرتا ہے۔ اور صناعی کا حاصل سرخوشی۔ چنانچہ جدت استعجاب اور خوشی دونوں چیزیں عطا کرتی ہے۔

اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ جدت روایت کے بطن سے نمودار ہوتی ہے مگر روایت پرستی سے انحراف کرتی ہے۔ یہ انحراف فن کی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک طرف اس میں نئے موضوعات اور اسالیب شامل ہیں دوسری طرف پرانے موضوعات اور اسالیب کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کے مخفی امکانات کی دریافت اور ان کی از سرِ نو تنظیم شامل ہے۔ جو قاری کو استعجاب اور سرخوشی عطا کرتی ہے۔

گزشتہ سطور میں روایت سے انفرادیت اور جدت کے تعلق کی نوعیت پر غور کیا گیا ہے اب روایت اور بغاوت کے رشتہ پر گفتگو کر لینی چاہئے۔ جب مردہ روایت اپنے غیر مفید وجود کے لئے مضر ہوتی ہے۔ یا تخلیقی عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یا اپنی فطری لچک کھو کر جامد ہو جاتی ہے۔ یا فن اور زندگی کے سرچشمہ سے جدا ہو کر تجربوں کے اظہار کی صلاحیت کھو دیتی ہے۔ یا نئے تجربوں کی تجسیم کرنے میں ناکام رہتی ہے تو ادبی روایت سے بغاوت کا عمل ناگزیر بن جاتا ہے۔ جو روایت بغاوت کی زد پر آتی ہے اس پر بغاوت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ جو روایتیں زندگی کے سرچشمہ سے وابستہ ہوتی ہیں وہ بغاوت کی زد پر لچک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔ جو روایتیں فن اور زندگی سے علیحدہ ہو جاتی ہیں وہ بغاوت کی زد پر لوٹ جاتی ہیں۔ ادبی بغاوت کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ادبی بغاوت پرانی ہیئتوں، اسالیب، تکنیک اور زبان کے خلاف بلغار کرتی ہے اور ان کی شکست و ریخت کرتی ہے۔ کسی پھٹتے ہوئے بم کی طرح بغاوت کی لاتعداد سمتیں ہوتی ہیں۔ بغاوت کا اثر موضوع و مواد سے لے کر ہیئت و اسلوب تک ہر پہلو پر ہوتا ہے۔ روایت

"مذاق عصر" کا احترام کرتی ہے مگر بغاوت "مذاق عصر" کی پابند نہیں ہوتی۔ روایت ماضی کی پرستش کرتی ہے اور حال میں ماضی کو جوں کا توں باقی رکھنے پر اصرار کرتی ہے بغاوت ماضی سے بے زار اور حال سے ناآسودہ ہوتی ہے۔ اس لئے بغاوت میں روایت کی شکست کا عمل لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ ادبی بغاوت کی زد پر روایت کے زندہ عناصر باقی رہ جاتے ہیں اور مُردہ عناصر تباہ ہو جاتے ہیں۔ بغاوت کی افادیت اور عظمت کو وہ اسباب اور محرکات متعین کرتے ہیں جنھوں نے اس کو جنم دیا ہے۔ اس لئے ہر ادبی و شعری بغاوتیں یکساں اہمیت اور اثرات کی حامل نہیں ہوتی۔ وہ بغاوت جو فیشن اور فارمولے کے تحت انفرادی طور پر کی جاتی ہے۔ وہ "کار بیکاراں" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جیساکہ آج کل بعض جدیدیت پسند شعراء کر رہے ہیں مگر عصری تقاضوں کے تحت وجود میں آنے والی بغاوت دیررس اور دیرپا ہوتی ہے۔

ادبی بغاوت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تخریبی اور دوسرا تعمیری۔ انھیں منفی اور مثبت پہلو بھی کہہ سکتے ہیں۔ تخریبی اور منفی پہلو سے مُراد شکست و ریخت کا عمل ہے جس میں بغاوت اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو توڑ دیتی ہے تعمیری اور مثبت سے مُراد ایک نئی اور بہتر شے کی ساخت اور پرداخت ہے۔ اگرچہ بغاوت میں تخریبی عمل شدید اور ہمہ گیر ہوتا ہے مگر تعمیری عمل بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور جاری رہتا ہے۔ یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تخریبی لہر پہلے رواں ہوتی ہے اور تعمیری لہر اس کے پیچھے چلتی ہے۔ بغاوت انھیں دونوں لہروں کے عمل اور ردِّ عمل سے مرکب ہے۔ اس طرح بغاوت کی تخریبی لہر کو شکست و ریخت کا عمل اور اس کی تعمیری لہر کو قدیم اسالیب اور ہیئتوں کی تبدیلی اور نئی ہیئتوں کی بازیافت کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ محض تخریبی عمل بے معنی ہے۔

ادب اور زندگی میں نئے پن اور پُرانے پن کا تصور اضافی ہے۔ جو چیز آج پُرانی ہے وہی کل نئی تھی جو چیز آج نئی ہے کل پُرانی ہو جائے گی۔ قدامت اور جدیدیت کا ایک تصور یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو آج موجود ہے نئی ہے۔ مگر یہ تصور غیر منطقی ہے۔ کسی

چیز کا محض موجود ہونا اس کے نئے پن کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو آج موجود ہے خواہ نئی ہو یا پرانی۔ اور نئے دور کے مزاج سے ہم آہنگ ہے نئی ہے۔ بغاوت سے پہلی قسم کی چیزوں کی شکست و ریخت ہوتی ہے اور یہ دوسرے انداز کی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں اس لئے نئی چیز وہی ہے جو عصری آگہی، نئی حسیت اور نئے شعور سے متصف ہو اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتی ہو۔ مگر ہر نئی چیز کچھ مدت کے بعد پرانی ہو جاتی ہے اور ہر پرانی چیز بغاوت کے عمل سے از سر نو نئی ہو جاتی ہے۔ اس لئے بغاوت کا کام چیزوں کی شکست و ریخت ہی نہیں بلکہ ان کی قلب ماہیت کرنا اور پرانی چیزوں کو نئی زندگی عطا کرنا ہے۔ جو جدید شاعر فیشن اور فارمولوں کے تحت محض پرانی روایتوں اسالیب اور ہیئتوں سے انحراف اور انکار کرتے ہیں وہ باغی نہیں ایڈونچرسٹ ہیں اور ادبی بغاوت کے مفہوم سے نابلد ہیں۔ بے معنی اور بے ہنگم الفاظ کے ڈھیروں کو تخلیق کا درجہ نہیں مل سکتا۔

ادبی بغاوت کی اہمیت کا اندازہ اس کے مقصد کی بلندی سے ہوتا ہے۔ یہ مقصد اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور ادنیٰ بھی۔ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بغاوت میں تخریب کے ساتھ تعمیر کا پہلو بھی ہو۔ ادنیٰ یہ ہے کہ اس کا مقصد محض تخریبی ہو۔ اس کے علاوہ ادبی بغاوت کا اندازہ اس کے نتائج اور اثرات سے بھی ہوتا ہے۔ جو ادبی بغاوت وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے اس کا دائرۂ اثر محدود اور کمزور رہتا ہے۔ جو ادبی بغاوت دوررس اور ہمہ گیر ہوتی ہے اس کا دائرۂ اثر دیرپا اور وسیع ہوتا ہے انفرادی بغاوت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اجتماعی بغاوت بے کراں ہوتی ہے جو اپنے دور کے مخصوص حالات سے جنم لیتی ہے اس لئے روایت اور بغاوت میں فرق ہے جس کو تنقیدی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔

بغاوت کی فطرت میں انتشار کی خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ محض یک طرفہ عمل

نہیں۔ بلکہ عمل ردِ عمل اور ردِ عمل پر ردِ عمل کا ایک مسلسل عمل ہے۔ بغاوت کی ایک لہر دوسری تخریبی لہروں کو جنم دیتا ہے۔ اور وہ تخریبی لہریں دوسری تخریبی لہروں کو جنم دیتی ہیں۔ بغاوت کا عمل فن کی دو سطحوں پر رونما ہوتا ہے۔ خارجی سطح اور داخلی سطح پر یہ عمل ایک مرکز سے چاروں طرف کو پھیلتا ہے اور پھر چاروں طرف سے مرکز کی طرف کو پلٹتا ہے۔ اس لئے بغاوت کے عمل میں انتشار کی کیفیت گرداب کی سی ہوتی ہے۔ اس میں شدت، طاقت، جذباتیت اور گھن گرج ہوتی ہے

بغاوت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ کسی دور میں ایک یا چند فنکار بہ زعمِ خود بغاوت کرتے اور ادبی روایات کے بتوں کو توڑتے ہیں۔ بعض دور بغاوت کے لئے ساز گار ہوتا ہے۔ اس طرح انفرادی بغاوت کسی فنکار کی وہ انفرادی کوشش ہے جو وہ روایتوں کی شکست و ریخت کے ذریعہ مواد و ہیئت کو اپنے فکر و فن کے تابع کرنے کے لئے کرتا ہے۔ اجتماعی بغاوت کسی دور کے باشعور فنکاروں کا ایسا فطری ردِ عمل ہے جو فن کو اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جدید فنکاروں کی باغیانہ کوششیں دو طرح کی ہیں۔ پہلی محض فیشن اور فارمولے کے تحت دوسری چند باشعور شاعروں کی انفرادی کوششیں جو ان کے شعری تجربوں کے لئے غیر ضروری تھیں۔ اگر ضروری تھیں تو اس کے لئے معقول وجہ جواز چاہئے اسلئے نئے چہروں کو غور سے دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ بہتوں نے اپنے دھڑ پر نقلی چہرے لگا رکھے ہیں۔

مختصراً اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ فن کی بنیاد روایت پر ہوتی ہے۔ کوئی فنکار خواہ کتنا ہی جدید اور منفرد ہونے کا دعویٰ کرتا ہو روایت سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ فن میں اجتماعی اور انفرادی عناصر ہوتے ہیں۔ انفرادی عناصر شخصیت کی دین ہوتے ہیں۔ انہیں غیر روایتی یعنی انفرادی عناصر کی فراوانی اور نئی تہذیب و ترتیب سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ جو اگرچہ مواد اور ہیئت دونوں سے جھلکتی ہے۔ مگر اس کا واضح اظہار اسلوب کی صورت میں ہوتا ہے۔ روایت میں زندہ اور مردہ عناصر ہوتے ہیں۔ زندہ عناصر کی نئی ترتیب، پرانی چیزوں میں نئے پہلوؤں کی تلاش اور ان کے مخفی امکانات

کی بازیافت کے عمل کو جدت کہتے ہیں۔ انفرادیت اور جدت کے عمل سے گذر کر ادبی بغاوت کا دائرۂ کار ہے۔ مردہ روایتوں کے جبر کے خلاف بغاوت کا عمل ناگزیر ہوتا ہے۔ بغاوت میں پہلی لہر تخریبی ہوتی ہے جو آگے آگے چلتی ہے۔ اس کے پیچھے دوسری تعمیری لہر آتی ہے۔ اس لئے ادبی بغاوت کا پہلا کام روایتوں کی توسیع و تبدیلی نیز شکست وریخت ہے۔ اس کے بعد نئی روایتوں کی طرح ڈالنا ہے۔ جو لوگ تاریخی تسلسل اور زندگی اور فن کے رشتہ کو پس پشت ڈال کر بہ زعم خود انفرادیت۔ جدت اور بغاوت کے علمبردار بنتے ہیں۔ انہیں اپنے فکر و فن پر از سرِ نو غور کرنا چاہئے۔ اور فن اور غیر فن کے امتیاز کو سمجھنا چاہیے۔

حوالے

۱۔ John Livingston Lowes: Convention And Revolt In Poetry, (1930) London, P.2

۲۔ ڈاکٹر محمد حسن: ادبی تنقید (۱۹۵۴) ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ ص ۷۰

۳۔ T.S. Eliot: Selected Prose, (1958), Pengiun Books, P

۴۔ Christopher Caud Well: Illusion & Reality (1947) Bombay, P.10

۵۔ T.S. Eliot: Selected Prose, (1958), Pengiun Books, P